

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
سچی کہانیاں
December
2016
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
READING SECTION
READING SECTION
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com
"مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
ایم اے راحت کا نیا تہلکہ خیز سلسلہ "زرد لومڑی" اور کاشی چوہان کا ناول "زہر عشق"
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

ماہنامہ

سچی کہانیاں

کراچی

E-mail pearlpublications@hotmail.com

بانی **سہام مرزا**



مدیرہ اعلیٰ منزہ سہام

مدیر کاشی چوہان/دانیال شمسی

منیجر مارکیٹنگ

021-35893121

منیجر سرکولیشن

0333-2269932

انکم ٹیکس ایڈوائزر

مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

MEMBER APNS CPNE	آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتا: C-88 II فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل

ڈیفنس فیز 7 ایکسٹینشن ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے جلد: 33 شمارہ: 12 دسمبر 2016ء

ایڈیٹر پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔



فون: 021-35893121-35893122 | ... تالپور روڈ، کراچی



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری [illegible] 900 [illegible] 455 [illegible] ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

دنیا میں کس جگہ

سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے' دیکھتے' محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں' جگ بیتیاں' اعترافات' جرم و سزا کی کہانیاں' ناقابلِ یقین کہانیاں' دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے' قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرل پبلی کیشنز: 88-C II۔فرسٹ فلور۔خیابانِ جامی کمرشل۔ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔فیز-7،کراچی
فون نمبرز: 021-35893121-35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

فیصلہ بدل دے

نام: ہزیمہ نصیر Huzaima Naseer

عمر: 26 سال 26th Years

رہائش: ڈسکہ Daska

عمر کا وہ حصہ جب ہر جانب رنگ و نور اور قہقہے بکھرے ہوتے ہیں۔ آنکھوں کی چمک چودھویں کے چاند سے بھی زیادہ روشن اور لبوں پر پھیلی مسکراہٹ ساری دنیا کے خزانوں سے بھی زیادہ انمول ہوتی ہے۔ عمر کا وہ دور جب باپ جوان، خوبرو بیٹے کو فخر سے دیکھتا ہے اور ماں نظریں چرا کر کہ کہیں اُس کی نظر نہ لگ جائے۔ بہنوں سے لاڈ اٹھوانا اور بھائیوں پر دھونس جمانا زندگی کا حسین ترین دور...... جب کانوں میں ''گھوڑی چڑھیا وے میرا گھوڑی چڑھیا'' کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اسباب جو بھی رہے ہوں مگر وہ معصوم اپنی جنت سے دور در در بھٹکتا رہا۔ انسانی اسمگلروں کے ہتھے چڑھا یہ نوجوان غیر قانونی طور پر بارڈر پار کرنے کے جرم میں ایرانی بارڈر سیکیورٹی فورسز کی گولیوں کا نشانہ بنا مگر پھر بھی رکا نہیں سفر کرتا رہا زخم سہتا رہا...... خون رستا رہا...... تڑپ کر ماں کو پکارتا رہا اور یہاں ماں تڑپتی رہی، انجان رہی...... خوابوں کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر اسپتال میں داخل کرا لیا گیا۔ زخم ناسور بن چکا تھا۔ ڈیڑھ سال جرمن حکومت اس کا علاج کرواتی رہی اس امید پر کہ حالت سنبھلے تو وطن واپس بھیجا جائے۔ مگر شاید وطن کی مٹی اپنے سپوت سے ناراض تھی۔ وہ ماں سے ملنے، باپ کو دیکھنے کو تڑپتا رہا...... گھر واپس آنے کے لیے بلکتا رہا...... اور پھر دعائیں رنگ لے آئیں۔ وہ واپس آ گیا اور منوں مٹی کی چادر اوڑھ کر سو گیا۔

نصیب اگر روٹھ جائے اور وقت ختم ہو جائے پھر کچھ نہیں بچتا...... پتہ نہیں کتنے ہزیمہ اس انسانی اسمگلنگ کے ناسور کا شکار ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے۔ جب جرم کینسر بن کر معاشرے کی رگوں میں پھیل جائے اور ناانصافی، بے حسی اور ظلم قوموں کی پہچان بن جائے، تب فیصلے آسمانوں پر ہوتے ہیں۔ میں کسی سے شکوہ کناں نہیں...... ذمہ داروں کی سزا کی آرزومند نہیں...... میں کسی انسان سے کچھ نہیں چاہتی۔ میں ماں ہوں...... اپنے رب سے مانگتی ہوں۔

اے میرے رب اس دور کی ماؤں کے دل سخت کر دے اے میرے رب اس دور کی ماؤں کے آنسو خشک کر دے۔ اے رب کائنات، دنیا کے بادشاہ!! ایک ماں تجھ سے فریاد کرتی ہے کہ تو اپنا فیصلہ بدل دے......

تُو ماں کا دل تخلیق کرنا چھوڑ دے۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو! سال 2016ء نے اپنا سب کچھ ہمیں سونپ دیا۔ 365 دنوں کے سارے اسرار کھول کر دنیا کا ایک ورق پرانا کیا اور چمکتا ہوا نیا برس ایک سونے کی سی طشتری سا چمکتا نئے آفتاب کے ساتھ طلوع ہونے کو تیار ہے۔ آکاش نے نیلگوں سویرے کی نوید دینے کے لیے دھرتی کو Refresh کر دیا ہے۔ کیا یہ نیا برس بھی ملکی، سیاسی، بین الاقوامی، ثقافتی، تعصباتی، فنی، تجارتی استحصال کا شکار ہو کر گزرے گا۔ کیا اس برس بھی انسانی اسمگلنگ عروج پر رہے گی۔ کیا اس برس بھی جنگ کے بادل ملکی فضاؤں پر چھائے رہیں گے۔ کیا اس برس بھی دھرنوں کی دھما چوکڑی برقرار رہے گی۔ کیا اس برس بھی سیاستدان صرف ایک دوسرے کے گریبان پھاڑنے کے لیے نت نئے حربے آزماتے رہیں گے۔ کیا اس برس بھی انسانیت بوری میں بند لاش کی طرح کسی نامعلوم مقام پر پڑی سڑتی رہے گی۔ کیا اس برس بھی ہم پاکستانی لوڈشیڈنگ کے عذاب جھیلتے رہیں گے۔ کیا اس برس بھی اغوا برائے تاوان، بھتہ خور خور مافیا اپنے مذموم مقاصد میں 110 فیصد کامیاب رہے گی۔ کیا اس برس بھی ہمارے اپنی تھرل پاور کو استعمال میں نہ لانے کے عہد پر قائم رہیں گے۔ کیا اس برس بھی ہماری قوم، Twitter, Messenger, Whatsapp, Imo, FtSkype کی فسوں خیزی کا شکار ہو کر غنودگی میں رہے گی؟ میرے پاس سوال بہت ہیں مگر ان سوالات کے جواب کون دے گا اور ایک سوال آپ سب کے لیے بھی ہے۔ یہ سوال نہیں حقیقت ہے۔ ساتھیو! عہد کرو کہ اس بار ہم غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنا سیکھ لیں گے۔ اپنی ناکامی پر بجائے یہ کہ محنت کریں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے والی پالیسی ترک کر دیں گے۔ ''ہم'' کہتے ہوئے تکبر زدگی ہی۔ اس کا فیصلہ ہمارے ہی لکھے گئے تعریفی خطوط نہیں کرتے، جن میں ناپختہ اور غیر معیاری تحریروں کی تعریف میں قلابے ملائے جاتے ہیں بلکہ آنے والا وقت کرتا ہے۔ وقتی شہرت سے بے وقوف تو خوش ہو سکتے ہیں مگر عقلمند نہیں۔ اپنا کام کریں۔ ادب کی دنیا میں دوست کوئی نہیں ہوتا سب اپنی غرض کے بہرے ہوتے ہیں۔ الل ٹپ ہانک کر بے وقوف سمجھتے ہیں کہ ٹارگٹ کو شہ دے کر مات ہو گئی۔ نہیں نہیں......سب بے وقوف اپنی موت آپ مر جاتے ہیں اور ادب کی دنیا کے مرگھٹ پر پڑے مردار سے بھی برا حال ان کا انجام ہوتا ہے۔ سو ساتھیو! اگر دنیائے ادب میں زندہ رہنا چاہتے ہو تو صرف اپنے آپ سے اور اپنے کام سے پیار کر لو۔ تم امر ہو جاؤ گے۔ رہے نام اللہ کا۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا کہ آپ سب ہی بہت سمجھدار ہیں۔ دسمبر کے ٹھٹھرتے دنوں میں 2016ء کے آخری احوال کی ابتداء اس دعا کے ساتھ کرتے ہیں کہ خدارا! اس نئے برس سب سمجھدار ہو جائیں۔ ابتدائے احوال سید ملازم حسین شیرازی سے جو کہ کوہاٹ سے اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''السلام علیکم! بہت شکریہ کہ میری ارسال کردہ تحریر کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے شاملِ اشاعت کرتے ہیں۔ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے محبت کو ترستی نگاہیں اپنوں کی چاہتوں کو ڈھونڈ رہی ہوتی ہیں۔ بے قرار اور منتظر نظریں خلوص و الفت کی آہٹوں کی متلاشی ہوتی ہیں۔ ایسے میں سچی کہانیاں کے لکھاری، قارئین سے بوساطت تحریر ہمکلام ہونا باعث اطمینان ہوتا ہے جس کے لیے مدیران داد و دعا کے مستحق ہیں۔ اگر بے بسی اور مجبوری کی زنجیریں نہ ہوتیں تو آپ کے شانہ بشانہ تقریب رائٹرز ایوارڈ کو کامیاب بنانے میں

پوری توانائی صرف کرتا اور سچی کہانیاں کے محبان وودوستان سے شرف ملاقات ہوتا۔ خیر! یار سلامت صحبت باقی۔ ست رنگوں میں سجا حسین ودلکش سرورق۔ ادار یہ کسی کی خوشی میں خوش ہونا، رنج وغم والم میں دکھ بانٹنا مدیرہ اعلیٰ کی انسان دوستی کا ثبوت ہے۔ سلامت رہیں۔ سب کہانیاں نگینہ کی طرح جگمگا رہی ہیں۔ ان کا چناؤ، کمپوزنگ لازماً محنت طلب ہوگا۔ ''ایک تھی زینو'' بہترین تحریر۔ ''کم بخت عشق'' عشق سچا ہو تو انسان معراج کو پہنچ جاتا ہے اگر جھوٹ، فریب، خودغرضی ہو تو عشق تباہی کے اتھاہ سمندر میں ڈبو دیتا ہے۔ دیمک زدہ محبت، نجم سحرش حسینہ، چنچل کے ساتھ، Love-2016، خلاف توقع، بارگاہِ عشق میں، عشق کی شاخ کا اُلو جیسی اچھوتی کہانیاں زبردست رہی۔ ''زرد لومڑی'' سپر۔ ''بلیک لسٹ'' آئی ایس آئی اور سیاست سے تعلق رکھنے والوں کے لیے معلومات کا خزانہ۔ ''زہر عشق'' عشق نمبر میں زہر عشق عشاق کے لیے مشعل راہ ہے۔ ڈرخوف، اسرار کی سختیاں جھیلنے والے سرفروشان کی داستان۔ تیر نیم کش، ہائیڈ پارک، مسئلہ یہ ہے۔ لاجواب ہیں۔ صبا قمر صاحبہ سے انٹرویو نہایت شاندار۔ اب آتے ہیں احوال نامے کی طرف۔ سارے خطوط خوب صورت ہیں۔ رفعت ناز صاحبہ، میرے خط اور کہانی کو 100 نمبر دیے بہت شکریہ۔ شاہ کنول، صدام حسین غازی، مقصود بلوچ آپ سب کا کہانی کی پسندیدگی پر شکریہ۔ سب کہانیاں، خطوط نہایت شاندار ہیں۔ ہر خط میں سچی کہانیاں سے اپنائیت، پسندیدگی، محبت کی خوشبو اور اظہار ہوتا ہے یہ سب ادارے کی محنتوں کا ماحاصل ہیں۔''

✿ پیارے بھائی! نہایت شاندار تبصرے کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ سلامت رہیے۔ کہانیاں بھی جلد شائع ہوں گی۔

☆ قمبر، شہداد کوٹ سے ہمارے بھائی مور شاہد حسین لکھتے ہیں۔ ''عشق نمبر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ 3 نومبر کو موصول ہوا۔ سرورق خوب صورتی سے سجا ہوا ہے۔ صبا قمر سے ہیلو ہائے کے بعد اگلے اشتہارات نظر انداز کرتے ہوئے منزہ سہام کا اداریہ شاہ لاکلہ بہت یاد آؤ گی۔ دل کی آنکھ سے پڑھا۔ محفل احوال، اپنوں کی محفل، محبتوں کی محفل اپنے عروج پر تھی۔ محفل کے آغاز میں آپ کی باتیں دل میں اتر گئیں۔ ایم اے راحت انکل کے لیے دلی دعائیں۔ جی آر انکل اور صدام حسین غازی ویلکم بیک۔ سدرہ انور اور جو نیجو سسٹرز امید ہے خیر و خیریت سے ہوں گی۔ محمد اسماعیل بروہی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ خیریت ہے۔ صائمہ مجید بھائی خوش و سلامت رہیں۔ ارم خان رب سائیں آپ کو کامیابی عطا فرمائے۔ دعاؤں میں یاد رکھنا۔ ممتاز احمد بھیا السلام علیکم! رفعت ناز باری آنے پر کہانی ضرور شائع ہوگی۔ سلامت رہیں۔ بھیا محفل کے اختتام میں آپ کی نظم ''ہیر رانجھا'' دل کو بھا گئی۔ عشق نمبر بہت ہی عمدہ تھا۔ عشق نمبر کا انمول تحفہ دینے پر بے حد شکریہ۔ آپ سمیت تمام لکھاری حضرات کو مبارک باد۔ تمام لکھاریوں نے عمدہ تحریریں پڑھنے کو دی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح پرچے کی ابتداء اپنے من پسند سلسلہ خاص ''زہر عشق'' سے کی۔ یقین مانو ایسا سلسلہ پہلے کبھی نہیں پڑھا۔ ایم اے راحت کی ''زرد لومڑی'' عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اسماء اعوان ''لائف بوائے'' ہمیشہ کی طرح منفرد۔ اقبال بانو، ایک تھی زینو، بے مثال، ممتاز احمد کم بخت عشق، محمد بلال فیاض رائٹ ٹریک، بہت بہترین۔ کنول عمران خان ''عشق یقین ہے'' ضرغام محمود ''مٹھی بھر خوشیاں تھیں بس اچھی تھیں۔ ایم حسن نظامی نجم، سحرش اور حسینہ، حنیف عاصم بلوچ ''عشق زندہ رہے گا'' دل کی آنکھ سے پڑھی۔ جیجل مجلو، چنچل کے ساتھ، عبدالغفار عابد یوں قرض چکایا ہے، محبت کی انوکھی داستان تھیں۔ ایک تصویر ایک کہانی دانیال شمسی کی اچھی کوشش ہے۔ ذیشان فراز نے آج کی ساحرہ صبا قمر سے ملایا اچھا لگا۔ ایڈیسن اور لیس مسیح ''بے غیرت کہیں کی'' ارم نام لو 2016، عظمیٰ شکور ''خلاف توقع'' سید ملازم حسین ''عشق کے کوہسار'' فیصل منظور یہ کیسی محبت بے حد پسند آئیں۔ ''بارگاہ عشق

میں "حنا بشریٰ منفرد تحریر پڑھنے کو دی۔ نمو دشام" بھارت میں ایک لسٹ" معلومات میں اضافہ ہوا۔ عشق کی شاخ کا انوکھا سا تحریر تھی۔ مسئلہ یہ ہے، یاسمینہ پارک، تیریم کش بہت اچھے سلسلے ہیں۔"

☆ پیارے مور! بھلی کرے؟! تبصرہ اتنا شاندار تھا کہ مجھے تمہیں فون کر کے شاباش دینا پڑی۔ امید ہے آئندہ احتیاط کرو گے۔ خوش رہو۔

☆ شاہدہ، لاہور سے پہلی بار آمد ہے۔ ہماری بہن دیا آفرین کی، لکھتی ہیں۔ "سچی کہانیاں میں میری شرکت پہلی بار ہے۔ وجہ ایک عدد سچی کہانی جو اس خط کے ساتھ ارسال کر رہی ہوں۔ البتہ تبصرہ سے قاصر ہوں کہ پرچہ ملنے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ ویسے سلسلے وار ناولز سے "لائف ہوا ایسے" کی ہلکی پھلکی کہانی تک سب کچھ اچھا ہوتا ہے۔ تفصیلی تبصرے سے معذرت۔ اگلے ماہ کوشش کروں گی۔ سچی کہانیاں وقت پر مل جائے۔ اس وقت تک کے لیے اجازت۔"

☆ پیاری سی بہن دیا! گڑیا سب سے پہلے تو خوش آمدید! اگلے ماہ پلیز تم نے پورے پرچے پر تبصرہ کرنا ہے۔ معذرت سے کام نہیں چلے گا۔ کہانی کے بارے میں جلد رائے دیں گے۔

☆ ہمارے نئے قلمی ساتھی ایم حنیف عاصم بلوچ میاں چنوں، خانیوال سے اپنے تفصیلی تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ لکھتے ہیں۔ "محترم کاشی بھائی میں آپ کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے میری بے حد حوصلہ افزائی کرتے ہوئے میری کہانی "عشق زندہ رہے گا" کو قابل اشاعت سمجھ کر سچی کہانیاں کے قیمتی صفحات پر جگہ دی ہے۔ یہ آپ کا بڑا پن ہے جو ہم جیسے نئے قلمکاروں کا حوصلہ بڑھاتا ہے اور ہمارے دکھ سکھ میں بھی ہمیں حوصلہ دیتا ہے۔ بہرحال ویری ویری تھینکس! کاشی بھائی ایک بات جو میں اپنے بہن بھائیوں سے کہنا چاہتا ہوں پلیز اسے ضرور شائع کیجیے گا۔ وہ بات یہ ہے کہ پچھلے دو تین شماروں سے میں تقسیم ایوارڈ کی تقریب کے بارے میں پڑھ رہا ہوں اور میرے تمام بہن بھائی لکھنے پڑھنے والے اس تقریب کو بہت زیادہ اپریشیٹ بھی کر رہے ہیں اور واقعی یہ ہے بھی خوشی کی بات لیکن میں انتہائی احترام سے اپنے تمام لکھنے والے بہنوں بھائیوں سے ایک سوال ضرور کرنا چاہوں گا کہ ادارہ تو ہم سب کے لیے بہت کچھ سوچتا بھی ہے اور ہمیں عزت و شہرت دینے کے لیے بہت کچھ کر بھی رہا ہے اور یہ تقریب بھی صرف اور صرف ہمیں اس معاشرے میں اعلیٰ مقام اور مزید عزت و شہرت دینے کے لیے منعقد کر رہا ہے لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ مجھ سمیت ہم سب نے اپنے اس ادارے کے لیے کیا سوچا ہے یا ابھی تک ہم سب کو عزت و شہرت دینے والے اس ادارے کے ساتھ ہم نے کیا تعاون کیا ہے۔ کیا صرف اعزازی پرچے لے کر ہم اسے ادارے کے ساتھ تعاون سمجھتے ہیں؟ کیا یہی تعاون ہے کہ نیڑھا میڑھا سا لکھ کر بھیج دیا اور اس کی نوک پلک سنوارنے کی ذمہ داری اور شائع کرنے کا فریضہ بھی ادارے پر ڈال دیا اور احسان کر بیٹھے کہ ہم نے کہانی لکھ کر ادارے پر بہت بڑا احسان کر دیا ہے۔ کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ وہ ادارہ کن کن مشکل مراحل سے گزر کر ہمارے دکھ سکھ میں ہمارے کام آتا ہے۔ ہماری عزت و شہرت کے لیے اسے کیا کیا مشکلیں درپیش آتی ہیں۔ ہم سب کی یقیناً یہی خواہش ہوگی کہ ہم سب کو ایوارڈ ملنے چاہئیں۔ خواہ ہماری تحریریں جیسی بھی کیوں نہ ہوں جب کہ ہر اشتہار میں ادارے کے ساتھ تعاون کا کہا گیا تھا۔ ہم نے کیا تعاون کیا ہے اب تک؟ میرا سب بہنوں بھائیوں سے سوال ہے۔ ہم سے تو ابھی تک اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی ہے۔ ہم ادارے کی نہ سہی اپنی ہی عزت اور شہرت بڑھانے کے لیے ایک ماہ میں کم از کم چار پانچ شمارے اضافی خرید کر اپنے دوستوں یا چاہنے والوں کو ہی پڑھنے کے لیے دے دیں۔ ادارے نے کون سا ہم

بس دعا چاہیے

محترمہ منزہ سہام کی بڑی ہمشیرہ ان دنوں امریکہ میں شدید علیل ہیں۔ ادارہ پرل پبلی کیشنز اپنے قاری اور لکھاری ساتھیوں سے محترمہ رعنا قیصر صاحبہ کی صحت یابی کے لیے دعا کی اپیل کرتا ہے۔

سے ہزاروں لاکھوں کا تعاون مانگا تھا۔ عام فضول کاموں میں تو ہم ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ لیکن اپنے ادارے کی ساکھ کو بڑھانے اور اپنی عزت و شہرت کے لیے ہم اتنا تردد برت رہے ہیں۔ میرے انتہائی قابل احترام بھائی بہنوں اگر اب تک آپ لوگوں کو یہ خیال نہیں آیا تو پلیز میری آپ سے درخواست ہے کہ اپنی عزت و شہرت کے لیے ہی سہی کچھ تو آپ لوگ بھی اپنے ماہنامے سچی کہانیاں کے لیے سوچیں۔ یہ آپ کا ادارے پر احسان نہیں ہوگا بلکہ آپ کی ہی عزت و شہرت بڑھے گی۔ بہرحال سمجھنے کے لیے یہی بہت کچھ ہے۔ کیونکہ ایسے تو ہم سچی کہانیاں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں لیکن مزہ تو تب ہے جب ہم پریکٹیکلی بھی عمل کریں۔ معذرت کے ساتھ خط کچھ لمبا ہو گیا ہے لیکن میں نے دل کی بات قلم کے ذریعے کہہ دی ہے اور اگر میرے سچ سے کسی بہن بھائی کا دل دکھا ہے تو معذرت خواہ ہوں۔ میری پھر گزارش ہے کہ بجائے ایک دوسرے پر غلط تنقید کرنے اور بلاوجہ ٹانگیں کھینچنے کے ہمیں ایک دوسرے سے خلوص حوصلہ افزائی اور ادارے کی تعمیر و ترقی کے لیے سوچنا چاہیے۔ کوئی اچھا لکھتا ہے یا برا لکھتا ہے۔ یہ فیصلہ ادارے اور عوام پر چھوڑ دینا چاہیے۔ رائٹر کی اپنی سوچ قلم اور لفظ اس کے اچھے برے کا خود فیصلہ کر دیتے ہیں۔ پلیز سب کے لیے اچھا سوچنا چاہیے۔ آخر میں بالخصوص لکھنے والی بہنوں اور بیٹیوں کو داد دیتا ہوں جن میں ارم ناز، منزہ سہام، امثال، اسماء اعوان قابل ذکر ہیں دیگر بہن بھائی بھی بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ میری طرف سے تمام ادارے کے کارکنان کو بہت سی دعائیں!''

☆ پیارے بھائی عاصم! آپ کی سوچ اور آپ کے خیال نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ سچ میں آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ آپ کی محبت ہی ہمارا سب کچھ ہے۔

☆ لاہور سے ہماری بہت پیاری بہن ثمینہ طاہر بٹ احوال میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں۔ ''سچی کہانیاں کا خاص عشق نمبر مجھے 9 نومبر کو ملا۔ بہت شکریہ کاشی سر۔ آپ نے میری تحریر کو ''عشق نمبر کی سوغات'' کا درجہ دیا میری محنت وصول ہو گئی۔ جزاک اللہ۔ راحت صاحب کی صحت اور تندرستی کے لیے دل سے دعا ہے۔ ایک ڈیڑھ ماہ پہلے میری خوشدامن صاحبہ قضائے الٰہی سے رحلت فرما گئیں اور اب میری والدہ صاحبہ بیمار ہیں۔ ان کا میجر آپریشن ہوا ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ میری امی جان کے لیے دعائے صحت ضرور کیجیے گا۔ اب آتی ہوں شمارے کی طرف ویسے تو اکتوبر کے شمارے پر بھی آدھا ادھورا تبصرہ لکھا پڑا ہے سوچا اسے الگ سے کیا بھیجوں۔ نومبر، اکتوبر کا ایک ساتھ ہی لکھ ڈالتی ہوں۔ منزہ جی کے اداریے ''بے خبر اور شاد لائلہ تم بہت یاد آؤ گی'' ہمیشہ کی طرح روح کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ صفحہ نمبر 8 سے لے کر صفحہ نمبر 29 تک کاشی سر نے خوب محفل سجا رکھی ہوتی ہے۔ سب نئے اور پرانے احوالیوں کو میرا پرخلوص سلام۔ یہ محفل بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ اس میں آنے والے سب ساتھی ایک دوسرے سے بہت عزت احترام اور خلوص سے ملتے ہیں۔ بھائی فیصل، ندیم بھٹی صاحب وعلیکم السلام، اور اللہ پاک آپ کو خوش رکھے، آپ کے لیے آسانیاں پیدا کرے آمین۔ بھائی مجید احمد جائی، بھابی صائمہ مجید، آپی نگہت غفار، احسن ابرار رضوی صاحب، صائمہ بشیر،

مومنہ بتول، شاہدہ ذاکر، حنا بشریٰ، ارم خان، ممتاز احمد، ثناء کنول، غزالہ کرن، بشریٰ کنول، مقصود احمد بلوچ، ایم حسن نظامی، تنزیلہ تانی، خضر حیات، فرزانہ گل، حسین خواجہ، مہر پرویز دولو، مومنہ بتول، سلیمان شبیر، فرح انیس، ملک علی رضا، نزاہت افشاں، ام حبیبہ آپی نفیسہ فضل، سید ملازم حسین شیرازی، منور شاہد حسین، رانا حبیب الرحمن اور باقی سب احوالیوں اور لکھاریوں کے لیے بھی بہت سی دعائیں۔ آپ سب نے میری تحریروں کو پسند کیا اور میرے تبصرے کو بھی سند پسندیدگی بخشی۔ آپ سب کا ایک بار پھر شکریہ۔ جزاک اللہ۔ اکتوبر کے شمارے میں سیمی اختر کی ''وی آئی پی'' اسماء اعوان کی ''لائف بوائے کہانی'' ارم خان کی ''فرینڈ شپ'' ضرغام محمود کی ''ابلیس'' ام مناہل کی ''سیاہی پھیلی ہے ہر طرف'' سید ملازم حسین کی ''کفارہ'' اعجاز احمد فکرال کی ''چوروں کو پڑ گئے مور'' ثناء کنول اللہ دتہ کی ''جسٹ فار انجوائے منٹ'' نسیم سحر کی ''زندہ دفن کر دیا'' رئیسہ خالد کی روشنی والا رستہ'' ارم ناز کی ''نظرو کی گھر والی'' پرویز احمد دولو کی ''بدمعاش'' مجید احمد جائی کی ''انگور کی بیٹی'' نوزیہ فرید احمد کی ''جھوٹا گواہ'' ندیم عباس میواتی کی ''وودن کی ہیر'' جاوید راہی کی ''آخری فیصلہ'' عطیہ ہدایت اللہ کی ''مرد اور عورت'' غرض کہ سب کی تحریریں اپنی اپنی جگہ بہت اعلیٰ تھیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اور اب آتی ہوں نومبر کے ''عشق نمبر'' کی طرف اور اس میں بات کرنا چاہتی ہوں سب سے پہلے ادریس ایڈیسن مسیح کی ''بے غیرت کمینی کی'' اس قدر خوب صورت کہانی کہ الفاظ نہیں ہیں میرے پاس۔ اقبال بانو آپا کی ''ایک تھی زینو'' حنا بشریٰ کی ''بارگاہ عشق میں'' سید ملازم حسین شیرازی کی ''عشق کے کوہسار'' عبدالغفار عابد کی ''یوں قرض چکایا ہے'' جمیل مجلو کی ''مشعل کے ساتھ'' بلاشبہ بہترین تحریریں تھیں۔ ممتاز احمد کی ''کمبخت عشق'' محمد بلال فیاض کی ''رائٹ ٹریک'' اعجاز احمد فکرال کی ''دیمک زدہ محبت'' ایم حسن نظامی کی ''نجم، سحرش، حسینہ'' ارم ناز کی ''لو 2016'' عظمیٰ شکور کی شوریدہ سر محبتوں کی سچی تصاویر۔ بہت خوب، ماشاء اللہ سب نے بہت اعلیٰ لکھا۔ ''زرد لومڑی'' اور ''زہر عشق'' بھی اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ اور آل سارا شمارہ ہی بے مثال رہا۔ بھارت میں بلیک لسٹ کی یہ قسط بھی آنکھیں کھول دینے والی رہی۔ ''ہائیڈ پارک'' اور ''تیر نیم کش'' کے سب سلسلے بھی بے مثال رہے۔ اللہ کو منظور ہوا تو اگلے ماہ پھر حاضری دوں گی۔

◄ اچھی بہن! تبصرہ آپ نے شاندار کیا مگر کچھ جگہ آپ کی وضاحتیں...... کیا آپ کو ضرورت ہے؟؟؟ جو اچھا لکھتا ہے ایمانداری کو اپنا شیوہ بناتا ہے ہم اسی کو بڑا کہتے ہیں۔ ساری عمر لکھ کر بھی اگر آپ کو پہلے دن ہی کی طرح Treat کرنا پڑے تو آپ کیا لکھاری ہوئیں......!!

☆ کراچی سے ہماری پیاری آنٹی نفیسہ فضل لکھتی ہیں۔ ''عشق نمبر واہ کیا بات ہے یکم نومبر کو مل گیا اور جلدی جلدی پڑھ ڈالا۔ ''ایک تھی زینو'' اقبال بانو عشق میں ڈوبی اچھی تحریر ہے۔ آج کل ایسا عشق کہاں۔ ''کم بخت عشق'' ممتاز احمد، خاور نے اپنے دوست شہباز کے اعتماد کو دھوکا دیا اور سویرا کین اپنے شوہر اور گھر والوں کو دغا دیتی رہی جس کا انجام یہ ہی ہونا تھا۔ ''رائٹ ٹریک'' محمد بلال فیاض۔ آج کل کے فلرٹ لڑکے پیسے کی خاطر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ''دیمک زدہ محبت'' اعجاز احمد فکرال، ایسے نکمے لڑکے کا انجام اچھا ہی ہوا جو کبھی کسی ایک کا نہ ہوا۔ ''عشق یقین ہے'' کنول عمران خان، ماروی اور مراد کی محبت سچی تھی۔ نذیر کی ہٹ دھرمی سے بہت مشکلات ہوئیں۔ مگر جیت بالآخر ماروی اور مراد کی ہوئی۔ ''مٹھی بھر خوشیاں تھیں بس'' ضرغام محمود، اچھی تحریر ہے۔ دکھی کرگئی۔ عرزوار خان کا فیصلہ اچھا تھا۔ ''نجم، سحرش اور حسینہ'' ایم حسن نظامی، کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ ''عشق زندہ رہے گا'' ایم حنیف عاصم بلوچ، زبردست کہانی ہے۔ صبا قمر کا انٹرویو اچھا لگا۔ ''مشعل کے ساتھ''

پہلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ

انتظار کی گھڑیاں ختم!

منی پاکستان سے نکل کر......

پاکستان کے دل میں......

زندہ دلانِ لاہور کے درمیان

ماہِ جنوری میں

پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ منعقد کی جا رہی ہے

کیا لاہور...... کراچی سے سبقت لے جائے گا؟

اس سوال کا جواب...... سچی کہانیاں کے چاہنے والوں کے ہاتھ میں ہے

اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے......

آپ میرا ساتھ دے رہے ہیں ناں؟

آپ کے جواب کا منتظر......

آپ کا اپنا......

کاشی چوہان

نوٹ: تقریب کی تاریخ اور مقام کا اعلان اگلے ماہ کے شمارے میں کر دیا جائے گا۔

جیسی ستو ایک اچھی کہانی لائی ہیں۔ "بے غیرت کہیں کی" ایڈیسن ادریس مسیح، لاجو نے ساری زندگی اپنی برباد کی اس محبت کی خاطر بہت خوب۔ "بارگاہِ عشق میں" حنا بشریٰ، بہت اچھی تحریر ہے۔ "لو 2016" ارم ناز، "عشق کے کوہسار" سید ملازم حسین شیرازی اچھی کہانیاں تھیں۔ "یہ کیسی محبت" فیصل منظور، دعا کے ساتھ سبز بدن نے بہت برا کیا۔ وہ تو ناسمجھ بچی تھی غلطی دعا کی ماں کی تھی۔ "خلاف توقع" عظمیٰ شہزور، "عشق کی شاخ کا الو" ثمینہ طاہر بٹ، مڈل کلاس کے عشق ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایم اے راحت صاحب کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ پاک انہیں زندگی اور صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ "زرد لومڑی" دلچسپ ہو گیا ہے اور کاشی بیٹا آپ کیا چیز ہو کہاں سے چن چن کر لفظوں کے موتی لاتے ہو۔"

☆ اچھی آپی! تبصرہ بہت زبردست کیا آپ نے۔ کہانیاں انشاء اللہ بہت جلد شائع ہوں گی۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

☆ گوجرہ چک نمبر 301، ج ب سے یہ پہلی پہلی آمد ہے غلام مرتضیٰ عون صاحب کی لکھتے ہیں۔ "شروع ہوتی سردی میں نومبر کا شمارہ ملا۔ عشق نمبر، اب عشق نمبر کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ شمارہ سورج جیسا بہترین اور روشن ہے۔ تمام کہانیاں اچھی ہیں سب سے اچھی بات یہ کہ کہانیوں میں کوئی مقصد ہے کوئی اچھی بات ہے۔ میں بھی بہت جلد آپ کو ایک کہانی روانہ کروں گا۔ نومبر 2002ء سے سچی کہانیاں کا پکا قاری ہوں تب بک اسٹال سے لیتا تھا 2011ء سے بذریعہ ڈاک سالانہ خریدار ہوں۔ محمود شام صاحب کا سفر نامہ شمارے کی جان ہے یہ 1970ء کے حالات جو ہم کو بتا رہے ہیں بہت اچھا ہے۔ آج کی نسل کو پتا تو لگے پاکستان کی زندگی میں کیا کیا مشکلات آتی رہی ہیں مگر خدا کا بنایا ہوا یہ ملک ہمیشہ قائم رہے گا۔ اب پراسرار نمبر کا انتظار ہے۔ آپ مہر جوئی نمبر بھی شائع کریں امید ہے یہ خط شائع ہوگا۔ ایم اے راحت صاحب کے لیے خاص دعا۔"

☆ پیارے مرتضیٰ! خوش آمدید! تبصرہ بہت اچھا لگا۔ اگلے ماہ تمہاری آمد کا انتظار ہے۔ کہانی جلد بھیجو پڑھ کر رائے دیں گے۔

☆ کوٹ نجیب اللہ سے یہ پہلی بار احوال میں آمد ہو رہی ہے ہمارے ننھے ساتھی فہد علی عباسی کی لکھتے ہیں۔ "میرا نام فہد علی عباسی ہے۔ مجھے شعر لکھنے کا بہت شوق ہے۔ میری عمر 17 سال 6 ماہ ہے۔ میں یہ کچھ شاعری آپ کو بھیج رہا ہوں اگر آپ کو اچھی لگے تو اسے ضرور شائع کریں۔ مجھے بہت خوشی ہوگی اور میں اس سے بھی اچھی طرح لکھ سکوں گا۔ میں کافی عرصے سے لکھ رہا ہوں (ارے.....) مگر آج تک کہیں بھی شائع نہیں کروائی۔ میرے دوست مجھے کہتے ہیں کہ تم بہت اچھا لکھتے ہو۔ (اچھا جی .....) اس لیے میں آپ کو بھیج رہا ہوں اور اگر آپ کو اچھی لگے تو مجھے رسپانس ضرور دیں۔"

☆ پیارے فہد! خوش آمدید! تبصرہ کہاں ہے۔ اب اگلے ماہ مکمل تبصرے کے ساتھ تمہارے منتظر ہیں۔ شاعری معیاری ہوئی تو جلد شائع کریں گے۔

☆ ہمارے پیارے بھائی چکوال سے عبدالعزیز جی آ کی آمد ہے، لکھتے ہیں۔ "ہمارے اردو کے ٹیچر کہا کرتے تھے الفاظ پرندوں جیسے ہوتے ہیں۔ دل کی دھرتی پر اتریں تو لکھ لیا کرو۔ اڑ جائیں تو واپس لوٹ کر نہیں آتے۔ مجھے لفظوں سے دلی محبت ہے اور یہ محبت ہی ایک مدت کے بعد مجھے احوال میں کھینچ لائی ہے۔ ماشاء اللہ طشتری احوال میں بڑی رونق ہے۔ ہر چہرہ چاند کا ٹکڑا اور گلاب کا مکھڑا لگتا ہے۔ اب تو بڑے رنگ ہیں نئے اور پرانے دوستوں کے سنگ ہیں۔ پہلا دل آویز خط غزالہ کرن کا جس کی کھلی ڈلی بات بہت اچھی تھی۔ میں نے بھی سچ بولا تھا بس پھر کیا

نیا سال' نئے ہنگامے

برف کے شہر

قمر علی عباسی کے قلم سے آخری سفرنامہ

ملکوں ملکوں پھرا مسافر اور پھر...... مسافر راہیِ عدم ہو گیا۔ قمر علی عباسی' ہمارے دیرینہ ساتھی اور ہم دم، سچی کہانیاں میں، قمر علی عباسی کے قلم سے آخری سفر' پاکستان کے شمالی علاقہ جات' کوہساروں کی دنیا' برف کے شہروں کے نظارے' ہمارے اپنے وطن، جنت نظیر پاکستان کے وہ قصے جنہیں پڑھ کر آپ خود اپنا وطن دیکھنے کے لیے بے خود ہو جائیں گے۔

لاری اڈا

سفر وسیلۂ ظفر...... مگر اس سفر میں بھلا کون منزل تک پہنچا، کون راہزن ہوا اور کون رہبر' حضرت انسان کے نئے نئے قصے' نیا سلسلہ' لاری اڈا...... پلیٹ فارم کے شاندار سلسلے کے بعد' عوام کے نبض شناس لکھاری ممتاز احمد کے قلم سے...... آپ کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کرنے کے لیے ماہ جنوری سے سچی کہانیاں میں تہلکہ خیز آغاز۔

پاگل خانے سے پاگل خانے تک

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے ☆☆ جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

اُن جیتے جاگتے کرداروں کی کہانی' جو خود ایک کہانی بن گئے۔ ہوش و خرد سے بیگانہ' زمانے کے اُن دیوانوں کی داستانیں جو آج آہنی سلاخوں کے پیچھے' خود اپنی ذات کو کھوج رہے ہیں۔ وہ انمول کردار' جو زندگی کے بازار میں آج بے مول ہو گئے۔ پاگل خانے میں اپنی زندگی کے دن پورے کرتے قابلِ رحم لوگوں کی عبرت ساما نیاں' سچی کہانیاں کا نیا لاثانی سلسلہ۔

سیلف میڈ لوگ

زندگی کے اہم شعبوں میں سرگرمِ عمل مشہور و معروف شخصیات سے انٹرویوز کا نیا سلسلہ۔ سیلف میڈ لوگوں کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے جڑا وہ خاص سلسلہ' جو یقیناً قارئین کے دل کی آواز بنے گا۔ نئے سال کا منفرد سلسلہ۔

ہوا موت کے منہ سے نکال ہوا راہ سلوک کا مسافر ہوں۔ تصوف، روحانیت کا طالب علم ہوں۔ راہ حق سے ہٹا نہیں نہ ہی ہٹا ہوا ہوں اور ان شااللہ کچ لحد تک ڈٹا رہوں گا۔ میری غزل کا اک شعر ہے
جس کو دیکھو وہی منافق، کس سے دل کی بات کریں ☆☆ نفسا نفسی کے عالم میں دل کا آنگن سونا ہے
فیصل ندیم بھٹی، ممتاز احمد، ثناء کنول، مہر پرویز دولو، نظامی صاحب، ارم خان، حنا بشریٰ، رانا حبیب الرحمٰن، مومنہ بتول، شاہدہ ذاکر، صائمہ بشیر، مجید جانی، صداقت حسین، ساجد اور خطوط کی بہار میں آپی نفیسہ فضل اور آپی نگہت غفار بھی شامل ہیں جن کی دعاؤں کے ہم سب طلب گار ہیں۔ سب احوالیوں کے تبصرے جاندار و بے مثال ہیں۔ عشق نمبر کی کہانیاں پڑھ کر یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں عاشقوں کے شہر میں گھوم رہا ہوں اور خوفزدہ ہوں لرز رہا ہوں کانپ رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ انسان مرد و عورت کیا دنیا میں صرف اسی مقصد کے لیے بھیجے گئے۔ اس دھرتی پر عشق نے کیا کیا گل کھلائے۔ ممتاز احمد کی کہانی ''کم بخت عشق'' کے کردار خاور نے بغیر سوچے سمجھے شیطانی آکساہٹوں میں آ کر اپنی اور اپنے اہل خانہ کی ہنستی مسکراتی زندگیاں برباد کر ڈالیں۔ محمد بلال فیاض کی ''رائٹ ٹریک'' گڈ اسٹوری ہے۔ اقبال بانو کی کہانی ''ایک تھی رینو'' متاثر نہ کر سکی۔ ثمینہ طاہر بٹ ''عشق کی شاخ کا الو'' بہت پسند آئی۔ ویلڈن، بجگل مجلو کی ''منحل کے ساتھ'' پاکیزگی کے پردے میں لپٹی کہانی نے متاثر کیا۔ مزید مطالعہ جاری ہے۔ سچی کہانیاں ایوارڈز 2016ء کی پہلی پروقار تقریب لاہور شہر میں منعقد کرانے کا اشتہار نظروں سے گزر رہا ہے۔ میں خصوصی طور پر آپ کو میڈم منزہ سہام اور پوری ٹیم کو ایڈوانس مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''
☜ اچھے بھائی! انشاء اللہ امید ہے آپ ہر ماہ اپنی آمد اسی طرح باقاعدہ بنائیں گے، سلامت رہیے۔
☆ لڈن ضلع وہاڑی سے ہمارے بہت پیارے ساتھی ''منشی محمد عزیز'' شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔
'' کچھ یاد نہیں کتنے عرصے بعد آپ سے مخاطب ہوں۔ بہر حال آپ کی محبتوں کا میں شروع سے معترف رہا ہوں اور یقین کریں بعض اوقات مجھے شرمندگی سی محسوس ہوتی ہے کہ کہیں آپ سے کیا ہوا کوئی بھی وعدہ ایفا نہیں کر سکا لیکن آپ یقین کریں کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ بھئی میرے حالات تو آپ جانتے ہی ہیں بس غم روزگار سے فرصت نہیں ملتی لیکن پھر میں بھائی ممتاز احمد صاحب بننے کی سعی ناکام کرتا ہوں کہ بھلا ان کا میرا کیا مقابلہ! چہ پدی چہ پدی کا شوربہ! اکتوبر کا شمارہ چونکہ کافی لیٹ ملا تھا اور پھر اب تو نومبر بھی قریب ہے لیکن آپ میرے یہ چند الفاظ صرف حاضری سمجھ کر شامل احوال کر لیں تاکہ دوستوں سے سلام دعا کر لوں۔ میری غیر حاضری کے دوران جن دوستوں نے احوال میں، فون پر یا ایس ایم ایس کے ذریعے مجھے بتایا کہ آپ کی کمی محسوس ہو رہی ہے ان سب کا خصوصاً ابوہریرہ بلوچ، حافظ ندیم عباس میواتی، مہر پرویز احمد دولو، عبدالغفار عابد، مقصود احمد بلوچ، ارشد وفا، اشفاق شاہین، ممتاز احمد، سدرو انور علی، محمد یعقوب احمدانی کا مشکور ہوں کہ ان صاحبان نے گاہے بگاہے یاد رکھا اور عظمیٰ شکور کا بھی شکریہ ادا کر دوں کہ انہوں نے یاد نہیں کیا۔ دیگر دوستوں میں رانا حبیب الرحمٰن لاہور جیل سے فلک شیر تابش، نزاہت افشاں، ایم حسن نظامی کے نام سچی کہانیاں میں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔''
☜ پیارے منشی جی! دیر لگی آنے میں..... شکر ہے پھر بھی آئے تو۔ آپ کے چند الفاظ نے بھی احوال میں رونق کر دی ہے۔ آپ سے کیا گلہ کروں کہ ہر ماہ آپ کی حاضری مطلوب ہے۔ مگر ہائے رے یہ غم روزگار کے جھمیلے۔ خوش رہیں۔
☆ کوٹری سے تین ماہ بعد آمد ہو رہی ہے ہمارے قاری ساتھی نعمان احمد آرائیں کی، لکھتے ہیں۔ اگست اور ستمبر

تصوف اور محبت کی پُراسرار دنیا کی کہانی

خانقاہ

خانقاہوں، آستانوں، درباروں، مزاروں کی حیرت ناک داستان

کاوش صدیقی ایک معروف لکھاری، جن کی تحریریں نگاہوں سے نہیں دل سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کے قلم کا نوکیلا، کٹیلا نشتر معاشرے کے ان پہلوؤں کو کھوجتا تراشتا ہے جو عیاں ہونے کے باوجود پوشیدہ رہتے ہیں۔ خانقاہ ان کی تیکھی اور چبھتی نشتر زنی ہے جو کہ ہمارے اطراف سے گندھی ہے۔ پیروں، وڈیروں، سیاسی کٹھ پتلیوں کے پراسرار معاملات، سچے، جھوٹے، مصلحت آمیز، دروغ گو کے درمیان ایک ''مردِ درویش'' کی عجیب داستان جس کے افکار سے دنیا بدل گئی۔

ان کے لئے بطور خاص جو اچھی تحریریں پڑھنا جانتے بھی ہیں اور چاہتے بھی ہیں۔

ماہِ جنوری سے ماہنامہ 'سچی کہانیاں'
میں ہنگامہ خیز آغاز

کے شمارے پر تبصرہ کچھ گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے نہیں کر سکا مگر اب کر رہا ہوں اور آپ نے میرے گزشتہ تبصرے کا جواب دیا اور اس میں آپ نے T.C.S والے کا پوچھا ہے آپ اس T.C.S والے کو چھوڑیں کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے دوسروں کو نیا راستہ دکھاتے ہیں۔ آپ کا اور قارئین کا ساتھ نصف صدی سے ہے۔ میرا اور آپ کا ساتھ ایک سال 30 دن کا ہو چکا ہے اور تبصرے بھی کافی آتے ہیں۔ تمام احوالیوں کہانیاں اور ناول لکھنے والوں میں کاشی چوہان، ایم اے راحت، مسکرایئے میں ہاہا ہی، ہائیڈ پارک میں مراسلے، انتخاب اور تیر نیم کش میں شعر لکھنے والوں کو ہر بار کی طرح سلام عرض ہے اور ہر بار کی طرح اس بار بھی دست اور تبصرہ کا اداریہ اور احوال تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ احوال میں شامل ہونے والوں کو خوش آمدید اور سچی کہانیاں میں شامل تمام لوگوں کے لیے سلامتی، خوش حالی، تندرستی کی دعا اور جن کے عزیز و اقارب اس دنیائے فانی سے پردہ کر چکے ہیں ان سب کے لیے دعائے مغفرت اور آخر میں اجازت چاہتا ہوں۔''

☆ پیارے نعمان! خوش رہو اور ہاں آئندہ تبصرہ ذرا جلدی اور وقت پر کر دیا کر! بھائی تم نے کہا کہ ٹی سی ایس والے کو چھوڑیں، تو پیارے! تم نے اپنے خط میں اسے کیوں پکڑا تھا؟

☆ کراچی سے بڑے دنوں کے بعد ہمیں ہماری بہن نسیم سحر یاد کر رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''عید کے فوراً بعد پراسرار نمبر دے کر تو آپ نے ڈرا ہی دیا۔ کہانیاں پڑھ تو لیں مگر تبصرہ کی ہمت نہیں ہوئی (ہاہاہا) ستمبر کا شمارہ ذرا دیر سے ملا تھا لہٰذا اس پر تبصرہ بھی ادھار رہا۔ اب اکتوبر کے شمارے کی بات کرتے ہیں حمزہ صاحب کا اداریہ بہت بہترین تھا۔ ''سچی کہانیاں'' کا پہلا ایوارڈ لاہور میں کرنے کا فیصلہ درست ہے کیوں کہ زیادہ تر لکھاری اور احوالی پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں وہ بآسانی شرکت کر سکیں گے اور غالباً ونرز بھی وہی لوگ ہوں گے (ایوارڈ لسٹ کو غور سے دیکھا کریں) شمارے میں جن مرحومین کا ذکر ہے ان کے لیے دعائے مغفرت ہے۔ اب کہانیوں پر تبصرہ محمد سلیم اختر کی پہلی سچ بیانی ہمارے ہاں رائج وی آئی پی کلچر کی عکاس ہے۔ امن منال کی دوسری سچ بیانی غرور میں ڈوبی عورت کی داستان ہے۔ سچ ہے کہ جہالت واقعی بری چیز ہے جب ہی تو ہمارے دین میں علم کو ہی فضیلت حاصل ہے۔ ابلیس میں طاقت اور غرور کا درست انجام بتایا ہے۔ ضروری نہیں ہر چیز پیسے اور طاقت سے حاصل کی جا سکے۔ حیات اللہ طاقت کے نشے میں اپنے بھیانک انجام سے دوچار ہوا۔ ارم خان کی ''فرینڈ شپ'' اور ثناء کنول کی ''جسٹ فار انجوائے'' عام سی کہانیاں تھیں جس میں موبائل کا غلط استعمال اور محض اپنی دلچسپی کے لیے دوسروں سے جھوٹ بولنا۔ یقیناً یہ ہے تو عام سی حرکت مگر اس کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے ہیں اور کم از کم لڑکیوں کو ایسی حرکت زیب نہیں دیتی۔ ملازم حسین شیرازی کی کفارہ اچھی کہانی تھی بات اور وعدہ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ اعجاز صاحب کی ''چوروں کو پڑ گئے مور'' بہت دلچسپ کہانی تھی۔ ہنسی بھی آئی اور افضل صاحب کی بائیسکل سے محبت پر رشک بھی آیا۔ ہلکے پھلکے موضوع پر یہ دلچسپ کہانی بہترین تھی۔ ''روشنی والا رستہ'' گو کہ موضوع پرانا تھا اگر تفصیل سے لکھا جاتا تو زیادہ مزہ آتا۔ شعلہ ساماں تینوں تحریریں زبردست تھیں۔ ارم ناز کی ''نظرو کی گھروالی'' بہت اچھی تھی۔ شاید یہ بھی ہمارے بگڑتے معاشرے کی ایک تصویر ہے۔ ویل ڈن ارم۔ محمد پرویز کی ''بدمعاش'' بھی جہالت اور غربت کے ستم بیان کر رہی تھی۔ عطیہ کی ''مرد و عورت'' بھی بہت اچھی رہی۔ حنا ولید کا انٹرویو لاجواب تھا۔ بلاشبہ سلسلے کی مقبولیت حنا کی ہی وجہ سے ہے۔ ''جھوٹا گواہ'' موضوع بہت گہرائی لیے ہوئے حساس تھا اگر اس پر تفصیل سے لکھا جاتا تو زیادہ سبق آموز ہو جاتا کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ جھوٹی گواہی دینا اور اس کا عذاب بھی سخت ہے۔ ''انگور کی بیٹی'' کہانی بھی

سبق آموز تھی۔ محمود شاہ کا سفرنامہ ہٹ جا رہا ہے۔ باقی ساری چیزیں حسب معمول بہتر تھیں۔ آخر میں میری کہانی لگانے کا شکریہ۔ تمام اسٹاف کو سلام اور دعائیں اور مدیران کرام کو خصوصی سلام اور دعائیں۔''

✿ اچھی بہن! ایوارڈ ونرز پڑھ کر آپ نے ہماری دیانت داری پر ضرب لگائی ہے۔ حالانکہ آپ بھی جنوری 2015ء کی کہانی پر سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ سلیکٹ میں نامزد ہو چکی ہیں۔ تبصرے کا بہت بہت ممنون ہوں۔ اگلے ماہ تبصرے کا انتظار رہے گا۔

☆ ساہیوال سے ہماری سینئر لکھاری بہن نیر شفقت کی احوال میں آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔'' کیسے ہو۔ کبھی یاد ہی کر لیا کرو ہمیں ایک ایس ایم ایس ہی تو کرنا ہوتا ہے کہ آپی فلاں نمبر آ رہا ہے کچھ بھیج دو۔ مگر لگتا ہے کہ ٹائپ کرنے میں بھی ٹائم ضائع ہوتا ہے۔ دہی دو لفظ سچی کہانیاں کی رونق بڑھا دیں تو شان بڑھ جائے گی (ارے آپی! کیا طوطے سے فال نکلوائی ہے)۔ پر اسرار نمبر کے بارے میں پڑھا تو رہا نہیں گیا۔ چاچو کو گھیر گھار کر کہانی سنی اور صفحۂ قرطاس پر بکھیر دی۔ اب ٹائم پر ملتی ہے یا دسمبر میں لگتی ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا۔ (گڈ! ہن ساڈی واری اے)۔ سنا ہے سچی کہانیاں کا ایوارڈ میلہ لگ رہا ہے لاہور میں۔ بلاؤ گے۔ یہ ڈھائی گھنٹے کا تو رستہ ہے لاہور سے ساہیوال کا۔ میں انتظار کروں گی (ویکم جی! آپ کو کیا دعوت نامے کی ضرورت ہے؟) سچی کہانیاں پر تمہاری محنت نظر آ رہی ہے۔ سب دوستوں کو سلام پھر ملیں گے انشاء اللہ۔''

✿ اچھی آپی! تحریر بھیجنے کا شکریہ! ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ سچی کہانیاں باقاعدگی سے پڑھتی ہیں؟؟ لیکن خیر..... ہماری خوش فہمی کا انجام ہوا اور ہاں بہنوں کو دعوت ناموں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جم جم آؤ جی۔

☆ لاہور سے ہماری پیاری بہن حنا بشریٰ عرض گزار ہیں۔ ''نومبر کا شمارہ ''عشق نمبر'' لاجواب تھا۔ سرورق بہت رنگین اور خوشنما تھا۔ منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ دل کو چھو گیا۔ ایم اے راحت صاحب کی صحت و زندگی کے لیے دعا گو ہوں۔ ارم خان اللہ تعالیٰ آپ کو اس نیک مقصد میں کامیاب و کامران کرے اور آپ حافظہ بن جائیں، (آمین)۔ احوال کی محفل کاشی بھائی کے سنگ سجی تھی۔ آپ کے محبت بھرے جوابات سب لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو شاد رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کاشی بھیا سچی کہانیاں اور آپ نے مجھ سمیت بہت سوں کو لکھنا سکھایا۔ رانا حبیب الرحمٰن اور ملازم حسین شیرازی بھیا آپ دونوں کا کوئی ذکر کرے نہ کرے مگر آپ ہماری دعاؤں میں رہتے ہیں۔ کاشی بھیا عشق نمبر آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ تمام رائٹرز نے بہت اچھا لکھا۔ سب نے بہت محنت کی۔ اقبال بانو صاحبہ ایک بڑا نام ہیں تحریر بھی لاجواب تھی۔ ممتاز احمد صاحب نے جس عشق کی بات کی وہ واقعی کم بخت تھا۔ عشق مجازی جب تک عشق حقیقی میں نہ ڈھلے وہ اپنی معراج کو نہیں پہنچتا۔ عبرت انگیز تحریر تھی۔ خوش رہیں۔ بے غیرت کہیں کی، عشق کی لازوال داستانیں تھیں۔ سب نے عشق نمبر کی رونق میں اضافہ کیا۔ اب بات ہو جائے عشق نمبر کی سوغات کی تو ثمینہ طاہر بٹ نے عشق کی شاخ کا اور جس بے ساختگی سے لکھی، وہ قابل تحسین ہے۔ بلاشبہ ثمینہ طاہر بٹ کی تحریر عشق نمبر کی نمبر ون تحریر تھی، ویلڈن۔ عشق نمبر کی پانچ کہانیاں مجھے بے حد پسند آئیں وہ بہت خوب صورت تحریریں تھیں۔ لکھنے والوں نے بہت دل سے لکھا اور عشق نمبر کو چار چاند لگا دیے۔ پہلا نمبر ''رانگ نمبر'' محمد بلال فیاض، دوسرا نمبر ''عشق کے کوہسار'' ملازم حسین شیرازی، تیسرا نمبر ''مٹھی بھر خوشیاں تھیں بس'' ضرغام محمود، چوتھا نمبر ''خلاف توقع'' عظمیٰ شکور، پانچواں نمبر ''دیمک زدہ محبت'' اعجاز احمد قمر ال یہ پانچوں کہانیاں بہت زبردست تھیں۔ میری طرف سے بہت بہت مبارک باد۔ آپ سب نے بہت محنت کی ان پانچوں کہانیوں کی اگلی قسط کا انتظار ہے۔ آخر میں سب

کے لیے بہت سی دعائیں صرف خوش نہیں رہنا بلکہ دوسروں کو بھی خوش رکھنا ہے۔ میں نے احوال میں کاشی بھیا کو ہمیشہ یہ کہتے ہوئے دیکھا محبت، محبت اور صرف محبت۔ سب اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اپنی کہانی اور خط کے شامل کرنے پر شکر گزار ہوں۔ صبا قمر سے ملاقات اچھی رہی۔ خط بہت طویل ہو گیا معافی چاہتی ہوں۔''

پیاری سی بہنا! تبصرہ تحریر کی طرح شاندار کیا تم نے۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔

☆ شادی وال، گجرات سے ہماری شاعرہ بہن عائشہ نور عاشا لکھتی ہیں۔ ''اکتوبر کا شمارہ دیکھا ٹائٹل بہت خوب صورت دل خوش ہو گیا مگر یہ کیا؟ میں نے ڈاؤن لوڈ کیا تو اوپن ہی نہیں ہوا۔ دل پھر سے اپنی جگہ پر آ گیا خیر میں نے کچھ آن لائن ہی پڑھ لیا۔ احوال سب کا ایک سے بڑھ کر ایک رہا۔ سلسلہ وار ناول بہت ہی زبردست ''زہر عشق'' اور ''زر دلومڑی'' اس کے علاوہ جو میں نے تھوڑی سی کہانیاں پڑھیں ان میں سب سے زیادہ دلچسپ ''کفارہ'' سید ملازم حسین شیرازی کی کہانی تھی۔ اس کے بعد ''جھوٹا گواہ'' فوزیہ فریدہ احمد کی پھر ''آخری فیصلہ'' بھی اچھی تھی۔ بادبان، دو دن کی ہیر، نظرو کی گھر والی سب کی سب مزے کی تھیں۔ ان فیکٹ سچی کہانیاں کا ایک ایک ورق مزے کا ہوتا جارہا ہے۔ ہاں جی میں کاغذ بھی کھاتی ہوں اور ڈائجسٹ کے تو کچھ زیادہ مزے کے ہوتے ہیں او مزے سے یاد آیا ''تیرے نیم کش'' بھی بہت اچھا اور مزے دار سلسلہ ہے مگر میں سخن آباد کو بھی مس کرتی ہوں۔ اب اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ سچی کہانیاں ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔ (آمین)۔''

پیاری عائشہ! تمہاری دعائیں اور ہماری محنت ہی سچی کہانیاں کو دلچسپ بناتی ہے خوش رہو اور ہر ماہ احوال کا حصہ بنتی رہو۔

☆ مقصود احمد بلوچ کی میاں چنوں سے آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''سچی کہانیاں نومبر 2016ء مورخہ 31 اکتوبر کو ملا۔ اس دفعہ ٹائٹل دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ بہت ہی شاندار تھا۔ پرچے کو وقت پر مارکیٹ میں لانا، اس کی کمپوزنگ، عمدہ اسٹوریوں کا انتخاب۔ ویلڈن کاشی جی۔ میری نگارشات پسند فرمانے پر فیصل ندیم بھٹی، ملک علی رضا، نزاہت افشاں مہورہ، میں ان سب کا تہہ دل سے مشکور ممنون ہوں۔ اس دفعہ کہانیوں میں محمد حنیف عاصم بلوچ کی اسٹوری ''عشق زندہ رہے گا'' بہت ہی زبردست تحریر تھی۔ ویری ویلڈن حنیف صاحب۔ ممتاز احمد کی اسٹوری ''کم بخت عشق'' بہت ہی عمدہ تحریر تھی۔ اس کے علاوہ خلاف توقع، یہ کیسی محبت، بے غیرت کہیں کی، یوں قرض چکایا ہے یہ سب تحریریں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ اس دفعہ صبا قمر کا انٹرویو پڑھ کر بہت اچھا لگا کاشی بھائی کی ''ہیرا رانجھا'' دل کو چھو جانے والی نظم تھی ویری نائس۔ اب تک کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ انشاء اللہ اب اگلے ماہ حاضری ہو گی۔''

اچھے بھائی! تبصرہ شاندار کیا آپ نے..... مزید یہ کہ سلیم اختر صاحب کو آپ کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ہماری ان سے یہ باتیں ہو چکی تھیں۔

☆ ہمارے ہر دلعزیز لکھاری ممتاز احمد سرگودھا سے عرض گزار ہیں۔ ''دعا ہے ہمارے پیارے وطن میں رہنے والا ہر فرد صحت، تندرستی، سکھ چین اور سلامتی کے ساتھ خوش رہے۔ آمین۔ کاشی بھائی میں یہ خط بستر پر پڑا اور لیٹا لکھ رہا ہوں۔ اللہ کریم نے اپنے خاص فضل و کرم سے نوازا اور ایک خوفناک روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں میری جان بچائی اس پاک ذات کا کروڑ ہا شکر ہے بہت بڑے نقصان سے بچ گیا۔ صرف پیر کی ہڈی ٹوٹی اور چوٹیں آ گئیں۔ میں خصوصی طور پر ریسکیو 1122 کا دلی ممنون اور شکر گزار ہوں اور خراج تحسین پیش کرتا ہوں جو حادثے کے ٹھیک پانچ منٹ کے بعد پہنچ گئے۔ مجھے بڑی بس کے نیچے سے نکالا۔ ابتدائی طبی امداد ضروری انجکشن لگا کر اسپتال شفٹ کیا۔ دل سے

دسمبر 2016ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کرر ہا/کررہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: ____________________

مکمل پتا: ____________________

____

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

دسمبر 2016ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: ____________ تعداد صفحات: ____________

نام: ____________________

مکمل پتا: ____________________

____

فون/ریسل نمبر: ____________________

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

دسمبر 2016ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: ____________ مصنف: ____________

دوم، عنوان: ____________ مصنف: ____________

سوم، عنوان: ____________ مصنف: ____________

نام: ____________ شہر: ____________

ڈھیر ساری دعائیں نکلیں۔ اس سروس سے منسلک تمام اہلکاروں کے لیے جو چوبیس گھنٹے خدمت کے جذبے سے سرشار ہمہ وقت کمربستہ رہتے ہیں۔ اللہ کریم اس سروس کو قائم کرنے والے اس کو چلانے والوں کو اجر عظیم سے نوازے اور آخرت میں سرخرو فرمائے (آمین)۔ اسپتال سے گھر آ گیا ہوں اور میری سچی کہانیاں سے محبت ہے کہ باوجود تکلیف کے خط لکھ رہا ہوں۔ نومبر کا شمارہ عشق نمبر کیم تاریخ کو موصول ہوا۔ دل خوش ہو گیا۔ ویسے تو خوب سے خوب تر کے مصداق ہر مہینے معیار بڑھ رہا ہے۔ مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ سال 2016ء میں شائع ہونے والے تمام شماروں میں نومبر کا شمارہ سب سے بہترین، شاندار اور نمبر ون ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ سرورق سے لے کر کہانیوں اور ہائیڈ پارک کا انتخاب نہایت عمدگی سے کیا گیا۔ بالشبہ یہ سب کاشی کی دن رات انتھک محنت اور لگن کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ میری طرف سے ڈھیر ساری مبارکباد قبول فرمائیں۔ شاد لائلہ کی یاد میں منزہ بہن نے بہت عمدہ اداریہ لکھا۔ کاشی جی نے احوال میں انسانیت کے احترام اور پیار کے حوالے سے محبت کا لازوال پیغام دیا۔ جزاک اللہ۔ میں آپ کے اسی پیغام کے نتیجے میں ان سب لوگوں کو معاف کرتا ہوں جنہوں نے میرے ساتھ زیادتیاں کیں، ذہنی اذیت پہنچائی۔ میرا کسی کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں ہے اگر کسی کا میری وجہ سے دل دکھا ہو دل آزاری ہوئی ہو اگر کوئی مجھ سے ناراض ہے تو میں ان سب احباب سے معافی مانگتا ہوں۔ یہ زندگی چار دن کی ہے ہم نے محبتوں کے پھول کھلانے ہیں۔ اس بار فیصل ندیم بھی اپنے بہترین خط اور تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت سنبھالے ہوئے تھے۔ میں انتہائی ممنون اور شکر گزار ہوں اپنے انتہائی قابل صد احترام اور محترم المقام بھائی جناب عبدالعزیز جی آ صاحب کا جنہوں نے اپنی بے لوث پر خلوص محبتیں نچھاور کی ہیں۔ آپ نے سب بہن بھائیوں نے احوال میں بہت خوب صورت بہت عمدہ تبصرے لکھے۔ اقبال بانو "ایک تھی زینو" کے عنوان سے بہت شاندار کہانی تحریر کی۔ "رائٹ نریک" میں محمد بلال فیاض نے محبت کی رائٹ نریک کو بہت خوب صورتی سے بیان کیا۔ کنول عمران خان بہت عرصے کے بعد "عشق یقین ہے" کے عنوان سے بہت اچھی اور بہترین کہانی لے کر آئیں۔ کنول بہنا ویلڈن۔ مٹھی بھر خوشیاں تھیں بس، انجم، سحرش اور حسینہ، عشق زندہ رہے گا، شمل کے ساتھ بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ عبدالغفار عابد "یوں قرض چکایا ہے" کے عنوان سے مختصر مگر پراثر اچھی کہانی لے کر آئے۔ صبا قمر کا انٹرویو بہت زبردست لگا۔ بے غیرت تتلی، بارگاہ عشق میں Love2016، عشق کے کوہسار، یہ کیسی محبت، خلاف توقع اچھی کہانیاں تھیں۔ "عشق کی شاخ کا الو" بہت مزے دار کہانی تھی۔ "ہائیڈ پارک" میں نمرہ ملک، معاویہ عنبر، ثوبیہ رحمٰن، صائمہ بشیر اور نسیم احمد آکاش کے انتخاب بہت اچھے تھے۔ پسند آئے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی۔"

☆ اچھے بھائی! سلامت رہیے! خدا تعالیٰ آپ کو جلد مکمل صحت یابی عطا کرے۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ آپ ہمارے قارئین کے پسندیدہ لکھاری ہیں۔ تبصرہ شاندار کیا آپ نے۔

☆ سرگودھا سے ہماری بہت پیاری شاعرہ بہن صائمہ بشیر کی احوال میں آمد۔ لکھتی ہیں۔ "امید ہے سب خیریت سے ہوں گے۔ سب کے لیے دعا گو ہوں، اقبال بانو بہت منجھی ہوئی لکھاری ہیں اگر یہ وہی اقبال بانو ہیں جن کو میں بہت سالوں سے پڑھ رہی ہوں "ایک تھی زینو" بہت اچھی کہانی تھی (جی! اقبال بانو ایک ہی ہیں) زینو نے بہت اچھا کیا جو اپنے شوہر کو معاف کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ عورت کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد جو شوہر کی صورت میں ہو عورت اس کو بھول نہیں سکتی۔ ممتاز احمد نے بھی بہت اچھا موضوع چنا۔ عورت اور مرد کی عزت برابر ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ صرف کردار عورت کا ہی مضبوط ہو مرد پر بھی لازم ہے کہ اپنے کردار کی حفاظت کرے۔ برائی کا انجام بھی برا ہوتا ہے۔ عبرت نگاہ ہونا چاہیے۔ ضرغام محمود کی "مٹھی بھر خوشیاں تھیں"

بھی بہت اچھی لگی۔ زوار کا فیصلہ بہت اچھا تھا۔ عبدالغفار عابد کا ”یوں قرض چکایا ہے“ بھی متاثر کن تھی۔ حنا بشریٰ نے بھی اپنی کہانی کے ساتھ انصاف کیا۔ محبت اور عشق میں یہی فرق ہے کہ محبت مجبوریوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے اور عشق جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ باقی احوال بھی بہت دلچسپ ہیں۔ یسیس غزالہ، صائمہ مجید۔ تہنیت غفار، عبدالعزیز نے ممتاز احمد پر بہت ہی بھاری بھرکم تبصرہ کیا، اچھا لگا۔ ممتاز احمد بہت ہی بہت اچھا لکھاری اس کی ہر تحریر بہت ہی سبق آموز ہوتی ہے۔ باقی سب بہن بھائیوں کو بھی بہت پیار اور سلام اور کاشی بیٹا آپ کی تو کیا بات ہے سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔“

◆ ارے ارے آپی! یہ کیا کہہ دیا! سورج کو چراغ دکھانا بہت بڑی بات ہے۔ بس کوشش یہی ہے کہ میرا ہر لکھاری اردو ادب کا نامور لکھاری بن کر معتبر ہو جائے (آمین)۔

☆ جناح کالونی فیصل آباد سے بشریٰ کنول کی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ”ماہ نومبر کا عشق نمبر دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ارے کاشی اتنا شاندار پرچہ دیا واہ! آپ نے تو کمال کر دیا۔ کیا زبردست پرچہ تھا۔ احوال میں آپ کی باتوں نے دل موہ لیا۔ بہت خوب صورت جذبات اور احساسات آپ نے احوالیوں سے شیئر کیے۔ ان باتوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے میری پسندیدہ فنکارہ صبا قمر کا انٹرویو لگا کر میرا دل جیت لیا۔ واہ کیا کہنے آپ کے۔ بس آپ اسی طرح ہر ماہ کسی نہ کسی شوبز کے ستارے کا انٹرویو شائع کرتے رہیں۔ شمارے میں شامل تمام کہانیاں بہت پسند آئیں۔ جن میں ایک تھی زینو، کم بخت عشق، رائٹ ٹریک، عشق یقین ہے، مٹھی بھر خوشیاں، عشق زندہ رہے گا، لو 2016، بارگاہ عشق میں اور عشق کے کوہسار بہت اعلیٰ پائے کی کہانیاں تھیں۔ بہت اچھی لگیں۔ صائمہ بشیر کی غزل بہت پسند آئی۔ میں صائمہ جی کو ایک پیغام دینا چاہوں گی کہ وہ اپنی شاعری کا مجموعہ کلام ضرور شائع کروائیں۔ اب اجازت چاہوں گی اس دعا کے ساتھ کہ سب احوالی ہمیشہ پیار اور محبتیں بانٹتے رہیں۔ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔“

◆ پیاری بہن! آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ ادھر صبا قمر کے انٹرویو نے آپ کا دل جیتا ادھر آپ کے تبصرے نے ہمارا دل جیت لیا۔

☆ کوٹ مومن سے فرزانہ گل رقم طراز ہیں۔ ”میں آپ کی بہت مشکور ہوں آپ مجھے بے پناہ عزت دیتے ہیں اور احوال میں جگہ دیتے ہیں اللہ آپ کو خوش رکھے۔ عشق نمبر بہت شاندار رہا۔ مجھے بڑی شدت سے انتظار تھا اور شکر ہے کہ ڈائجسٹ بروقت مل گیا۔ اس ماہ بہت زیادہ مصروفیت ہے۔ ابھی شمارہ پڑھنا شروع کیا ہے مگر اپنا وعدہ نبھا رہی ہوں اور احوال میں حاضری کے لیے چند سطریں لکھ رہی ہوں۔ صرف چند ایک کہانیاں پڑھ سکی۔ ارم ناز کی ”Love 2016“ کیا خوب لکھا۔ اقبال بانو کی ”ایک تھی زینو“ بہت شاندار کہانی تھی۔ ممتاز احمد نے ”کم بخت عشق“ ایک شاہکار کہانی تخلیق کی۔ بہت پسند آئی۔ سید ملازم حسین شیرازی کی کہانی ”عشق کے کوہسار“ زبردست کہانی تھی۔ شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے تو اس وجہ سے مزید تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔

◆ اچھی فرزانہ! خوش رہو۔ بہت اچھا لگتا اگر پورا پرچہ پڑھ کر تبصرہ کرتیں۔ امید ہے اگلے ماہ مکمل تبصرہ موصول ہوگا۔

☆ تنزیلہ عرف تانی منڈی بہاؤالدین سے لکھتی ہیں۔ ”سچی کہانیاں کا عشق نمبر موصول ہوا۔ پرچہ بہت شاندار اور منفرد تھا۔ ماشاءاللہ معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ مقبولیت کی بلندیوں کو چھو رہا ہے لیکن اس بار موضوع کے اعتبار سے جدا پرچہ تھا۔ سب کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ خاص طور پر ایک تھی زینو، کم بخت عشق، رائٹ ٹریک، عشق یقین ہے، مٹھی بھر خوشیاں تھیں بس، عشق زندہ رہے گا اور Love 2016 شمارے کی بہترین کہانیاں تھیں۔ رائٹرز نے

سانحہ ارتحال

ہمارے لکھاری ساتھی شعبان کھوسہ کی والدہ گزشتہ ماہ اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں شعبان کھوسہ کے ساتھ ہے اور مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

خوب لکھا اور عشق کے حوالے سے عشق کے جذبے کو کہانیوں میں سمو دیا۔ ''بارگاہ عشق میں'' اور ''عشق کے کوہسار'' بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ آخر میں سچی کہانیاں کی دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔''

☆ پیاری تنزیلہ تانی! پرچہ اتنا اچھا لگا اور تبصرہ اتنا مختصر، خوش رہو۔

☆ گلفشاں کالونی، جھنگ روڈ فیصل آباد سے ہماری دور رس قاری غزالہ کرن احوال میں شامل ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''چار تاریخ کو سچی کہانیاں ملا تو دل سے آواز نکلی آ گیا وہ شاہکار جس کا تھا انتظار۔ واہ عشق نمبر کیا زبردست شمارہ ہے دل خوش ہو گیا۔ کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ اقبال بانو کی کہانی ''ایک تھی زینو'' بہت کمال کی کہانی تھی۔ دل میں اتر گئی۔ ممتاز احمد نے ''کم بخت عشق'' شاندار کہانی لکھی۔ خاور میاں نے شادی شدہ عورت سے عشق لڑا کر تا نگ کنوائی اور مورا کین بے چاری ناحق قتل ہو گئی۔ محمد بلال فیاض کی ''رائٹ ٹریک'' خوب رہی۔ ''دیمک زدہ محبت'' اچھا تاثر قائم نہ کر سکی۔ ''عشق یقین ہے'' کنول عمران خان کی بہترین اسٹوری تھی۔ ''مٹھی بھر خوشیاں تھیں بس''، نجم سحر ش اور حسینہ، عشق زندہ رہے گا، بے غیرت بہن کی، بارگاہ عشق میں اچھی کہانیاں تھیں۔ Love2016 ارم ناز نے آج کل کے ٹھنڈیا لوپر بہت بہترین کہانی ہلکہ تجزیہ لکھا۔ ''عشق کے کوہسار'' سید طارق حسین شیرازی کی ایک منفرد تحریر تھی۔ بہت اچھی لگی۔ ''ہائیڈ پارک'' میں صائمہ بشیر کی غزل بہت اچھی لگی۔ اچھا کاشی جی اب اجازت چاہوں گی۔''

☆ پیاری غزالہ! تبصرہ اچھا لگا، بس لڑکی اب تم اپنی آمد اسی طرح مستقل بنائے رکھنا۔

☆ اسلام آباد سے ہماری نٹ کھٹ عظمیٰ شکور احوال میں دبنگ انٹری دے رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''بس مجھے تو کسی سے بات ہی نہیں کرنی۔ تو اور کیا کس قدر خوشی تھی کہ رسالہ ملا احوال میں دیکھا تو کہیں میرا ذکر ہی نہیں۔ مطلب میں سب کو بھول گئی ہوں۔ ایک ایک خط میں نے غور غور سے پڑھا مگر...... اف...... مجھے نہیں پتا اور ایڈیٹر صاحب آپ زیادہ اترایا مت کریں یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔ سالوں بعد ایک اسٹوری لگاتے ہیں آپ وہ بھی دو پیج کی کہ عظمیٰ خوش ہو جائے گی (دیکھو لڑکی! ہم تو تمہیں یاد رکھتے ہیں نا......) کہاں یاد رہوں گی میں کسی کو...... رانا حبیب الرحمن بھائی آپ بہت اچھے ہو باقی مجھے کسی سے بھی بات نہیں کرنی بس......! ایڈیٹر جی ''ہیر رانجھا'' مزے کا لگا ''دیمک زدہ محبت'' ویسے اعجاز احمد قمر ال آپ نے کیا کیا۔ قسم سے وہ اتنی اچھی تھی کیوں کیا اس کے ساتھ ایسا۔ بہت ہی دل دکھ گیا میرا۔ مرد کتنے ظالم ہوتے ہیں، احساس سے عاری...... توبہ! ''مٹھی بھر خوشیاں تھیں بس'' ضرغام محمود عمدہ اسٹوری اینڈ کو مزید حسین بنا گئی۔ سچ ہے محبت قربانی کا ہی تو نام ہے، اچھا لگا پڑھ کر۔ شروع سے آخر تک اسٹوری پر گرفت زبردست رہی۔ واہ کمال سر جی۔ عبدالغفار عابد آپ تو چھا گئے ''یوں قرض چکایا ہے'' لکھ کر۔ میرے پاس وہ لفظ نہیں جو اس جذبے کو سراہتے ہوئے لکھ سکوں۔ جی یہی تو ہے محبت۔ دوسروں کے لیے جینا قسم سے۔ بہت اچھی لگی اسٹوری۔ آپ کی مزید تحریروں کا شدت سے انتظار رہے گا سر جی۔ ارم ناز کی تحریر ''Love2016'' حق ادا کر دیا محترمہ ایسا ہی ہو رہا قسم سے زبردست کمال کی لیلیٰ...... زمانے کی کیا عکاسی کی واہ۔ محترمہ اقبال بانو صاحبہ کی تحریر ''ایک تھی زینو'' سچی کہانیوں میں بہت منفرد اور الگ ہی رنگ میں نظر آئی۔ محبت کے سب رنگ بھر دیے آپ نے۔ لفظوں کی خوشبوں نے پورے رسالے کو لپیٹ میں لے رکھا تھا واہ زبردست اسٹوری۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم وہ

جذبات احساسات نہیں لکھ پاتے اسٹوری پڑھ کر جو کہ اس کے شایانِ شان ہوتے ہیں۔ آپ سب کی محنت کے لیے واقعی الفاظ کم پڑنے لگتے ہیں۔ یہ سب آپ کی محنتیں ہیں کہ ہم سب دور ہوتے ہوئے بھی ساتھ ہیں۔ چاہے ایک ماہ بعد ہی ملتے ہیں۔ ''ہائیڈ پارک'' میں نوشی گیلانی متاثر کر گئیں۔ کیا ملا محبت میں؟ شاید کچھ نہیں ملتا محبت سے سچ ہے۔ صائمہ عراج کا ''میں معروف رہوں'' بھی بہت مزے کا لگا۔ شعبان کھوسہ کا شعر تیر نیم کش میں اچھا لگا۔ تو پھر چپتی ہوں رب راکھا۔ خوش رہے آباد رہے شاد رہے ڈھیر ساری دعائیں آپ سب پڑھنے اور لکھنے والوں کے لیے۔ ایڈیٹر صاحب سو تھینکس سچی کہانیاں لائے آپ ہمارے لیے۔''

✿ پیاری عظمیٰ! اپنا بہت خیال رکھو۔ ہمیشہ کی طرح یہی دعا تمہارے لیے کہ ہمیشہ مسکراتی رہو۔ تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔

☆ اسلام آباد سے ہماری بہت پیاری آنٹی رئیسہ خالد کا مختصر نامہ ہمارے پاس ہے۔ لکھتی ہیں۔ ''بیٹے کاشی کراچی آکر تم سے ملاقات نہیں ہو سکی جس کا افسوس ہے۔ ہمیں رسالہ دیر سے ملتا ہے اس لیے خواہش کے باوجود احوال میں شریک نہیں ہو سکی۔ اکتوبر کا رسالہ تم نے بھیجا بہت بہت شکریہ۔ میری کہانی ''سچائی والا رستہ'' کو جن جن لوگوں نے پسند کیا۔ ان کا بہت بہت شکریہ۔ رسالہ دیر سے ملنے کے باوجود میں نے تقریباً سب کہانیاں پڑھ لیں۔ سبھی نے بہت اچھا لکھا لیکن چند کہانیاں مجھے بہت پسند آئیں جن میں یوں قرض چکایا ہے، بے غیرت کہیں کی، خلاف توقع، بارگاہِ عشق میں بہت پسند آئیں۔''

✿ پیاری آنٹی! آپ سے نہ ملنے کا مجھے بھی بہت افسوس ہے مگر کیا کریں یہی چیزیں خدا کی مرضی کو ثابت کرتی ہیں۔ بس آپ کی محبت ہمارے لیے سائبان ہے۔

☆ سکھر سے زمانوں بعد محمد راشد فرہاد کی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''امید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہوں گے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ میں آپ کے رسالے سچی کہانیاں میں اپنا کلام بھیجا کرتا تھا اور آپ میرا کلام شائع بھی کیا کرتے تھے لیکن کچھ عرصے سے میں مصروف بہت رہا، اپنی پہلی کتاب شاعری کے حوالے سے، جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں اور امید کرتا ہوں آپ کو میری کتاب پسند آئے گی۔ یہ میرا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ آپ کی رائے کا بھی انتظار رہے گا۔ اپنا خیال رکھیے گا۔''

✿ اچھے فرہاد! بھئی ایسی بھی کیا مصروفیت کہ آپ تو بھول ہی گئے کہ ہم بھی ہوتے ہیں۔ آپ کے آٹوگراف والی کتاب تو ہم بھی پڑھنا چاہتے تھے مگر ہم بھلا تمہیں کہاں یاد رہے بھائی۔

☆ فیصل ندیم بھٹی کا محبت نامہ ہمیں موصول ہوا ہے چک نمبر 58 شمالی سرگودھا سے۔ لکھتے ہیں۔ ''ماہ نومبر کا سچی کہانیاں عشق نمبر کا انتظار کرتے کرتے پانچ نومبر کو مل ہی گیا۔ واہ اس بار تو ٹائٹل میں خوب صورت ماڈل اور صبا قمر عشق نمبر کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ منزہ سہام کے اداریے میں شاہد لائلہ کی موت کی خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ احوال کے آغاز میں کاشی چوہان کا عشق نمبر میں عشق اور محبت کے بارے میں مختصر تبصرے نے گویا کوزے میں سمندر کو بند کر دیا ہے۔ کاشی بھیا بالکل محبت تو محبت ہے ناں۔ احوال میں نئے آنے والے احوالیوں کو خوش آمدید۔ جن میں عمران علی سنی، یوسف راجپوت، ام حبیبہ صادق آباد سے سید ملازم شیرازی، حسن نظامی، بشریٰ کنول، ممتاز احمد، حنا بشریٰ، مجید احمد جائی، صائمہ مجید کے تبصرے بہترین تھے، مسز نوید ہاشمی کو سلام۔ عبدالعزیز جی آ صاحب احوال میں واپسی پر جی آیاں نوں۔ رانا حبیب الرحمن انشاء اللہ آپ عنقریب ہم سب دوستوں میں ہوں گے۔ ارم خان صاحبہ! اللہ تعالیٰ آپ کو حافظ قرآن بنائے، آمین۔ سر یلہ تانی تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ پچھلے ماہ آپ کے شہر منڈی بہاؤالدین سے گزر کر گیا تھا۔ فرزانہ گل، نزاہت انشال، حسن نظامی، مقصود بلوچ، ثنا کنول، مسز نوید ہاشمی کو سلام اور دعا سدرہ

دنیا میں کس جگہ سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کو

زرِمبادلہ بچیے

اندرون ملک =/890 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرِسالانہ

کویت	55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز
یو اے ای	55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز
مصر	55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز
یونان	55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز
فرانس	55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز
برطانیہ	55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز
ناروے	55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز
امریکہ	65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز
افریقہ	65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے: 88-C II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

انور علی کہاں غائب ہو گئی ہیں؟ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب کی تاریخ کا اب دسمبر میں اعلان کر ہی دیں۔ احوال کے آخر میں کاشی بھائی نے ''ہیر رانجھا'' کی کہانی موجودہ حالات کی عکاسی کر رہی ہے۔ زبردست ویسے یہ ہے سچی بات جناب۔ اب آتے ہیں کہانیوں پر تبصرے کی طرف۔ ''لائف بوائے'' زبردست رہی۔ ویلڈن لائف بوائے شیمپو۔ ''ایک تھی زینو'' اقبال بانو۔ زینو کی مصطفیٰ سے محبت بے مثال تھی، محبت ہو تو زینو جیسی۔ ''کم بخت عشق'' ممتاز احمد، عشق کی کم بختی اور بربادی کی بہترین داستان ہے۔ دیمک زدہ محبت، عشق یقین ہے، مٹھی بھر خوشیاں تھیں بس، نجم سحرش اور حسینہ، عشق زندہ رہے گا۔ یادگار کہانیاں تھیں۔ ''زرد لومڑی'' زبردست چل رہا ہے۔ پنچھی کے ساتھ، بے غیرت کہیں کی، بارگاہ عشق میں، Love2016، عشق کے کوہسار، یہ کیسی محبت، خلاف توقع، عشق کی شاخ کا الو اچھی کہانیاں تھیں۔ کاشی چوہان کا ''زہر عشق'' پڑھ کر ہوش و حواس کھو جاتے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے زبردست ناول آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شوبز کے صفحے پر صبا قمر، دور حاضر کی باصلاحیت اور مشہور اداکارہ کی حالات زندگی، ان کی عادات سے آگاہی ہوئی۔ ''مسئلہ یہ ہے'' میں بابا جی کے فیض سے ہزاروں لوگوں کی حالات زندگی بدلتے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ بابا جی کی صحت اور عمر دراز عطا فرمائے، آمین۔''

٭ اچھے فیصل! سچ مانو، تمہاری پرچے سے محبت دیکھ کر تمہارے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، خوش رہو۔

٭ لاہور سے ہماری بہت پیاری آپی رضوانہ کوثر شامل احوال ہیں، لکھتی ہیں۔ ''اچھے کاشی! یقین کرو نومبر کا سچی کہانیاں جب آیا تو سرورق دیکھ کر ہی ''ماشاءاللہ'' منہ سے نکلا تھا اور پھر جب پرچے کا مطالعہ کیا تو بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئی کہ خدا تمہیں نظر بد سے بچائے۔ منزہ! سچی کہانیاں اپنے جوبن پر ہے۔ تم مبارک باد کی مستحق ہو۔ یقیناً تمہارے اعتماد اور محبت نے آج سچی کہانیاں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ پہلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ جیسا سنگ میل عبور ہونے جا رہا ہے۔ خوش رہو۔ خدا کرے کہ ترقیوں کا یہ سفر تا ابد جاری رہے۔ (آمین)۔ کہانیوں میں ٹاپ کلاس کہانیاں اقبال بانو کی ''ایک تھی زینو'' ممتاز احمد کی ''کم بخت عشق'' ایم حسن نظامی کی ''نجم سحرش اور حسینہ'' حنیف عاصم بلوچ کی ''عشق زندہ رہے گا'' ''اڈیسن کی'' ''بے غیرت کہیں کی'' حنا بشریٰ کی ''بارگاہ عشق میں'' اور ثمینہ طاہر بٹ کی ''عشق کی شاخ کا الو'' ٹھہریں جب کہ ارم ناز کی ''Love2016'' فیصل منظور کی ''یہ کیسی محبت'' عظمیٰ شکور کی ''خلاف توقع'' جمیل مجلو کی ''پنچھی کے ساتھ'' محمد بلال فیاض کی ''رانگ ٹریک'' بھی بہتر تھیں۔ جب کہ اعجاز احمد فکرال کی ''دیمک زدہ محبت'' اور سید ملازم حسین شیرازی کی ''عشق کے کوہسار'' بس سو سو تھیں۔ منزہ سہام کا اداریہ ''شاہ لاکلہ بہت یاد آؤ گی'' خوب تھا جب کہ احوال اپنی مثال آپ ہے۔ نظم ''ہیر رانجھا'' ایک شاہکار نظم تھی۔ جیتے رہو۔ ''زرد لومڑی'' زبردست انداز میں اختتام پذیر ہو رہی ہے تو ''زہر عشق'' میں بھی عشق نے ہلچل مچا رکھی ہے۔ محمود شام کا سفر نامہ بھارت ہمیں ۷۰ء کی دہائی میں لے جاتا ہے جب ہم بھی ان تمام حالات سے باخبر تھے۔ ''لائف بوائے'' میں اس اعوان کا احتجاج واقعی دیکھنے لائق ہے۔ اس بار بھی زبردست کہانی لائی ہیں آپ۔ ''ہائیڈ پارک'' اور ''تیر نیم کش'' زبردست رہے۔ اب میرا خیال ہے تبصرہ مکمل ہوا اور مجھے دیں اجازت، اپنا بہت خیال رکھیے گا۔''

٭ اچھی رضوانہ آپی! آپ کے اس تبصرے نے یقین مانیں، بہت شاد کیا۔ بس اسی طرح ہماری حوصلہ افزائی کے لیے آ جایا کریں۔ اپنی طبیعت کا بہت خیال رکھیے گا۔

٭ ہماری پیارے بھائی مجید احمد جائی، ملتان شریف سے لکھتے ہیں۔ ''پیارے ممتاز احمد کا ایکسیڈنٹ ہوا، دل رونے لگا، کتنے لمحوں خاموش گم صم سا رہا۔ یہ سطریں لکھتے ہوئے پیارے محترم عبدالعزیز جی صاحب کی کال آئی۔ مدتوں بعد لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی، اللہ کرے ممتاز احمد صاحب اور جہاں کہیں بھی اہل مسلم مشکلات، تکلیف میں ہیں، ان سے نجات

دے۔ (آمین)۔ ماہ نومبر 2016 کا سچی کہانیاں کزن کے ہاتھوں منگوایا۔ سرورق خوبصورت تھا اور عشق کی خوشبو دے رہا تھا۔ اداریہ خوب تر تھا اور احوال کی محفل میں کاشی بھائی سب احوالیوں کو اپنے اردگرد یوں بٹھائے ہوئے ہیں جیسے استاد کے گرد طالب علم ہوتے ہیں۔ ایک طویل غیر حاضری کے بعد عبدالعزیز جی آ کی آمد ہوئی۔ دل پور پور خوش ہو گیا۔ جن ساتھیوں نے مجھے یاد رکھا، میری کہانیوں کو پسند کرتے ہیں، مشکور و ممنون ہوں۔ ''ہیر رانجھا'' نظم خوب رہی۔ عشق نمبر کی کہانیوں کی بات کی جائے تو سپر ہٹ، کم بخت عشق، مزدو ہے گئی، ایک تھی زینو، رائٹ ٹریک، دیمک زدہ محبت، عشق یقین ہے، مٹھی بھر خوشیاں تھیں بس، عشق زندہ رہے گا، نجم، سحرش اور حسینہ، شمل کے ساتھ، عشق کے کوہسار، خلاف توقع عشق کی شاخ کا الو، بے غیرت کہیں کی کمال کی تحریریں تھیں۔''

پیارے مجید! خدا تمہیں مصروف رکھے ''سلطنت عشق'' کے لیے معذرت۔ انشاء اللہ ایوارڈ تقریب میں ہی تم سے ملاقات ہوگی۔

☆ ملتان سے ہماری پیاری بھابی صائمہ مجید لکھتی ہیں۔ '' آداب! ماہ نومبر کا سچی کہانیاں جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل اچھا اور دل کو لبھانے والا تھا۔ دل خوش ہو گیا۔ اداریہ منزہ سہام نے اچھا لکھا۔ احوال میں کاشی بھیا کی باتیں بہت متاثر کرتی ہیں۔ کاشی بھیا! سر تاج کا زیادہ اثر کیا ہونا ہے۔ چار دن کی زندگانی ہے، خوش رہیں اور خوش رہنے دیں۔ احوال کی محفل رنگ برنگے پھولوں سے سجی تھی اور کہانیوں کی نگری پھولوں کی مہکار میں مہک رہی تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ پھول قطار در قطار جھوم رہے تھے، لہرا رہے تھے۔ کس کہانی کو اوّل کہوں، کس کو دوئم؟ ایک سے ایک بڑھ کر تحریریں تھیں۔ عشق نمبر میں زہر عشق نے بھی خوب ڈرایا دھمکایا۔ سفرنامہ خوب جا رہا ہے، زرد لومڑی بھی ٹھیک جاسوسی میں لگی ہوئی ہے۔ عشق نمبر تو ریکارڈ بنا گیا اب کون سا نمبر شائع کرنے کا ارادہ ہے۔''

پیاری بہن! خوش رہو تمہارے تھوڑے سے محبت بھرے لفظوں نے بھی ہمیں خوش کر دیا۔ مجید سے کہو اتنا مصروف نہ رہے۔ اپنی صحت کا بھی خیال رکھے۔

اور پیارو! اس آخری خط کے ساتھ ہی ہمارے اس ماہ تک کے احوال کا اختتام ہوا۔ پُراسرار نمبر 3 کیسا لگا آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔ اجازت سے قبل تازہ ترین نظم آپ کی نذر......

راستے کھو گئے ہیں

زخم زخم بدن ہو گیا ہے
لہو رس رہا ہے
قاتل گولیوں میں چھپے ہیں
دریا پہاڑ جھرنے
سب رس رہے ہیں
زخموں کے سارے راستے
درد کے نشانوں میں
نیلے نیلے بادل بن کر اڑ رہے ہیں
زندگی......
اک بیوہ عورت کی طرح
اجڑی پڑی ہے
اس لال سہاگ سی زندگی کو
کوئی ہاتھ پکڑ کر
موت پار نہ کرا رہا ہے
کیا سفید پرچموں کے سب راستے
مقدس لبوں سے دعا ہو کر
کھو گئے ہیں؟؟

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

لائف بوائے ہر مہم میں ساتھ نبھائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

مجھے بچپن ہی سے ایڈونچر پسند رہا ہے۔ میرے ڈیڈی کوہ پیما تھے جبکہ ممی نے بھی ملکی سطح پر کئی کھیلوں میں سلور اور گولڈ میڈلز لے رکھے تھے۔ میرے لیے یہ سب باتیں خواب ناک تھیں۔ میں ہمیشہ خود کو ہواؤں میں اڑتا، پہاڑوں پر چڑھتا یا جنگل بیابانوں میں سفر کرتا محسوس کرتی تھی۔ ڈیڈی سے جب بھی اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے ہمیشہ ہی مجھے ٹال دیا۔

''ننھی پری! تم ابھی چھوٹی ہو۔ تمہیں معلوم ہے پہاڑوں اور جنگلوں میں موجود تتلیاں اور جگنو چھوٹی چھوٹی پریوں کے بال لے جاتے ہیں اپنی ملک کے پاس۔'' ڈیڈی مجھے ڈراتے۔

''مگر میری ننھی پری کے بال کوئی بھی نہیں لے کر جا سکتا۔'' ممی مجھے گود میں بٹھا کر میرے بال سہلاتے ہوئے کہتیں۔

''کیوں بھئی! تم کیسے یہ دعویٰ کرسکتی ہو۔'' ڈیڈی بضد ہو جاتے اور عینک کی اوٹ سے انہیں گھورتے۔

''کرسکتی ہوں۔'' ممی ڈیڈی کو گویا چیلنج دیتیں۔

''راز بتاؤ۔'' ڈیڈی اب بھی اپنی بات پر قائم ہوتے۔

''مائی چیلنج از مائی نیو لائف بوائے شیمپو!'' ممی ڈیڈی کو چڑاتے ہوئے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتیں۔

''ہم مم! اتنا بھروسہ ہے آپ کو اپنے لائف بوائے شیمپو پر۔''

''بالکل! بلکہ خود سے بھی زیادہ۔'' ممی مسکراتے ہوئے یقین سے کہتیں۔

''چلو پھر ہم اپنی ننھی پری کے 10th اسٹینڈرڈ تک جانے کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر آپ کے لائف بوائے شیمپو کو بھی آزما لیں گے۔''

''شیور! آئی ایکسیپٹ یور چیلنج، مسٹر ڈیڈی!'' ممی ڈیڈی کو چڑاتے ہوئے کہتیں۔ میں حیرت سے ان دونوں کی تکرار پر انہیں ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہوتی۔

خوشخبری

شاعری انٹر نیشنل انتخاب بہت جلد منظر عام پر آرہا ہے

داستان دل ڈائجسٹ کی ٹیم شاعری انٹر نیشنل انتخاب شائع کر رہی ہے جس میں سب شاعر شامل ہو سکتے ہیں اور جو شاعر نہیں وہ کسی بھی شاعر کی دو غزلیں انتخاب کر سکتے ہیں انشاء اللہ یہ کتاب بہت جلد مارکیٹ میں آرہی ہے شامل ہونے کے لیے آج ہی ہم سے رابطہ کریں

اہم نوٹ: اس بک کے لیے دو غزلیں یا نظم دے سکتے ہیں اور ایک ہزار فیس ہو گی ان پیسوں کی کتابیں سینڈ کی جائیں گی

مزید معلومات کے لیے رابطہ

03225494228
abbasnadeem283@gmail.com

سلسلہ انچارج

اردو نیلہ اقبال، سحرش علی نقوی، آمنہ رشید، ملائکہ خان، ندیم عباس ڈھکو، نزہت جبین ضیاء، نور بخاری، ریحانہ اعجاز، داستان دل ٹیم

اس انتخاب میں شامل لازمی ہوں انشاء اللہ یہ کتاب پاکستان کے علاوہ امریکہ، دوبئی، سعودی عرب کے علاوہ دیگر ممالک میں پڑھی جائے گی انشاء اللہ۔ اس میں ہر ممالک سے شامل ہو سکتے ہیں۔ اور شامل ہونا بھی آسان ہے آپ اپنی پسند کی دو غزلیں دے سکتے ہیں اور جو فیس دیں گئیں ان کی کتابیں مل جائیں گے ایسا چانس بار بار نہیں ملے گا اس لیے سب سے اپیل ہے کہ آپ سب شامل ہوں مزید معلومات کے لیے واٹس اپ 03225494228 یا فیس بک 03377017753 پر رابطہ کریں شکریہ

منجانب: داستان دل ڈائجسٹ ٹیم

☆......☆......☆

"ممی! پاپا مجھے کوہ پیما کیوں نہیں بنانا چاہتے۔" میں اُس وقت 3rd اسٹینڈرڈ میں تھی جب یہ سوال میرے منہ سے نکلا تھا۔

"تم سے بہت پیار جو کرتے ہیں۔"

"مطلب!" میں اُن کی بات کا مطلب نہیں سمجھی تھی۔ سو حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

"اِن کی کوہ پیمائی نے ان کے بالوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ تمہارے ڈیڈی کے بال بہت گھنے اور خوبصورت تھے مگر کوہ پیمائی کے شوق نے اُن سے اُن کے بال لے لیے۔" ممی میرے بالوں کو سہلاتی ہوئی بولی تھیں۔

"مگر ممی......" میں نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر ممی جیسے ٹرانس کی کیفیت میں تھیں۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولیں۔

"میری ننھی پری کوہ پیما بنے گی، ریس میں بھی حصہ لے گی، سیاحت بھی کرے گی، کیونکہ اس کے بالوں کی حفاظت کے لیے میرے پاس لائف بوائے شیمپو جو ہے۔ اس کے استعمال سے بال دکھیں 30 فیصد زیادہ گھنے، مضبوط اور صحت مند۔"

"ممی..... لائف بوائے میں ایسا کیا ہے جو یہ اتنے سارے کام اکیلا کر لیتا ہے۔"

"میری ننھی پری! لائف بوائے شیمپو کا نیا اسٹرانگ اینڈ تھک شیمپو روغن بادام (Almond Oil) ملک پروٹین (Milk Protein) کی طاقت لیے بالوں پر اپنا کام کرتا ہے۔ اور بال ہو جاتے ہیں اس کے استعمال سے اور بھی گھنے اور بھی مضبوط اور بھی سلکی۔"

وقت کا کام گزرنا ہے آج جب میں 10th اسٹینڈرڈ کے پیپرز کے بعد گھر آئی تو سیاحت کے شوق نے مجھے بچپن کی وہی ننھی پری بنا دیا تھا۔

میری وِش پوری ہونے جا رہی تھی۔ غیر متوقع طور پر ڈیڈی اور ممی نے مجھے اور رازی بھیا کو تایا ابا کے ہاں بھیج دیا۔ جہاں ہم دونوں بہن بھائی تین دن کے ہمالیہ فوریسٹ کی سیر والی مہم پر روانہ ہو رہے تھے۔ ممی نے میرا بیگ تیار کر دیا تھا۔ اور خاص تاکید کی تھی کہ بالوں کو کھلا نہ چھوڑوں اور جیسے ہی وقت ملے فوری طور پر نیو لائف بوائے شیمپو سے بال دھو کر انہیں فریش رکھوں۔ ممی نے رازی بھائی کو بھی لائف بوائے شیمپو کے استعمال کی تاکید کی تھی۔ شام کو ہم تایا ابا کے ہاں روانہ ہو گئے۔ جہاں ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

☆......☆......☆

جوگرز کے تسمے باندھ کر میں اٹھی اور دبے پاؤں کمرے سے نکلی۔ سب گہری نیند سو رہے تھے۔ برآمدے میں تائی جان تسبیح لیے کھڑی تھیں مجھے دیکھ کر حوصلہ افزا انداز میں مسکرائیں اور کچھ پڑھتے ہوئے پھونکا۔ رازی بھی آن پہنچا اور مسکراتے ہوئے میرے ساتھ کھڑا ہو گیا تائی جان نے آیت الکرسی کا حصار باندھا اور دونوں کی پیشانی چومی۔

"میری جان! بہت دیکھ بھال کر احتیاط سے جانا بہت ہی گھنا جنگل ہے، اُدھر سانپوں کی بہتات ہے اور پہاڑ بڑے ڈھلوان ہیں۔" کہتے ہوئے بڑی سی ٹارچ اور تھرموس پکڑا دیا۔

"لو بھی اس میں کافی ہے، تم لوگ تو پریوں کے دیس جا رہے ہو راستہ جتنا خطرناک ہے یادیں اتنی ہی حسین۔"

رازی نے ہنس کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

"چلو چلیں۔"

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں عجیب سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔

"تائی جانی میں نہیں جاتی۔"

''اوہو...... اب ایسے بھی ڈرنے کی کوئی بات نہیں' چلو جلدی کرو۔'' وہ پلٹ کر چلی گئیں۔
گیٹ سے نکلے تو تایا جان کھڑے تھے۔ انہوں نے رازی کو ایک خوب مضبوط واکنگ اسٹک پکڑا دی۔
''پستول تو رکھ لیا ہے نا؟'' انہوں نے رازی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔
''جی......'' رازی نے جینز کی پاکٹ تھپتھپائی۔
''فکر نہ کریں ہماری پری تو ویسے بھی بہادر ہے اور شیر دل رازی بھی ساتھ ہے۔'' رازی بھائی اکڑ کر بولے۔
تایا جان نے جھک کر میرے فق چہرے کو دیکھا اور ہنس دیے۔

☆......☆......☆

''بہادر لوگ ہی سر اُٹھا کر جی سکتے ہیں، اچھا میں تو مسجد جا رہا ہوں اذان ہونے والی ہے۔''
''میں نے بھی وضو کر لیا ہے تاکہ اس پُر خطر مہم میں اگر کوئی بات ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے پاس باوضو پہنچوں۔'' رازی کی آواز میں شوخی کا عنصر نمایاں تھا۔ لیکن میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
''تایا جان اُدھر جنگل میں بڑے خوفناک سانپ ہوتے ہیں۔'' میں نے بمشکل کہا۔
''رازی ساتھ ہے، فکر نہ کرو اللہ حافظ۔'' اور وہ مسجد کی سڑک پر چل دیے۔
''اور کیا! شیر دل رازی ساتھ ہو تو فکر کیسی؟'' کہتے ہوئے رازی نے مجھے کھینچا اور ہم سڑک چھوڑ کر کچے راستوں پر اتر گئے۔ اُس نے بائیں ہاتھ میں میری کلائی اور روشن ٹارچ تھا می ہوئی تھی اور داہنے ہاتھ میں واکنگ اسٹک' جس سے راستے کے جھاڑ جھنکار ہٹاتے ہوئے تیزی سے ایسے لمبے ڈگ بھر رہا تھا کہ مجھے بھاگنا پڑ رہا تھا، چند منٹوں میں ہم گھنے جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ رازی نے ٹارچ کی روشنی اور تیز کر دی۔ سامنے سے کچھ خرگوش بھاگ نکلے کچھ پرندے درختوں میں سے پھڑپھڑاتے ہوئے نکل کر اڑتے چلے گئے دفعتاً رازی نے ٹھٹک کر مجھے کھینچ لیا اور ہاتھ بڑھا کر اوپر کی طرف زبردست وار کیا۔ ٹہنیوں سے لٹکتے ہوئے دو لمبے سانپ شڑاپ سے اچھل کر دور جا گرے اور درختوں میں غائب ہو گئے مارے خوف کے میری سانس رک گئی۔
''چلو کوئی بات نہیں۔'' رازی نے مجھے منجمد پا کر حوصلہ دیا اب ہم تیزی سے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ اونچی نیچی گھاٹیاں' گھنے درخت اور گنجان جھاڑیاں کئی جگہ سانپوں کی پھنکار سنائی دی لیکن ہم بنا رُکے نہ جانے کتنا فاصلہ طے کرتے چلے گئے۔ پھر چڑھائیاں شروع ہوئیں تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے چڑھتے چلے گئے۔ دور سے اذان کی آواز آنے لگی پھر ایسے لگا کہ درخت اور جھاڑیاں چھٹ گئیں اور نسبتاً کھلی جگہ آ گئی' ہم سانس لینے کو رک گئے۔ رازی نے ٹارچ اطراف میں گھمائی' ہم ایک چھوٹے سے سطح مرتفع پر کھڑے تھے جو اونچے پہاڑوں اور گنجان درختوں سے گھرا ہوا تھا کچھ دیر بعد سانس اور حواس بحال ہوئے تو محسوس ہوا کہ فضا میں پرندوں کی چہکار گونج رہی ہے، سرد ہوا کے جھونکے پسینے میں شرابور وجود کو حیات بخش رہے تھے' ایک سمت آسمان پر صبح صادق کی دودھیا سفیدی ابھر رہی تھی۔ کچھ عجیب سحر انگیز ماحول تھا۔
''چلو نماز پڑھ لیں۔'' رازی نے آرام سے کہا اور دودھیا آسمان کی طرف پشت کر کے کھڑے ہو گیا اور نیت باندھنے لگا۔ میں نے وضو کیا ہوا تھا۔ جلدی سے دوپٹہ لپیٹا اور پیچھے کھڑی ہو گئی' پاکیزہ لطیف ہوا کے جھونکوں سے روح سرشار ہو رہی تھی۔ اور دوران نماز اللہ تعالیٰ کی قربت کا احساس اس قدر بھرپور

محسوس ہو رہا تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ سلام پھیر کر میں نے سر جھکا لیا' دست فطرت نے جیسے میرے دل پر ہاتھ رکھ دیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔

''پری! آنکھیں کھولو' دیکھو تو چڑیاں اور رنگین پرندے کس طرح اڑ رہے ہیں ذرا دیکھنا سورج کس شان سے طلوع ہو رہا ہے۔ تم ساری دنیا کو بھول جاؤ' بس یہ یاد رکھو کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور جس کے ساتھ اللہ ہو اسے کسی کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔''

اب میں نے دیکھا ہم پہاڑوں سے گھرے ہوئے کنویں نما گہری گھاٹی کے اندر ایک چوڑی چٹان پر بیٹھے تھے جس کے نیچے اتھاہ اندھیرا اور گہرائی تھی۔

''اُف کتنی خوفناک جگہ ہے۔'' مجھے جھرجھری آگئی۔

''خوفناک؟ یہ چٹان بہت محفوظ ہے۔ بھئی ذرا سر اُٹھا کر قدرت کے حسن کو تو دیکھو۔''

''اوہ' میرے خدا......'' میں مبہوت ہوگئی پہاڑوں کے کنارے سے نورانی کرنیں اُجالا بکھیرتی اُتر رہی تھیں۔ ہمارے اطراف سبزہ پوش پہاڑوں کا تنگ گھیراؤ جس کے وسط میں اَن گنت چھوٹی چھوٹی آبشاریں گر رہی تھیں' ہر طرف لمبی گھاس میں سے پیارے اچھوتے پھول سر ابھارے جھوم رہے تھے۔ کہیں کہیں کاسنی اور نیلی مارننگ گلوری کی بیلیں لہرا رہی تھیں۔ پھولوں کی مست خوشبو اور پرندوں کے نغمات نے عجب سماں باندھ دیا تھا۔ میں مسحور ہوگئی۔

''اب دیکھو۔'' رازی نے چپکے سے کہا اور گہرائیوں میں نیچے کی جانب پستول سے ایک فائر کیا۔

''تڑ......تڑ......تڑ...... اطراف کے پہاڑوں سے ٹکرا کر دھماکوں کی طرح اس کی گونج سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اچانک جیسے جگنوؤں کے مرغولے قریب آتے گئے' ہمارے ارد گرد آگے پیچھے دائیں بائیں ہم اُن میں گھر گئے۔

''اُف میرے خدا......'' مارے حیرت کے میری سانس رک گئی۔

''یہ تو تتلیاں ہیں سینکڑوں ہزاروں۔'' بمشکل میرے لبوں سے نکلا وہ ہمارے آس پاس اڑتی ہوئی پوری فضا میں چھا گئیں۔ سورج کی کرنوں میں ان کے چمکدار پر رنگین ستاروں کی طرح چمچما رہے تھے۔ حیرانی اور خوشی نے مجھے بے خود کر دیا میں ہنس رہی تھی۔ کھلکھلا رہی تھی۔

''رازی' رازی کتنا حسین ہے یہ سب کچھ اتنا پیارا' اتنا انوکھا بالکل خوابوں جیسا۔''

''ہاں خوابوں جیسا' لیکن ہے تو حقیقت اس طرح خواب حقیقتوں میں ڈھلتے ہیں۔''

وہ میرے ہنستے چہرے کو دیکھ کر طمانیت سے مسکراتے رہے تتلیاں اڑتی رہیں بکھرتی رہیں' بالآخر ہماری نظروں کی حدود سے نکل گئیں۔

''یہ دراصل ایسی غار نما گھاٹی ہے جس سے نیم تاریک گہرائیوں میں پھولوں کی گود میں ہزاروں لاروے پیدا ہوتے ہیں اور نشوونما پا کر تتلیوں کا روپ دھار لیتے ہیں یہاں میٹھی خوشبو والے پھولوں کی افزائش ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ جگہ تتلیوں کا مسکن بنی رہتی ہے رات بھر یہ چٹانوں سے چمٹی رہتی ہیں' اگر سورج نکلتے وقت دھماکے جیسی آواز پیدا کی جائے تو اس کی گونج سے گھبرا کر تڑپ کر اڑتی ہوئی نکلتی ہیں اور یہ انوکھا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے یہاں آس پاس بکثرت سانپ پائے جاتے ہیں اس لیے یہ عام لوگوں کی گزرگاہ نہیں' اس گھاٹی کو تایا جان نے دریافت کیا۔ اور تتلیوں کی بہار دیکھنے کا طریقہ بھی اُن ہی کی ایجاد ہے' میں جب بھی ادھر آتا ہوں یہ نظارہ دیکھے بغیر نہیں جاتا۔ کیوں کیسا لگا؟'' رازی

نے کہا۔

''اچھا اسی لیے تم اپنا گھر چھوڑ کر تایا جان کے گھر بار بار جانے کی ضد کرتے ہو۔'' میں نے چہک کر کہا۔

''بالکل، لعل سسٹر! یہی وجہ ہے۔ ڈیڈی کی کوہ پیمائی میرے خون میں شامل ہے۔''

''خدا میرے بھائی کو سلامت رکھے۔'' میں نے کہا اور کیپ کو مضبوطی سے سر پر جما لیا۔

''یہ رنگ برنگے پھول' یہ سبزہ زار' یہ آبشاریں اور تتلیوں کی بہار' کیسا انوکھا منظر تھا رازی! یہ جگہ واقعی پریوں کا دیس ہے، ہائے دنیا کتنی خوبصورت ہے۔'' میں نے کھوئی کھوئی نظروں سے ماحول کو دیکھا۔

''پری! یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا بے حد حسین بنائی ہے ہر ہر قدم پر فطرت کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی نعمتیں اور خوشیاں ہر گام پر نیم پوشیدہ ہیں۔ بات صرف سمجھنے اور قدر کرنے کی ہے یہی وجہ ہے کہ ہزار آزمائشوں کے باوجود انسان دنیا چھوڑنا نہیں چاہتا۔''

میں اس کی شکل دیکھنے لگی۔ ان کے لہجے کی نرماہٹ اور آنکھوں کی شفقت میرے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔

''پری! کسی کی زندگی محض پھولوں کی سیج نہیں ہوتی۔ ہر ایک کو اپنے نصیب سے پھول بھی ملتے ہیں اور کانٹے بھی۔ بس ہمیں حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے' کانٹے ہٹا کر راہِ حیات کو گلزار بنانے کی سعی میں لگے رہنا چاہیے' یہ بھی تو دیکھو فطرت کے حسن سے ہمیں کس قدر راحت ملتی ہے۔ محنت کر کے تھک جائیں۔ جدوجہد میں ناکام ہو جائیں یا آزمائشوں سے گھبرا جائیں' تو فطرت کے حسن میں مامتا جیسی راحت ملتی ہے۔''

میری آنکھیں رازی پر تھیں اور ذہن سوچ میں مگر رازی کا ایک ایک لفظ قطرۂ شبنم کی طرح میرے دل پر گر رہا تھا۔

☆......☆......☆

تین دن کی اس خطرناک ایڈونچر سے بھرپور مہم جوئی کے بعد ہم دونوں بہن بھائی گھر آ پہنچے تھے۔

''میری ننھی پری!'' ڈیڈی نے مجھے اور بھیا کو گلے سے لگا لیا۔

''یقین جانو تم دونوں کی غیر موجودگی میں گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ آج تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم لوگوں میں ایک سیلانی روح پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔'' ممی ہماری نظر اتارتے ہوئے بولیں۔

''ممی! یہ دیکھیے آپ کے لائف بوائے کا کمال۔'' میں نے اپنا ہیٹ اتارا اور اس کے ساتھ ہی میری لائف' میرے بال چمکتے ہوئے لہرانے لگے۔

''اِٹس مائی چیلنج، مسٹر ڈیڈی۔'' ممی نے مجھے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے ...... میرا بھروسہ' میرا چیلنج، میرا اعتماد' میرا لائف بوائے شیمپو کا کمال، ہر سفر میں، بالوں کا محافظ' ہر مہم میں اپنے ملک پروٹین اور Almond Oil والے اجزاء کے ساتھ بالوں کی خوبصورتی اور نشوونما میں اضافہ کرتا ہے۔''

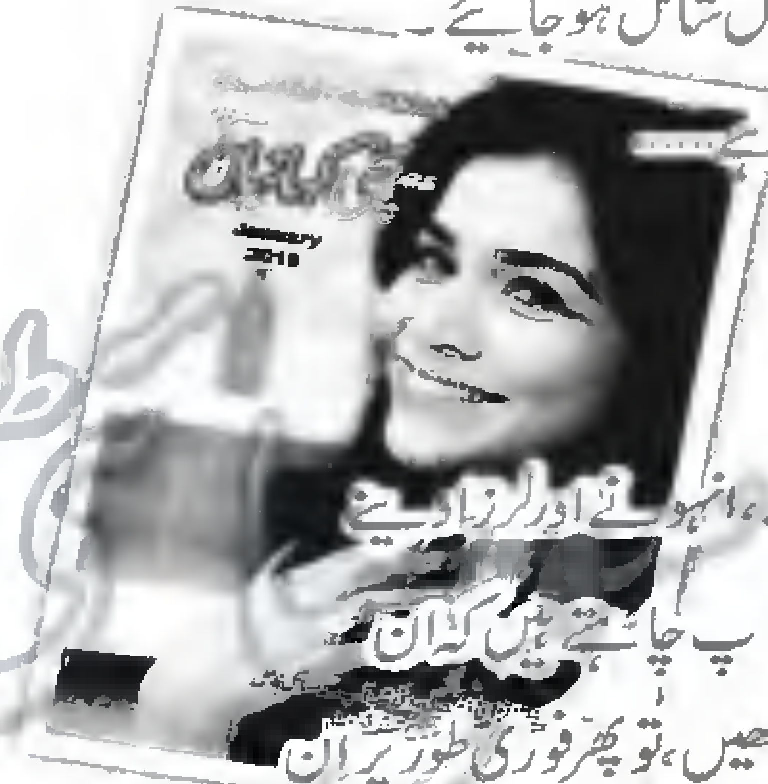
''سچ ہے لائف بوائے شیمپو ہم سب کے بالوں کا محافظ ہے۔'' رازی بھیا نے ہیٹ اتارا تو ان کے بال بھی شائن کر رہے تھے۔

''کاش میں نے بھی لائف بوائے شیمپو استعمال کیا ہوتا......'' ڈیڈی نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو ممی نے اُن کی بات کاٹ دی۔

''تو پریاں کبھی آپ کے بال نہ لے کر جاتیں۔'' ممی کے اس جملے پر سب ہنسنے لگے تھے۔

☆☆......☆☆

آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں!!



آیئے! سچی کہانیاں کے قلم قبیلے میں شامل ہو جایئے۔

یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے......

خود کو منوایئے، اپنے قلم سے......

اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کو اپنے آس پاس ہوئے، انہونے اور لرزا دینے

والے واقعات یاد رہتے ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ ان

واقعات سے دوسرے بھی سبق سیکھیں، تو پھر فوری طور پر ان

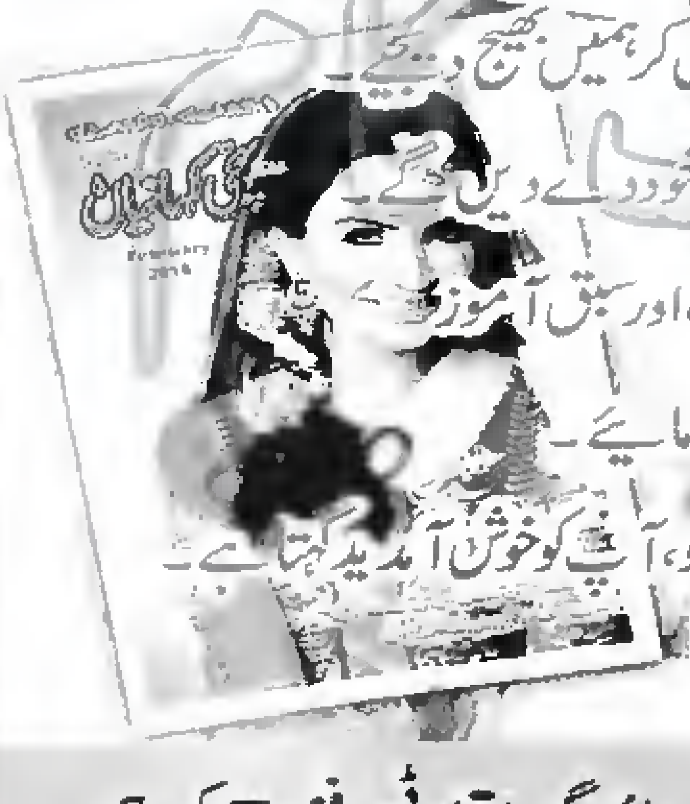
واقعات و حادثات کو صفحہ قرطاس پر ڈھال کر ہمیں بھیج دیجیے۔

نوک پلک سنوار کر اُسے کہانی کی شکل ہم خود دے دیں گے۔

تو پھر قلم اٹھایئے اور کسی بھی عبرت ناک، اور سبق آموز

سچ کو کہانی میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمایئے۔

ماہنامہ سچی کہانیاں آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔



تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:

88-C II۔خیابانِ جامی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔فیز-7، کراچی

ای میل pearlpublications@hotmail.com



خواب، گلاب اور خوشبو...... ڈیانا



احمد سجاد بابر

مٹی کے بدن میں سونے کا دل لیے دنیا کے اسٹیج پر لافانی کردار ادا کرنے والی شہزادی کی اسرار بھری داستان حیات

اس کے پاس سب کچھ تھا جو فتح کر لینے کے لیے کافی تھا، سحر انگیز شخصیت، طلسماتی شہرت، غزال آنکھیں، سرو قامت، شہابی رنگت۔۔۔ شاہی خاندان سے جڑا فسوں۔۔۔ دنیا اس کی دیوانی تھی، اس کی ایک ایک مصروفیت پر نظر رکھی جاتی تھی، میڈیا اس کی ایک جھلک پانے کے لیے بے تاب نظر آتا تھا، وہ چھا جانے کے لیے ہی پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی جھولی میں محرومیاں بھی تھیں، گمشدہ بچپن تھا، کھوکھلے رشتے تھے اور مصنوعی چکا چوند تھی، کسے معلوم تھا کہ یکم جولائی 1961 میں سینڈر نگھم میں نواب گھرانے میں جان سپنسر کے گھر جنم لینے والی بچی شہرت دوام پائے گی، اس کا خاندان بیٹے کی خواہش میں تھا، اس وجہ سے ایک ہفتے تک بچی کا نام ہی تجویز نا کیا جا سکا، آخر کار بچی کے لیے ''ڈیانا فرانس'' کا نام منتخب کیا گیا۔ ننھی ڈیانا نے



پیار کے لئے ترستے ہوئے عمر گزاری۔اس کی عمر سات سال تھی جب اس کے والدین میں طلاق ہو گئی، وہ اس دوران میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی رہی ،اس کے والد نے عدالت کے ذریعے اس کو ساتھ رکھنے کے حقوق حاصل کر لئے ،اس طرح وہ اپنے والد کے پاس آ گئی، اس کی والدہ نے 1969 میں دوسری شادی کر لی ،اس کے والد نے بھی اپنے لئے نیا جیون ساتھی منتخب کر لیا،اس طرح ڈیانا بچپنے سے ہی ایک خلا لئے ہوئے پلی بڑھی،نو سال کی عمر میں ہی ڈیانا کو ہاسٹل میں رہنا پڑا،وہ پڑھائی میں کمزور تھی،وہ دو بار او لیول میں فیل ہوئی، وہ بنیادی طور پر ایک شرمیلی لڑکی تھی ،اسے موسیقی سے دلچسپی تھی اور پیانو بجانے میں مہارت رکھتی تھی ،اس کے علاوہ وہ تیراکی پر بھی عبور حاصل تھا ،اس نے کھانا پکانے کا کورس بھی کیا ،کم آمدنی والی نوکریاں بھی کیں ، ڈانس انسٹرکٹر کے طور پر بھی کام کیا ،مختلف تقریبات کے لئے میزبان کی نوکری بھی کی ،سکول ٹیچر کے طور پر بھی کام کیا ،اپنی اٹھارویں سالگرہ پر اس کی والدہ نے اسے ایک فلیٹ تحفے میں دیا۔اس طرح وہ زندگی کے نئے موڑ پر پہنچ گئی جہاں ایک دنیا بازو کھولے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

سپینسر فیملی کے شاہی خاندان سے بہت قریبی روابط تھے۔ڈیانا کی پرنس آف ویلز ”چارلس“ کے ساتھ پہلی ملاقات نومبر 1977 میں ہوئی،شہزادہ چارلس ڈیانا پر مرمٹا ،وہ اسے اپنی بیوی کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔نومبر 1980 میں شاہی خاندان سے اس کی ملاقات کرائی گئی جہاں اسے بہت پسند کیا گیا ،شہزادہ چارلس نے اسے 6 فروری 1981 کو شادی کی پیشکش کی جو ڈیانا نے قبول کر لی ،اسے بارہ کیرٹ نیلم اور چودہ ہیروں والی انگوٹھی تحفے میں دی گئی جو پوری دنیا میں کاپی کی گئی ،منگنی کے بعد اس نے نوکری چھوڑ دی اور شاہی محل میں منتقل ہو گئی۔29 جولائی 1981 کو بیس سال کی عمر میں برطانوی عہد شہزادہ چارلس سے شادی کے بعد وہ دنیا بھر کی خبروں کا مرکز بن گئی۔یہ شادی جو اس وقت تک صدی کی سب سے بڑی تقریب تھی ٹیلی ویژن پر براہ راست دکھائی گئی، چھ لاکھ لوگ سڑکوں پر شاہی جوڑے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ اس کے بعد سے شہزادہ چارلس اور لیڈی ڈیانا مسلسل اخبار نویسوں اور ٹی وی رپورٹروں کی زد میں رہے ۔شہزادہ چارلس سے ڈیانا کے دو بیٹے ہوئے ،شہزادہ ولیم اور شہزادہ ہنری۔

بہت کچھ لینے اور بہت کچھ دینے کے باوجود، دنیا بھر کی دولت، عزت اور ناموری قدموں میں ڈھیر ہونے کے باوجود، ہر طرح کی آسائشات زندگی میسر ہونے کے باوجود، حسن و جمال کے بے پناہ خزینے کی مالک ہونے کے باوجود، ڈیانا ایک بدنصیب عورت تھی۔ایک ایسی بدنصیب عورت جو ساری عمر حقیقی پیار کی تلاش میں بھٹکتی رہی۔شادی کے وقت ڈیانا کی عمر 20 سال اور شہزادہ چارلس کی عمر 40 سال کے لگ بھگ تھی۔ عمروں کا یہ فرق ان کی سوچ میں بھی ظاہر ہوا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد تک تو انہوں نے اپنے اختلافات کو کامیابی سے چھپائے رکھا لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ اختلافات نمایاں ہونے لگے اور پھر ایک دن وہ بھی آیا جب 1992 میں ان کے درمیان علیحدگی ہوئی اور بعد ازاں اگست 1996 میں طلاق ہو گئی۔ان علیحدگی اور طلاق کی مختلف وجوہات بیان کی گئی لیکن ان میں سب سے نمایاں وجہ یہ تھی کہ شہزادہ چارلس اپنی ہم عمر ایک خاتون ”کمیلا پارکر“ کے عشق میں بری طرح جکڑا تھا۔ ساری دنیا کو اس بات کی خبر ہو گئی اور شہزادہ چارلس نے بھی ڈیانا کی طرف اپنی بے اعتنائی کو چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی۔نتیجہ یہ نکلا کہ حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ شہزادی ڈیانا نے مختلف فلاحی سرگرمیوں میں مصروف رہ کر ان معاملات سے اپنی توجہ ہٹانا چاہی لیکن بالآخر دونوں کے درمیان طلاق ہو کر رہی۔ شہزادہ چارلس کی خود غرضانہ داستان کا آغاز 1971ء میں ہوتا ہے جب کامیلا نامی ایک خوبصورت لڑکی سے ان کی ملاقات ہوئی اور اس کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ان کا معاشقہ تقریباً ڈیڑھ سال چلا۔دلچسپ بات یہ کہ کامیلا اسی دوران ایک اور جوان ”اینڈریو پارکر“ سے بھی عشق لڑا رہی تھی۔ جب ملکہ الزبتھ نے

کامیلا کو بطور بہو قبول کرنے سے انکار کیا تو اس نے اینڈریو سے شادی کرلی تاہم شہزادہ چارلس اور کامیلا ملتے جلتے رہے۔1981ء میں شہزادے نے حسین وجمیل شہزادی ڈیانا سے شادی کرلی تاہم شادی کے بعد بھی شہزادے نے کامیلا سے ملنا جلنا جاری رکھا۔شہزادی ڈیانا اپنی دلچسپیوں میں مگن رہنے والی لڑکی تھی اور وہ سنجیدہ مزاج شہزادے سے ذہنی مطابقت نہ کرسکی۔ چنانچہ شہزادہ



چارلس اپنی محبوبہ کی سمت جھکتا چلا گیا۔ 1992ء میں آخر کار انکشاف ہوا کہ شہزادہ چارلس اور کامیلا نے شادی شدہ اور بال بچے ہونے کے باوجود ناجائز تعلقات استوار کررکھے ہیں۔ اس انکشاف نے برطانیہ بھر میں شہزادے اور کامیلا کو بدنام کردیا۔ شہزادے کو ”دھوکے باز شوہر“ اور ”برے باپ“ کے القابات سے یاد کیا جانے لگا اور دسمبر 1992ء میں شہزادی ڈیانا کے شاہی محل کو خیر باد کہنے کی وجہ بھی یہی معاشقہ بنا۔ بیگم کے ساتھ بے وفائی نے نہ صرف شہزادہ چارلس کی نیک نامی کو نقصان پہنچایا بلکہ برطانوی شاہی خاندان بھی متاثر ہوا۔ برطانیہ میں عام لوگ سوال کرنے لگے کہ ان کا پیسہ آوارہ

مزاج اور بگڑے شہزادوں کے الّلے تللّوں پر کیوں خرچ ہوتا ہے!!

☆......☆......☆

ویلز کی شہزادی ہونے کا اعزاز پا کر وہ زیادہ خوش نہیں تھی۔ اس بات کا اظہار اس نے 1983 میں سب کے سامنے کر دیا کہ میں خود کو فلاحی کاموں کے لیے وقف کرنا چاہتی ہوں۔ ہسپتالوں، یتیم خانوں، بوڑھوں کے مراکز اور غریب خواتین کے لیے قائم مراکز میں جا کر ان کے ساتھ وقت گزارنا لیڈی کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اس کی ذاتی زندگی میں کیا اور کتنا برا تھا اس سے قطع نظر ہو کر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس ایک خاتون کی وجہ سے کتنے پریشان حال لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹیں آئیں۔ 1989 میں بچوں کے لیے "گریٹ آرمونڈ ہسپتال فار چلڈرن" کے نام سے ادارہ قائم کیا اور اس ہسپتال میں خیرات کی رقم سے مستحق بچوں کا علاج شروع کیا۔ اس ہسپتال کے قیام کے بعد ڈیانا نے دنیا بھر کے دورے کیے۔ غریب اور لاوارث بچوں پر اس نے خصوصی توجہ مرکوز کی اور اپنی ذاتی خیرات سے اس فلاحی کام میں حصہ ڈالا۔ پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، صومالیہ، مشرق وسطی، سوڈان اور دیگر کئی ممالک میں رنگ و نسل، مذہب و ملت کا فرق کیے بغیر اس نے مدد کی۔ ڈیانا نے اپنے ساتھ دنیا کے کئی خیراتی اداروں اور مخیر حضرات کو شامل کیا۔ پاکستان میں عمران خان کے شوکت خانم کینسر ہسپتال کی چندہ مہم میں بھی ڈیانا نے بھرپور کردار ادا کیا۔ پاکستان سمیت مشرق وسطی اور افریقہ کے متعدد مسلمان ممالک نے ڈیانا سے فائدہ اٹھایا، ڈیانا نے اپنی فلاحی سرگرمیوں کا بیشتر حصہ مسلمانوں کو دیا۔ وہ جہاں جاتی مسلم خواتین اور بچوں کو گلے لگاتی، مسلمانوں کے غریب، کالے اور بظاہر گندے لباس والے بچوں کو اٹھاتی، انہیں اپنی گود میں جگہ دیتی اور مسلمانوں کے بچوں کو ایسے چومتی جیسے وہ اپنے ولیم اور ہیری کو چومتی تھی۔ تاریخ کے البم میں ایک ایسی تصویر بھی موجود ہے جب ایک پاکستانی بچے کو کالے ماتھے کو چومتے ہوئے ڈیانا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ڈیانا نے دنیا سے بارودی سرنگوں کے خاتمے کے لیے بھی مہم چلائی۔

بلاشبہ مٹی کے بدن میں سونے کا دل لیے، دنیا کے سٹیج پر ڈیانا ایک لافانی کردار تھی۔

☆......☆......☆

پھر شہزادی کی زندگی میں دوبارہ سے بہار اترنے لگی، اس کے دل میں پیار کی چنگاری پھوٹی جو جلد ہی الاؤ بن گئی جو اندر ہی اندر ڈیانا کو جلائے جا رہا تھا، ڈیانا لاہور سے تعلق رکھنے والے پاکستانی ہارٹ سرجن حسنات خان سے دیوانہ وار محبت کرتی تھیں، ڈاکٹر حسنات معروف دانشور اشفاق احمد کے بھانجے تھے، وہ اس کے پیار میں پاگل تھیں، اس کی خاطر وہ برطانیہ چھوڑنے اور پاکستان میں قیام پر غور کر رہی تھیں۔ ڈیانا کا اصرار تھا کہ حسنات اس سے خفیہ شادی کرے اور وہ حسنات سے بیٹی کی خواہش مند تھیں لیکن حسنات نے خفیہ شادی سے انکار کر دیا تھا۔ پاکستان کے دو بار دورے میں ڈیانا نے حسنات کے خاندان سے خفیہ ملاقاتیں کیں، وہ شادی کیلئے ان کی والدہ کو راضی کرنا چاہتی تھیں، مگر حسنات کی والدہ اس پر رضا مند نہیں تھیں۔ عمران خان کی سابق اہلیہ جمائما کہتی ہے کہ حسنات کی والدہ اس بات پر رضا مند نہیں تھی کہ ان کا بیٹا ایک انگریز خاتون سے شادی کرے، کسی انگریز لڑکی سے شادی ہر قدامت پسند پشتون ماں کے لئے ایک برے خواب جیسی ہوتی ہے۔ آپ تعلیم کے لئے بیٹے کو برطانیہ بھیجیں اور اس کی واپسی انگریز دلہن کے ساتھ ہو یہ ایک خوفناک بات ہے، جمائما خان نے بتایا کہ

''ڈیانا حسنات خان سے دیوانہ وار پیار کرتی تھیں اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں، اس کیلئے وہ پاکستان میں بھی رہنے کو تیار تھیں، شہزادی ڈیانا نے عمران خان کے اسپتال کے فنڈ ریزنگ کیلئے دو بار پاکستان کا دورہ کیا اور دونوں مرتبہ ہی وہ حسنات سے شادی پر بات چیت کیلئے ان کی فیملی سے خفیہ طور پر ملنے گئیں، ایک بار دورہ پاکستان میں ڈیانا نے عمران خان کی بہنوں علیمہ اور رانی کے ساتھ وقت گزارا اور میڈیا کی نظروں سے بچنے کیلئے انہوں نے ماڈل ٹاؤن تک ان کے گھر جانے کے لئے خود گاڑی چلانے کا فیصلہ کیا، ڈیانا ان کے گھر کا پتہ زبانی

جاتی تھی، ٹریفک جام کی وجہ سے ان کی گاڑی پھنس گئی جیسے ہی لوگوں نے ڈیانا کو پہچانا، انہوں نے کار کی طرف اشارے کیے اور ہاتھ لہرائے، جس پر ڈیانا پریشان ہوگئی، تاہم حواس برقرار رکھتے ہوئے گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے مسکراتی رہی اور ہاتھ لہرا کر جواب دیا۔ تعلقات کی قربت میں شدت کے ساتھ ہی ڈیانا اور حسنات نے شادی اور بچوں کے متعلق بھی تبادلہ خیال کیا۔"

ڈیانا کی ایک اور قریبی دوست ایلیسن کا کہنا ہے کہ ڈیانا نے اپنی دونوں دوستوں کو بتایا تھا کہ وہ حسنات



سے ایک بیٹی چاہتی ہے۔ وہ حسنات سے خفیہ شادی چاہتی تھی لیکن حسنات اس منصوبے سے خوف زدہ تھے۔ ڈاکٹر حسنات سمجھتے تھے کہ شہزادی ڈیانا کیساتھ شادی کے بعد پریس ان کو برطانیہ میں چین سے نہیں رہنے دے گا اور اگر دونوں کی اولاد ہوئی تو وہ بچوں کو لے

کر کہیں نہیں نکل سکیں گے۔ ان کے پاس ایک راستہ یہ تھا کہ وہ پاکستان میں جا کر بسیں کیونکہ پاکستان میں



پریس لوگوں کو زیادہ تنگ نہیں کرتا۔ شہزادی ڈیانا پاکستان گئیں اور عمران خان کی برطانوی بیوی جمائما خان سے مشورہ کیا جس کے بعد انہوں نے یہ تاثر لیا کہ شہزادی کے لیے پاکستان میں رہنا ممکن نہیں ہے۔ شہزادی ڈیانا درحقیقت پاکستانی ڈاکٹر کے عشق میں مبتلا تھیں۔ ڈیانا نے اپنی دوست کو بتایا تھا کہ ہر کوئی مجھے فروخت کرتا ہے لیکن حسنات ایسا شخص ہے جو مجھے کبھی فروخت



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



نہیں کرے گا۔

''ڈیانا سے میری پہلی ملاقات 1995 میں ہوئی تھی''۔

ڈاکٹر حسنات کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

''میں اس وقت رائیل برمٹن اسپتال میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا اور میرا مضمون دل کے امراض تھے۔ یعنی میں دل کا ڈاکٹر تھا۔ اس وقت میری عمر 36 سال تھی۔ یہاں ڈیانا اکثر آتی تھی اور یہاں سے ہماری ملاقاتیں شروع ہوئیں جو بعد میں تعلق داری میں بدل گئیں''

حسنات کھوئی کھوئی آواز میں یادوں کے البم کے صفحات پلٹ رہا تھا۔

''ڈیانا نے مجھے کوڈ نام آرمانی دے رکھا تھا اور خفیہ رابطوں کے لئے یہی نام استعمال ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ شاہی خاندان کی بہو تھی اور یہ سب کچھ خفیہ ہی رکھنا تھا۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ 2006 میں، میں نے پاکستان میں ہی ایک اور شادی کی تھی مگر وہ بھی ناکام رہی اور ختم ہو چکی ہے۔ یہ مکمل طور پر ارینج شادی تھی اور رشتہ داروں میں ہی ہوئی تھی۔''

ڈاکٹر حسنات خلا میں تکتے ہوئے بہت دور پہنچا ہوا تھا۔

''میرا اور لیڈی ڈیانا کا تعلق دو سال تک رہا آپ اسے رومانس کہہ سکتے ہیں۔ اس دوران مجھے یہ پتہ چلا کہ ڈیانا کی شدید خواہش تھی کہ اس کی ایک بیٹی ہوتی، اس کے دو بیٹے تھے مگر وہ بار بار کہتی تھی کہ اس کو بیٹی کی ضرورت یا خواہش ہے۔ شاید وہ مجھے یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ شادی کے بعد ہم اللہ سے دعا کریں گے کہ ہمیں ایک بیٹی عطا کردے۔''

ڈاکٹر حسنات نے ذرا تھمتے ہوئے دوبارہ بات شروع کی

''بہر حال میں یہ بتا رہا تھا کہ میری اور ڈیانا کی پہلی ملاقات کیسے ہوئی۔ اس ملاقات میں، میں نے ڈیانا کو اپنے گھر مدعو کیا، یہ ایک رسمی سی دعوت تھی مگر ڈیانا نے اسے فوری طور پر قبول کرلیا۔ میرا گھر ایسٹ لندن میں سٹریٹ فورڈ میں تھا۔ بس اس ملاقات کے بعد ہماری دوستی گہری ہوگئی اور پھر ہم کھانا کھانے باہر ایک ساتھ جانے لگے اور اس سے ہماری دوستی محبت میں بدل گئی۔ یہ ایک نارمل برطانوی محبت تھی جیسا کہ عام برطانوی بھی کرتے ہیں۔ اس دوران ہمارے درمیان شادی کے لئے کئی بار مباحثے ہوئے۔ ڈیانا نے کئی بار شادی کی بات کی مگر میں اسے یہ سمجھاتا رہا کہ اس سے میری زندگی پر بہت گہرا اثر پڑے گا کیونکہ بہر حال وہ ایک شہزادی ہے اور دنیا میں سب سے مقبول خاتون بھی۔ ہم ایک نارمل زندگی صرف پاکستان میں ہی گزار سکتے تھے اور میں نے اسے یہ بات بتائی تھی مگر ہمارے درمیان کسی ایک بات پر اتفاق نہ ہوسکا تھا۔ یعنی اس بات پر تو اتفاق تھا کہ ہماری شادی ہونی چاہئے مگر کہاں، کب اور کیسے پر اتفاق نہ ہو سکا تھا۔ اس دوران ڈیانا کے ذاتی خادم بٹلر نے ایک پیر صاحب سے ملاقات بھی کی تاکہ وہ دعا کریں اور کسی طرح ہماری شادی ہو جائے۔ یہ آئیڈیا ڈیانا کا تھا میرا نہیں۔ مجھے اس بارے میں کچھ علم نہ تھا پھر اچانک ڈیانا نے بتایا کہ وہ جادوگروں اور پیروں کی خدمات حاصل کر رہی ہے تاکہ کسی طرح ہماری شادی ہو جائے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈیانا بس آنکھیں بند کر کے میرے ساتھ شادی کرنے پر زور دے رہی تھی اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس بارے میں وہ سوچنے پر تیار نہ تھی۔ بس اسی بات پر ہماری بحث ہوتی تھی کہ ہم آنکھیں بند کر کے شادی نہیں کر سکتے تھے۔ ہاں ایک بات اور، ہمارے درمیان بھی یہ نہیں طے ہوا تھا کہ ڈیانا مجھ سے شادی کے لئے اسلام قبول کرلے گی۔''

ڈاکٹر حسنات بیٹھے بیٹھے انہی ایام میں پہنچ چکا تھا۔

''ڈیانا سے دوستی اور تعلق کے دوران مجھے بہت دھمکیاں ملتی رہتی تھیں، اس دوران ڈیانا کی والدہ نے بھی اس سے بات چیت بند کردی تھی کیونکہ وہ اس کی میرے ساتھ دوستی اور تعلق پر بہت ناراض تھی۔ اس وقت تک سب کچھ نارمل ہی چل رہا تھا مگر مجھے اچانک لگا کہ ڈیانا نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ یا شاید وہ مجھے حسد میں مبتلا کر کے اُکسانا چاہتی تھی تاکہ میں اس کے لئے سٹینڈ لوں۔ وہ ایک دن چھٹی گزارنے الفائد کے پاس گئی اور جہاں اس کے بیٹے ڈوڈی سے ملی اور



یقیناً یہ مجھے برا لگا۔ میں نے ڈیانا کو کہا کہ وہ الفائد کے بیٹے ڈوڈی سے کیوں مل رہی ہے؟ اس بات پر ہمارے درمیان تلخی پیدا ہوئی مگر ڈیانا کا کہنا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں اور وہ ایک نارمل سی ملاقات تھی۔ جب کہ میرا خیال تھا کہ کوئی ہے جو ہمارے درمیان تعلق ختم کرانے کے لئے اس قسم کی سازشیں کر رہا ہے اور اسی نے یہ ملاقات طے کرائی تھی مگر ڈیانا اسے ماننے پر تیار نہ ہوئی۔ میں نے بہرحال ڈیانا کو بتا دیا تھا کہ وہ اپنی تباہی کے راستے پر چل رہی ہے۔ اس تلخی کے بعد ہمارے درمیان دراڑ پیدا ہوگئی اور ڈیانا ڈوڈی کے پاس چلی گئی۔ کاش میں اسے روک لیتا، میں روک سکتا تھا۔"

ڈاکٹر حسنات کی آواز میں لاکھوں ان کہے پچھتاوے تھے۔

"میں جب بھی غریب بچوں کا آپریشن کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈیانا میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ تم ان بچوں کی مدد کر کے بالکل ٹھیک کر رہے ہو۔"

ڈیانا کی دوست روزا کا کہنا ہے کہ ڈیانا سے تعلق توڑنے میں حسنات نے پہل کی۔ جب کہ جمائما کا کہنا ہے کہ ڈیانا نے تعلق ختم کر دیا کیونکہ حسنات نے شادی سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر حسنات سے دور ہونے کے باوجود ڈیانا اسلام اور مسلمانوں سے دور نہ رہ سکیں۔ اب ان کی دوستی ایک ارب پتی

عرب بزنس مین کے امیر کبیر بیٹے دودی الفائد سے ہوگئی۔ ان دونوں کا ساتھ موت تک رہا۔

اگست 1997ء کی رات لیڈی ڈیانا دودی فائد کے ساتھ رٹز ہوٹل، پیرس سے لندن جانے کو نکلی۔ گاڑی رٹز ہوٹل میں سیکیورٹی کا ڈپٹی چیف ہنری پال چلا رہا تھا۔ ہوائی اڈے جاتے ہوئے پیس ڈی لا کونکورڈ نامی زیرِ زمین گزرگاہ سے گزرے۔ اس گزرگاہ میں ایسا خوفناک واقعہ پیش آیا کہ اس کی وجہ سے کار ہنری پال کے قابو سے باہر ہوئی اور وہاں موجود ستون سے ٹکرا گئی۔ دودی فائد اور ہنری پال تو فوراً ہلاک ہوگئے۔ یہ خوفناک واقعہ رات 12 بج کر 23 منٹ پر رونما ہوا۔ حادثے سے قبل سفید فیٹ اور شہزادی کی مرسیڈیز کے مابین ٹکر بھی ہوئی۔ نتیجتاً فیٹ کی پچھلی بتی ٹوٹ گئی اور کچھ روغن بھی مرسیڈیز سے جا چمٹا۔ تاہم دونوں کاریں اور موٹر سائیکلوں والے جائے وقوعہ سے باآسانی فرار ہوگئے۔ البتہ خاصے لوگوں نے کاروں کو تیزی سے فرار ہوتے ضرور دیکھ لیا۔ ٹکراؤ کے بعد وہاں سے گزرتے کچھ لوگوں نے گاڑیاں روک لیں اور کار سے زخمیوں کو نکالنے کی جدوجہد کرنے لگے۔ ان میں ڈاکٹر مائیلز بھی شامل تھا۔ اس نے بعدازاں بتایا کہ شہزادی ڈیانا ٹھیک ٹھاک مگر صدمے کی حالت میں تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر آدھے گھنٹے بعد جائے حادثہ پر پہنچا، حالانکہ فرانس جیسے ترقی یافتہ ملک میں ایمبولینس زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں کہیں بھی پہنچ جاتی ہے۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ہسپتال لے جانے کے بجائے ڈیانا کا علاج وہیں کرتے رہے اور ایک بج کر 41 منٹ پر ایمبولینس جائے حادثہ سے روانہ ہوئی۔ یوں علاج میں غیر معمولی تاخیر کے باعث لیڈی ڈیانا کو پہنچنے والی اندرونی ضربات بگڑ گئیں اور جان لیوا ثابت ہوئیں۔ چار بجے صبح شہزادی چل بسی اور اپنے کروڑوں چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑ گئی۔ نجی زندگی سے قطع نظر شہزادی ایک محبت کرنے والی خوب صورت خاتون تھی جس نے پہلے اپنی خوب صورتی اور پھر انسان دوست سرگرمیوں کی وجہ سے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ وہ پاکستان سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر حسنات کو بھی چاہتی تھی۔ افسوس کہ جاں طلب اور متعصب برطانوی شاہی خاندان کی سازش کا شکار ہوگئی۔

اس واقعے کی خبر پھیلتے ہی برطانوی و فرانسیسی میڈیا راگ الاپنے لگا کہ یہ ''حادثہ'' تھا۔ فرانسیسی و برطانوی پولیس نے بھی بالا آخر اسے ''حادثہ'' ہی قرار دیا۔

پولیس تفتیش

کاروں کا دعویٰ ہے کہ ہنری پال نشے میں تھا۔ لہٰذا وہ تیز رفتاری میں کار سنبھال نہ سکا اور حادثہ انجام پایا۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ اخبار نویسوں اور فوٹوگرافروں نے ان کا پیچھا کرنا شروع کردیا۔ ان کی اور متعاقبین کی کاروں کے درمیان ایک ریس شروع ہوگئی جس کا انجام ایک سرنگ میں دودی اور ڈیانا کی گاڑی کے خوفناک ایکسیڈنٹ پر ہوا۔ اس حادثے میں لیڈی ڈیانا اور دودی دونوں ہلاک ہوگئے۔ ڈیانا عالم رنگ و بو کی ساری رنگینیاں اور خوشبوئیں چھوڑ چھاڑ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئی۔ تاہم دودی کے والد اور مصری نژاد برطانوی ارب پتی، محمد الفائد نے اسے حادثہ نہیں قتل قرار دیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ شہزادی کو اس لیے مارا گیا تاکہ وہ ایک مسلمان (دودی) سے شادی نہ کرسکے۔ نیز ڈیانا کے سینے میں کئی شاہی راز دفن تھے۔ ان کا نام و نشان مٹانے کی خاطر شہزادی کا قصہ تمام کردیا گیا۔ اس ایکسیڈنٹ کو مختلف معانی اور مفاہیم پہنائے گئے جس میں ایک یہ بھی شامل تھا کہ لیڈی ڈیانا اصل میں اسلام قبول کرنے والی تھی جو کہ برطانیہ کے اربابِ اختیار کو پسند نہ تھا اور انہوں نے لیڈی ڈیانا کو ایک حادثے میں ہلاک کروادیا۔ شاہی ملازم نے یہ بھی کہا کہ اس نے شہزادی ڈیانا کی ماں کو یہ کہتے سنا

''تم مسلمان مردوں کے ساتھ ڈیٹنگ کرتی ہو... طوائف کہیں کی!''

''تم طوائف ہو''

اس گفتگو کے بعد ماں بیٹی میں بات چیت کا سلسلہ ختم ہوگیا اور دو ماہ بعد، اگست 1997 میں شہزادی ڈیانا کا دودی الفائد کے ہمراہ ایک کار حادثے میں انتقال ہوگیا۔ لیڈی ڈیانا کی وفات پر پوری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ ان کو چاہنے والے گھروں سے نکل آئے اور ان کا

جی بھر کر سوگ منایا گیا۔ وہ 31 اگست 1997 کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوئیں۔

☆......☆......☆

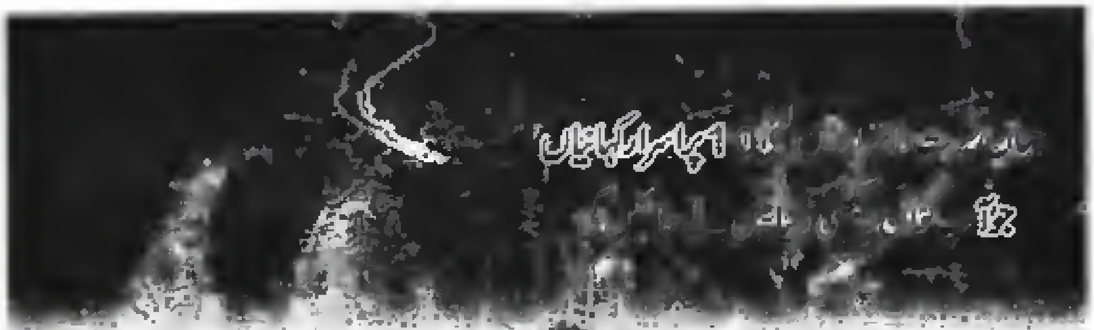
کیا لیڈی ڈیانا ویسی ہی تھیں جیسا کہ اس کا تاثر پھیلایا گیا۔۔۔۔ شاید ایسا نہیں تھا۔۔۔۔ شہزادی ڈیانا کی موت کے بعد جب شہزادہ چارلس میڈیا میں شدید تنقید کا نشانہ بنے، تو انہوں نے اپنے دفاع میں ایسا قدم اٹھایا جس کی توقع ایک مہذب، شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان سے ہرگز نہیں ہوتی۔ شہزادہ چارلس ملازمین کے ذریعے اخبارات میں اپنے ہی بچوں کو بدنام کرنے والی خبریں چھپوانے لگے مگر برطانوی عوام پر وہ خبریں یہ تاثر چھوڑتیں کہ ''ہمدرد اور شفیق'' باپ بن ماں کے بچوں کی عمدہ خبر گیری کر رہا ہے۔ ان خبروں کا مقصد یہ تھا کہ برطانیہ میں شہزادہ چارلس کا ''مثبت امیج'' ابھارا جائے۔ 1996ء میں شہزادہ چارلس نے برطانوی عوام میں اپنا امیج بہتر بنانے کی خاطر ایک پبلک ریلیشنگ آفیسر، مارک بولینڈ کی خدمات حاصل کر لیں۔ شہزادے نے اسے اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنایا اور یہ مشن سونپا کہ وہ عام برطانویوں میں اس کے لیے محبت و ہمدردی کے جذبات پروان چڑھائے۔ مارک بولینڈ ایک چالاک و مکار شخص تھا۔ وہ اپنے تعلقات کے بل پر برطانوی و یورپی میڈیا میں شہزادی ڈیانا کے خلاف افواہیں پھیلانے لگا۔ اس نے سعی کی کہ شہزادی کو ایک کھلنڈری اور آوارہ مزاج لڑکی کے روپ میں پیش کیا جائے۔ یہ بھی سچ ہے کہ لیڈی ڈیانا ''دودی الفائد'' سے شادی کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھی اور دودی سے تعلق ڈاکٹر حسنات کی یاد سے پیچھا چھڑانے کی کوشش تھی۔ دودی اور ڈیانا کا تعلق عارضی تھا۔



برطانوی عوام نے ڈیانا سے محبت کی تھی جو آج بھی برقرار ہے، لوگ اس کے ہر ہر روپ سے محبت کرتے ہیں اور اس کے خلاف کچھ نہیں سن سکتے۔ ڈیانا آج بھی ڈاکٹر حسنات کے دل میں دھڑکتی ہے، وہ شاہی خاندان کی سازش کا شکار ہو کر محض 36 سال کی عمر میں اس دنیا سے چلی گئی مگر وہ زندہ رہے گی، خواب، گلاب اور خوشبو بن کر!!!

☆☆





رازداری کی شرط ہے

ممتاز احمد



ایک کلرک کی پراسرار حتیٰ ایمانداری کی بنا پر جس کا ٹرانسفر کر دیا گیا تھا اور پھر...

اچانک ہی میرا تبادلہ ایک بہت دور افتادہ اور انتہائی پسماندہ علاقے میں کر دیا گیا۔ جب مجھے ٹرانسفر آرڈرز ملے تو میں بھونچکا رہ گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جس علاقے میں میرا تبادلہ کیا گیا وہ شہر ایک چھوٹی سی تحصیل تھا اور میرے آبائی شہر سے پورے دو سو کلو میٹر کی دوری پر تھا۔ مجھے سرکاری محکمے میں ملازمت کرتے پانچ سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔ میرے تبادلے کی بڑی وجہ افسران کا مجھ سے نالاں ہونا تھا۔ افسران اس وجہ سے مجھ سے خفا تھے کہ میں رشوت نہیں لیتا تھا۔ میرا نام لیاقت ہے گو کہ میں تھا تو سینئر کلرک مگر محکمے میں یہ سیٹ بہت اہم گردانی جاتی ہے۔ یہ پبلک ڈیلنگ کا محکمہ ہے تو روزانہ بے شمار لوگوں کا اپنے کاموں کے سلسلے میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ کوئی بھی افسر براہ راست پبلک کے کسی بندے سے رشوت وصول نہیں کرتا۔ یہ سارا کام سینئر کلرک کے ذمہ ہوتا ہے جو اپنا حصہ رکھ کر باقی رقم افسران کی جیبوں تک پہنچاتا ہے۔ میں نے پہلے دن سے ہی اپنے اللہ سے اور اپنے آپ سے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ نہ اپنے لیے رشوت لوں گا اور نہ کسی افسر کے لیے۔ ہمیشہ حق حلال کی روزی کماؤں گا۔ میں اپنے اس عہد پر سختی سے کاربند تھا۔ افسران نے مجھے بہت قائل کرنے کی کوشش کی۔ ڈرایا دھمکایا گیا اور ہتھکنڈے آزمائے مختلف طریقوں سے تنگ کیا مگر میں پختہ عزم کے ساتھ ڈٹا رہا۔ بالآخر Administrative Grounds (انتظامی بنیادوں) کی بنا پر میرا تبادلہ یہاں کر دیا گیا۔ مجھ جیسے کسی اہلکار یا افسر کو سزا دینی ہوتی تو اس کا تبادلہ یہاں کر دیا جاتا تھا۔

افسران نے اپنی دانست میں مجھے سزا دینے اور ٹھیک کرنے کے لیے یہاں میرا تبادلہ کیا تھا کہ میرے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ تبادلہ رکوانے کے لیے میرے پاس کوئی سفارش یا اثر ورسوخ نہیں تھا اور نہ ہی میں نے کسی افسر کی منت کی تو آرڈرز وصول کرنے کے بعد اگلے ہی دن یہاں ڈیوٹی جوائن کر لی۔

میں غیر شادی شدہ تھا۔ ویسے تو مجھے کوئی خاص پرابلم نہیں تھی مگر بوڑھے والدین کا ساتھ تھا۔ امی اور ابو دونوں ہی بیمار رہتے تھے۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا میں تھا تو والدین کا علاج معالجہ اور ان کی دیکھ بھال کرنا میرا اولین فرض تھا جو کہ میں اللہ کے

فضل و کرم سے کما حقہ پورا کر رہا تھا مگر تبادلے کی وجہ سے ان کی خدمت سے محروم ہو گیا تھا۔ اب میں ان کو اپنے ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا تھا کیونکہ سب بہن بھائی اسکول کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ مجھے زیادہ فکر اپنے ماں باپ کی تھی اس کے علاوہ اور کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا۔

افسران کا جب دوسرے شہر میں تبادلہ ہوتا ہے تو انہیں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی کیونکہ ہر شہر میں سرکاری کوٹھی اور سرکاری گاڑی مل جاتی ہے۔ مسئلہ تو

کمرے کی تلاش شروع کر دی چونکہ یہ انتہائی پسماندہ غیر ترقی یافتہ علاقہ تھا تو یہاں کوئی بھی بیچلرز ہوسٹل وغیرہ کی سہولت نہ تھی۔ دیہاتی ماحول تھا۔ پہلا ہفتہ دفتر کے ایک کمرے میں گزارا۔ دفتر ٹائم کے بعد چوکیدار آ جاتا تھا تو اس کے ساتھ گپ شپ میں وقت گزر جاتا۔ چونکہ میں سزا کے طور پر یہاں آیا تھا اس لیے بہت احتیاط سے یہاں رہنا تھا۔ دفتر میں رات گزارنا بھی غیر قانونی تھا تو ڈیوٹی کے بعد ایک کولیگ کے ساتھ رہائش کی تلاش میں نکل



صرف چھوٹے ملازمین اور کلریکل اسٹاف کے لیے ہوتا ہے جن کے لیے کوئی سہولت نہیں ہوتی۔ دوسرے شہر میں چھوٹے ملازمین کے لیے سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا ہوتا ہے۔

خیر میں نے یہاں آ کر ڈیوٹی جوائن کر لی مگر سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا تھا۔ ہمارا دفتر آبادی کے قریب ہی ایک بڑی نہر کے کنارے پر واقع تھا۔ دفتر کی بلڈنگ محکمے کی اپنی تھی مگر کوئی بھی چھوٹا موٹا کوارٹر نہیں بنا تھا۔ میں نے رہائش کے لیے مکان یا

جاتا۔ آخر خدا خدا کر کے اسی کولیگ کی وساطت سے دس دن کے بعد ایک چھوٹا سا کوارٹر رہائش کے لیے مل گیا۔ یہ کوارٹر چھوٹے چھوٹے دو کمروں، چھوٹے سے برآمدے اور غسل خانے پر مشتمل تھا۔ کافی عرصے سے خالی پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے کمروں میں جالے، مٹی اور گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ اگلے دن اتوار کی چھٹی تھی تو میں نے خود ہی کوارٹر کی صفائی ستھرائی شروع کر دی۔ دیواروں سے مٹی گرد و غبار جالے اتارے، فرش دھویا شام تک شیشے کی طرح

چمکا دیا۔ ضرورت کا سارا سامان بھی بازار سے لے آیا اور اللہ کا نام لے کر رہائش اختیار کر لی۔

سارا دن گھر کی صفائی کرتا رہا تو بری طرح سے تھک گیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر عشاء کی نماز ادا کی اور جیسے ہی چارپائی پر لیٹا فوراً نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

غالباً رات کے ایک بجے کا ٹائم تھا میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اچانک ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے کوئی بہت وزنی سانپ یا اژدھا میرے جسم پر رینگ رہا ہے۔ وہ وزنی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت گرم تھا۔ میرے جسم کے جس جس حصے پر وہ رینگتا رہا وہاں ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے تین انچ موٹا گرم پائپ پھیرا گیا ہے اور میرا جسم جل رہا تھا۔ میں فوراً چھلانگ لگا کر چارپائی سے نیچے اترا اور لائٹ آن کی مگر چارپائی خالی تھی۔ کچھ نہ تھا۔ میں نے سارا بستر جھاڑا کہ شاید کوئی کیڑا مکوڑا نہ ہو۔ مجھے تپش اور گرمی محسوس ہو رہی تھی حالانکہ اوائل مارچ کے دن تھے۔ فضا میں خنکی تھی۔ مجھے سخت بے چینی ہو رہی تھی۔ میں نے لائٹ جلتی رہنے دی اور ڈرتے ڈرتے چارپائی پر لیٹ گیا۔ آدھا گھنٹہ کروٹیں بدلتا رہا مگر نیند دوبارہ نہیں آ رہی تھی۔ گرمی، گھبراہٹ اور نہ ہی بے چینی کم ہو رہی تھی۔ طبیعت میں بہت تلخی اور سخت پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر تین گلاس پانی پیا جس سے پیاس اور تلخی کچھ کم ہوئی مگر گرمی اور بے چینی بدستور رہی۔ گرمی کا احساس ختم کرنے کے لیے غسل خانے کا رخ کیا اور پہلے وضو کیا پھر پورا آدھا گھنٹہ ٹھنڈے پانی سے نہاتا رہا۔ نہا کر کمرے میں آیا۔ گھڑی میں ٹائم دیکھا اڑھائی بج رہے تھے۔ میں نے جائے نماز بچھایا اور تہجد ادا کی۔ مجھے بے حد سکون اور فرحت کا احساس ہوا۔ گرمی، تپش، بے چینی اور گھبراہٹ دور ہو گئی۔ طبیعت ہشاش بشاش ہو چکی تھی۔ میں نے قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ فجر کی نماز تک تلاوت کی اور نماز کے بعد چارپائی پر لیٹا تو اسے لیے گہری نیند سو گیا۔ صبح ساڑھے سات بجے خود ہی جاگ گیا اور تیار ہو کر آٹھ بجے اپنی ڈیوٹی پر آفس پہنچ گیا۔

☆......☆

اگلی رات شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ شور کی آوازیں دوسرے کمرے سے آ رہی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینک رہا ہے۔ میں نے لائٹ آن کی اور جا کر دوسرے کمرے میں دیکھا تو وہ خالی پڑا تھا اور آوازیں بھی بند ہو گئیں۔

اب روزانہ رات کو اسی طرح ہونے لگا کبھی ایسے لگتا جیسے کوئی بھاری چیز فرش پر گھسیٹ رہا ہے۔ کبھی پرندوں کے پر پھڑپھڑانے کی آوازیں آتیں، کبھی چیخوں کی آوازیں آتیں، کبھی مکھیوں کی تیز بھنبھناہٹ کی آوازیں آتیں، کبھی کسی بچے کے رونے کی آوازیں آتیں، کبھی ایسے لگتا جیسے زلزلہ آ رہا ہے الغرض ایسی آوازوں کا روزانہ کا معمول بن گیا۔ یہ سب تقریباً رات کے دو بجے ہوتا۔ میں اس وقت تہجد پڑھنے کے بعد قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دیتا۔

☆......☆

شروع شروع میں مجھے بہت ڈر لگتا اور میں خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ مکان بدل لوں اور اپنے طور پر تلاش بھی کرتا رہا مگر کوئی مکان نہ ملا۔ اس سارے معاملے کو اپنے تک محدود رکھا اور کسی سے ذکر نہ کیا۔ مجھے یہاں آئے پورا مہینہ ہو چکا تھا۔ یکم اپریل کو تنخواہ وصول کی۔ اتوار کے ساتھ سوموار منگل کی دو چھٹیاں لیں اور اپنے شہر آ گیا۔ امی ابو کی طبیعت پہلے سے زیادہ خراب تھی۔ انہیں لے کر اسپتال گیا۔ چیک اپ کروایا اور میڈیسن لے آیا۔ گھر کے دیگر معاملات دیکھا۔ اپنا خرچہ پانی رکھ کر باقی تنخواہ امی کے ہاتھ پر رکھی۔ تین دن گھر رہنے کے بعد بدھ کی صبح اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ شام کو جب کوارٹر کا دروازہ کھولا تو دیکھا۔ میری چارپائی پر بہت سارے کبوتر بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ کمرے میں اڑنے لگے اور ایک ایک کر کے دروازے سے باہر نکل گئے۔ میں بہت حیران ہوا کہ یہ کبوتر کہاں

سے آ گئے تھے جب کہ میں تو پورا کوارٹر لاک کر کے گیا تھا۔ نماز عشاء کے بعد سو گیا تو رات کے دو بجے غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز آنے لگی۔ جا کر دیکھا تو پانی سے بالٹی بھری ہوئی تھی حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے بالٹی خالی ایک کونے میں، میں نے رکھی تھی اور اب یہ ٹونٹی کے نیچے پڑی ہوئی تھی اور پانی سے بھری تھی۔ میں نے ٹونٹی کھولی تو پانی نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ ٹنکی خالی تھی۔ میں نے بالٹی والے پانی سے وضو کیا اور تہجد پڑھی۔

اگلے دن مغرب کے بعد میرا ایک کولیگ میرے پاس کوارٹر میں آ گیا اس کی بیوی بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں اکیلا تھا اور بور ہو رہا تھا تو ٹائم گزارنے کے لیے میرے پاس آ گیا۔ ہم نے اکٹھے رات کا کھانا کھایا۔ پھر گھومنے پھرنے کے لیے باہر نکل گئے۔ رات نو بجے کوارٹر میں آنے میں نے اس سے کہا کہ آج رات یہاں میرے پاس ہی رک جاؤ تم اپنے گھر میں بھی اکیلے ہو تو گپ شپ لگائیں گے تو وہ مان گیا۔ قریبی ایک گھر سے چارپائی اور بستر مانگا کیونکہ میرے پاس صرف ایک چارپائی اور بستر تھا۔ کولیگ سے کہا۔ جتنے دن تمہاری بیوی بچے یہاں نہیں ہیں تم ادھر میرے پاس ہی رات کو رک جایا کرو۔ رات گیارہ بجے تک ہم باتیں کرتے رہے پھر سو گئے۔ میرے پاس سوئیوں والی گھڑی تھی جو میں اپنے سرہانے رکھ کر سویا کرتا تھا۔

رات کے دو بجے مجھے ایسا لگا کہ کوئی سیلف سے گاڑی اسٹارٹ کر رہا ہے مگر بار بار سیلف مارنے پر گاڑی اسٹارٹ نہ ہو رہی ہے۔ اس آواز سے میری آنکھ کھل گئی تو دیکھا یہ آواز میری گھڑی سے آ رہی تھی۔ مجھے حیرانی بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی کہ عام سی اور سادہ سی گھڑی سے یہ کیسی آواز آ رہی ہے۔ میرے جاگتے ہی یہ آواز بند ہو گئی۔ میں نے حسب معمول تہجد پڑھی اور تلاوت کی جب کہ میرا کولیگ گہری نیند سوتا رہا۔ اگلے دن کولیگ کی میرے پاس آنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

ہوا کچھ یوں کہ مغرب کے بعد اس کی ٹانگ میں اتنا شدید درد اٹھا کہ وہ چار قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ ساری رات اسے درد رہا اور صبح ہوتے ہی اس کا درد غائب ہو گیا۔ جتنے دن اس کے بیوی بچے واپس نہیں آئے اسے روزانہ رات کو درد شروع ہو جاتا اور صبح خود بخود ختم ہو جاتا۔

☆......☆

ایک دن شام کا وقت تھا۔ میں نے اپنی گھڑی اور پرس اپنے بستر کے سرہانے رکھا اور باہر برآمدے میں مٹی کے تیل والے چولہے پر چائے بنانے لگا۔ چائے کا کپ لے کر کمرے میں آیا تو دیکھا پرس اور گھڑی غائب تھے۔ میں نے پورا کمرہ چھان مارا مگر دونوں چیزیں نہ ملیں۔ کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ باہر سے کوئی آیا ہو اور میرا پرس گھڑی اٹھا کر لے گیا ہو۔ مجھے پریشانی ہونے لگی کیونکہ پرس میں میری پوری تنخواہ تھی اور اگلے دن میں نے اپنے گھر جانا تھا۔ دوسرے کمرے میں بھی جا کر دیکھا لیکن نہیں ملیں مگر بے سود...! تھوڑی دیر کے بعد مغرب کی اذان ہوئی تو وضو کرنے غسل خانے میں گیا تو دیکھا وہاں میرا پرس اور گھڑی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے فوراً پرس کھول کر رقم گنی تو وہ پوری تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

مجھے اس کوارٹر میں رہتے ہوئے تین مہینے ہو چکے تھے۔ اب ہر روز کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ہونے لگا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے ذرا بھی ڈر اور خوف محسوس نہ ہوتا تھا۔ میں اکیلا یہاں رہتا تھا مگر ابھی تک میرا کسی قسم کا کوئی نقصان نہ ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ میں ان باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔ نماز میں پہلے ہی پڑھتا تھا مگر باقاعدگی سے نہیں۔ اب پڑھنی لازمی ہو گئی۔ ان تین مہینوں میں ایک فائدہ ضرور ہوا تھا وہ یہ کہ نماز پنجگانہ کی ادائیگی کے ساتھ تہجد پڑھنا اور تلاوت قرآن پاک میرا معمول بن گیا تھا۔ رزق حرام سے اللہ نے مجھے پہلے ہی بچایا ہوا تھا۔

میری تعلیم بی اے تھی۔ میٹرک سے بی اے تک

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

کے تینوں امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیے تھے گھر کے حالات اچانک کچھ ایسے ہو گئے جن کی وجہ سے مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور مجھے سینئر کلرک کی نوکری کرنی پڑی۔ تین بجے دفتر بند ہو جاتا تھا اس کے بعد میں فارغ ہوتا تو مجھے خیال آیا کہ وقت ضائع کرنے کی بجائے کیوں نہ ایم اے کی پرائیویٹ تیاری شروع کردوں۔ چنانچہ اگلے ہی دن سے ایم اے کی تیاری شروع کردی۔ یونیورسٹی سے امتحان کے شیڈول کا پتا کروایا اور دفتر ٹائم کے بعد کوارٹر میں رات گئے تک پڑھتا رہتا۔ پراسرار واقعات کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔

میری روزمرہ استعمال کی اشیاء خود ہی غائب ہو جاتیں پھر خود ہی مل جاتیں۔ کبھی خود بخود پنکھا چل جاتا اسی طرح خود ہی لائٹ آن ہو جاتی مگر میں ان سب باتوں سے بے پروا میں وہاں رہ رہا تھا۔ انہی حالات میں شب و روز گزرتے گئے اور چھ مہینے کا عرصہ بیت گیا۔ ایک رات میں سو رہا تھا اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میری چارپائی زمین سے اٹھی ہوئی تھی اور کمرے میں گھوم رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا جیسے چارپائی کو کسی نے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ مجھے اس رات بہت ڈر لگا اور خوف سے پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ میں نے آیت الکرسی کا ورد شروع کردیا۔ تھوڑی دیر بعد خود ہی چارپائی زمین پر واپس آ گئی۔ میں نے گھڑی اٹھا کر ٹائم دیکھا تو ابھی ساڑھے بارہ بجے تھے۔ باقی رات جاگ کر گزاری کیونکہ پھر مجھے نیند نہیں آئی۔ صبح دس بجے دفتر کے پی ٹی سی ایل فون پر چھوٹے بھائی کی کال آئی۔ وہ پی سی او سے فون کر رہا تھا اس نے بتایا کہ امی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔ آپ فوراً گھر پہنچو۔ میں نے اسی وقت ایک ہفتے کی چھٹی لکھی۔ اپنے افسر کو والدہ کی بیماری کا بتایا تو انہوں نے فوراً میری چھٹی منظور کر دی۔ میں کوارٹر سے کچھ چیزیں اٹھانے کے لیے آیا کمرے کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا تو دیکھا میرے بستر پر بہت بڑا کوبرا سانپ پھن پھیلائے بیٹھا ہے جسے دیکھ کر خوف سے میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں فوراً کمرے سے باہر آیا اور اِدھر اُدھر سے ایک چھڑی تلاش کر کے پکڑ لی تاکہ اگر سانپ مجھے ڈسنے کی کوشش کرے تو اپنا بچاؤ کرسکوں۔ جونہی کمرے میں واپس آیا تو سانپ غائب تھا۔ پورے کمرے میں تلاش کیا مگر سانپ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی ضرورت کی چیزیں اٹھائیں کوارٹر کو تالا لگایا۔ واپس دفتر آ کر اپنا کام کولیگ کے حوالے کیا اور شام تک گھر پہنچ گیا۔

امی کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی انہیں سانس لینے میں بہت تکلیف تھی۔ وہ صحیح طرح سانس نہیں لے پا رہی تھیں۔ ان کے سینے اور پیٹ میں بہت درد تھا۔ وہ درد کی شدت سے تڑپ رہی تھیں۔ فوری طور پر انہیں سول اسپتال کی ایمرجنسی میں لے گئے۔ جہاں ان کی ای سی جی کی گئی جو کہ بالکل ٹھیک تھی۔ چند دیگر ٹیسٹ بھی کیے وہ بھی سب ٹھیک اور نارمل تھے۔ انہیں آکسیجن لگا دی گئی۔ درد ختم کرنے کے لیے ڈرپ میں انجکشن ڈال کر لگا دیا گیا۔ درد کچھ کم ہوا مگر ان کی حالت سنبھل نہیں رہی تھی۔ تین دن سے اسپتال میں تھے۔ اسپیشلسٹ ڈاکٹرز نے چیک کیا۔ دوائیاں تبدیل کیں مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق انہیں آرام نہیں آ رہا تھا۔

ایک دن دوپہر کو اچانک امی کا سانس اکھڑنے لگا۔ وہ بہت اذیت میں تھیں۔ ڈاکٹر نے فوراً آ کر چیک کیا اور ایک نسخہ لکھ کر دیا کہ جلدی سے لے کر آؤ۔ میں نسخہ لے کر اسپتال سے باہر میڈیکل اسٹور پر آیا تو وہاں ایک عورت کھڑی تھی جس نے اپنی گود میں ایک سال کا بچہ اٹھایا ہوا تھا جو تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔ اس عورت نے مجھے خدا کا واسطہ دے کر کہا۔

”بابو میرا بچہ بہت بیمار ہے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ بچے کے لیے یہ دوائی لے دو۔“ ساتھ ہی اس نے ایک نسخہ میرے آگے کر دیا۔ مجھے وہ عورت بہت بے بس، لاچار اور مجبور لگی۔ میں نے ایک نظر اس کے روتے بچے کی طرف دیکھا تو مجھے بہت ترس آیا میں نے میڈیکل اسٹور والے سے کہا

کہ اس کو میڈیسن دے دو، میں بل ادا کر دوں گا۔ ساتھ ہی اپنی والدہ کا نسخہ اسے دیا کہ جلدی سے یہ انجکشن بھی دو۔ نسخہ دیکھ کر وہ کہنے لگا کہ یہ انجکشن یہاں سے نہیں ملے گا، ہے تو سستا مگر بہت نایاب ہے۔ کئی دنوں سے شارٹ ہے۔ آپ رکیں میں بڑے میڈیکل اسٹور سے پتا کرتا ہوں۔ اس نے پی ٹی سی ایل پر کہیں فون کیا۔ ان کے پاس انجکشن تھا اسی اثناء میں اس کے ملازم نے اس عورت کے بچے کی میڈیسن لفافے میں ڈال دی تھی۔ اس کا آٹھ سو روپے بل بنا جو کہ میں نے ادا کر دیا۔

وہ عورت میڈیسن لے کر مجھے دعائیں دیتی ہوئی اسپتال کی طرف چلی گئی جہاں اس نے بچے کو انجکشن اور ڈرپ لگوانی تھی۔ چند ہی منٹ کے بعد دوسرے میڈیکل اسٹور سے ایک لڑکا موٹر سائیکل پر میرا مطلوبہ انجکشن لے کر آگیا جس کی قیمت صرف تیس روپے تھی۔ میں انجکشن اور سرنج لے کر جونہی اسپتال کے گیٹ میں داخل ہوا تو ایک بزرگ جو کہ مجھے مجذوب لگتا تھا ننگے پاؤں کھڑا تھا مجھے روک لیا اور کہنے لگا۔ ''بیٹا تم نے اس مجبور بے بس عورت کے بچے کو دوائی لے کر دی ہے، بہت بڑی نیکی اور احسان کیا ہے۔ تم نے اللہ کو قرض دیا ہے سو بنا رب تجھ سے راضی ہوگا جو ٹیکہ اپنی ماں کے لیے لے کر آیا ہے لا ذرا مجھے دے۔''

میں نے وہ انجکشن اس بزرگ بابا کو پکڑا دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ماری اور بولا۔ ''جا لے جا یہ ٹیکہ رب نے چاہا تو تیری ماں بھلی چنگی ہو جائے گی۔''

میں جانے لگا تو وہ بولا۔ ''اور ہاں سن! تیرے ساتھ پچھلے چھ ماہ سے جو ہو رہا ہے مجھے سب پتا ہے ایسا کر کل صبح دس بجے شہر سے باہر والے بڑے قبرستان آجانا، میں تمہیں پیپل کے گھنے درخت کے نیچے ملوں گا تمہیں سب کچھ بتاؤں گا۔ بس اب تو جا اور جلدی سے اپنی ماں کو یہ ٹیکہ لگوا۔''

میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وارڈ میں پہنچا اور انجکشن نرس کے حوالے کر دیا جس نے اسی وقت وہ انجکشن امی کو لگا دیا۔ انجکشن لگتے ہی امی جان کی حالت سنبھلنی شروع ہوگئی۔ میرے کانوں میں بزرگ کی کہی ہوئی باتیں گونج رہی تھیں۔ میں نے دوبارہ وہاں آکر دیکھا جہاں وہ بزرگ کھڑے تھے مگر اب وہ وہاں نہیں تھے جا چکے تھے۔ انجکشن لگنے کے بعد لمحہ بہ لمحہ امی جان کی تکلیف کم ہوتی جا رہی تھی اور حیرت انگیز طور پر اگلے دو گھنٹے کے اندر امی جان ٹھیک ہوگئیں۔ آکسیجن کا ماسک ہٹا دیا گیا۔ وہ اب نارمل سانس لے رہی تھیں۔ ان کے سینے اور پیٹ کا درد بھی ختم ہو گیا تھا۔ شام کو ڈاکٹر نے آکر چیک کیا انہیں صحت یاب اور فٹ قرار دے کر اسپتال سے ڈسچارج کر دیا۔ ہم جن کو تین دن پہلے اسٹریچر پر ڈال کر لائے تھے اب وہ خود اپنے پاؤں پر چل کر گھر آگئیں۔ رات وہ گہری اور پرسکون نیند سوئیں۔

صبح وہ بھلی چنگی ہوگئیں اور لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ اتنا بیمار اور تکلیف میں رہی ہیں وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھیں۔ اب مجھے رہ رہ کر ان بزرگ کا خیال آرہا تھا جنہوں نے مجھے دس بجے قبرستان کے پیپل کے درخت کے نیچے بلایا تھا۔ ابھی صبح کے آٹھ بجے تھے میں دس بجنے کا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔

ساڑھے نو بجے بھائی کا بائیکل نکالا اور قبرستان کی طرف چل پڑا۔ قبرستان شہر سے باہر کافی دور تھا۔ وہاں پہنچنے میں مجھے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ جیسے ہی پیپل کے درخت کے نیچے پہنچا وہ بزرگ وہاں درخت کے تنے سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کر کے بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے فوراً سلام کا جواب دیا اور آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ گویا ہوئے اور کہنے لگے۔

''لیاقت بیٹا! جس کوارٹر میں تم رہ رہے ہو وہ ایک عرصے سے خالی پڑا تھا تو وہاں ماورائی مخلوق نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ جب تم وہاں شفٹ ہوئے تو انہیں تمہارا وہاں رہنا بہت ناگوار گزرا مگر تم ان کے عتاب سے ابھی تک اس لیے بچے ہوئے ہو، محفوظ ہو اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ مخلوق

تو ہے ہی ناری مگر ان کا تعلق اجنات کی اس قوم سے ہے جو اہل ایمان اور کلمہ گو ہیں وہ بلاوجہ کسی کو نقصان تکلیف نہیں پہنچاتے گو انہیں تمہاری دخل اندازی اچھی نہیں لگی مگر وہ امن پسند ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تم رزق حلال کھاتے ہو تم نے تہجد کی ادائیگی اور قرآن پاک کی تلاوت کو اپنا شعار اور معمول بنا لیا ہے۔ کوارٹر میں اللہ کی عبادت کرتے ہو تو وہ بھی تمہارے ساتھ عبادت میں شامل ہو جاتے ہیں مگر ان کی فطرت میں سرکشی شامل ہے تو وہ تمہیں مختلف طریقوں سے تنگ کرتے ہیں یوں سمجھ لو شرارتیں کرتے ہیں تمہارے ساتھ باقی تم نے یہ بہت اچھا کیا ہے کہ ابھی تک کسی کے آگے اس سارے معاملے کا ذکر نہیں کیا ورنہ وہ تمہیں نقصان بھی پہنچاتے۔ اچھا اب غور سے میری چند باتیں سنو اور ان پر سختی سے عمل کرنا۔ تمہیں بہت فائدہ حاصل ہو گا۔ پہلی بات جس طرح یہ سارا معاملہ چھپایا ہے آئندہ بھی ہمیشہ چھپا کر رکھنا اور بھول کر بھی کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔ دوسری بات اسی کوارٹر میں ہی رہائش رکھو اور کسی بات سے بھی خوفزدہ نہ ہونا۔

تیسری بات ہمیشہ پاک صاف اور باوضو رہنا۔ چوتھی بات جو دوسرا کمرہ خالی پڑا ہے اس کی روزانہ صفائی کرتے رہنا اور اس میں روزانہ شام کو مغرب کے وقت اگربتی سلگانا یا کوئی خوشبو بکھیر دیا کرنا، پانچویں بات ہر سوموار اور جمعرات کو آدھا کلو بڑا گوشت کوارٹر کی چھت پر پھینک دیا کرنا اور آخری بات تمہیں ایک وظیفہ بتا دیتا ہوں۔ اسے اچھی طرح یاد کر لینا اور خیال رہے کہ پڑھنے میں کوئی زیر زبر کی بھی غلطی نہ ہو۔

اول آخر گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھنا تم نہا دھو کر باوضو ہو کر زمین پر کوئی کپڑا یا چٹائی بچھا کر بیٹھ کر جب یہ وظیفہ پڑھو گے تو وہ مخلوق تمہارے پاس آ کر بیٹھ جایا کرے گی تو تم اس سے تھوڑی دیر کے لیے ہمکلام ہو کر باتیں کر سکو گے مگر ہمیشہ آنکھیں بند رکھنا جب گفتگو ختم ہو جایا کرے گی تو درود شریف پڑھ کر آنکھیں کھول لیا کرنا۔ وہ مخلوق تمہاری دوست بن جائے گی اور تمہارے بہت کام آئے گی مگر ان تمام ہدایات پر سختی سے عمل کرنا تم پر لازم ہے، ورنہ نقصان کا اندیشہ ہے۔''

میں نے ان بزرگ سے درخواست کی کہ میرے دوبارہ یہاں تبادلے کے لیے کچھ کریں تو انہوں نے کہا کہ ابھی نہیں تمہارے وہاں رہنے میں بہت بڑی مصلحت ہے جو فی الحال تم ابھی سمجھنے سے قاصر ہو۔ ہاں کوئی وقت آئے گا.....'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے کچھ دیر بعد پھر کہنے لگے۔ ''اپنی تعلیم کو آگے بڑھاؤ۔ خوب محنت کرو، اللہ پاک کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔''

پھر انہوں نے میرے اور میرے ماں باپ، بہن بھائیوں کے لیے دعا کی اور کہا۔ ''اب گھر جاؤ، یاد رہے ہر حال میں رازداری اور خاموشی شرط ہے۔''

میں انہیں سلام کر کے واپس گھر آ گیا۔

ابھی میری تین چھٹیاں باقی تھیں جو میں نے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ گزاریں۔ امی جان اللہ کے فضل و کرم سے صحت یاب ہو چکی تھیں۔ ابو کی صحت بھی پہلے سے بہت بہتر تھی۔ اب میں اپنے گھر کے حالات سے مطمئن تھا۔

☆......☆

جیسے ہی چھٹیاں ختم ہوئیں میں واپس اپنی ڈیوٹی والے شہر پہنچ گیا۔ ان بزرگ کی بتائی ہوئی تمام باتوں پر عمل شروع کر دیا۔ ان کا بتایا ہوا وظیفہ اچھی طرح یاد کر لیا۔ پھر میں نے ایک دن ڈرتے ڈرتے اللہ کا نام لے کر نہا دھو کر باوضو زمین پر چٹائی بچھا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر کے وظیفہ پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے پاس کوئی بیٹھا ہے۔ میں نے سلام کیا تو اسی وقت جواب ملا پھر حال احوال پوچھا۔ اسی طرح چند ایک باتیں کیں تل کر درود پاک پڑھا۔ اب کبھی کبھار میں ان سے چند ایک باتیں کر لیا کرتا۔ میرے ساتھ اب کسی قسم کی کوئی شرارت نہیں ہوتی تھی امن اور سکون تھا۔ وہ مخلوق میرے ساتھ بہت دوستانہ انداز میں رہ رہی تھی۔ مجھے پورا اطمینان تھا کہ وہ کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

حسب معمول ہر ماہ کی کم کے بعد میرا گھر چکر لگتا۔ امی ابو صحت یاب ہو گئے تھے۔ میں نے پڑھائی جاری رکھی۔ ایم اے کا داخلہ بھیج دیا تھا۔ زندگی کافی پرسکون گزر رہی تھی۔ اب تو یہ ہونے لگا مجھے اکثر کوارٹر میں پیسے ملنے لگے۔ پہلے پہلے پانچ سو کا نوٹ ملتا پھر ہزار ہزار والے اور کبھی کبھی پانچ ہزار والے نوٹ بھی مل جاتے۔ میں یہ پیسے خرچتا نہیں تھا۔ مجھے شک تھا کہ یہ کہیں نقلی نوٹ نہ ہوں۔ ایک دن میں نے وظیفہ پڑھا تو وہ مخلوق میرے پاس آگئی۔ سلام دعا کے بعد ان سے نام پوچھا تو انہوں نے اپنا نام شمراق بتایا۔ ان کی عمر تین سو سال تھی۔ وہ چند سالوں کے لیے اپنی قوم قبیلے سے الگ ہو کر ایک خاص مقصد اور عبادت کے لیے انسانوں کی دنیا میں آئے تھے۔ یہ کوارٹر عرصہ دراز سے خالی پڑا تھا تو انہوں نے یہاں ڈیرہ لگا لیا تھا انہیں میری آمد اس کوارٹر میں ناگوار گزری تھی مگر میرے معمولات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ آج وہ مجھے یہ باتیں بتا رہے تھے۔

جب سے بزرگ بابا کی ہدایات پر میں نے عمل شروع کیا تھا تو تب سے وہ بہت خوش تھے۔ جب پیسوں کی بات ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ یہ پیسے وہ رکھتے ہیں میرے لیے۔ انہوں نے کہا یہ نوٹ بالکل اصلی ہیں اور تمہارے ہیں تو تم بلا جھجک انہیں خرچ کر سکتے ہو مگر کسی سے ان کا ذکر نہ کرنا ورنہ پیسے ملنے بند ہو جائیں گے۔

اس کوارٹر میں، میں نے پورے دو سال گزارے۔ میرے پاس لاکھوں روپے جمع ہو چکے تھے۔ میں نے ایم اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا تھا۔ جب ہمارے ہی محکمے میں آفیسرز کی کچھ آسامیاں خالی ہوئیں تو ان کے لیے اخبار میں اشتہار شائع ہوا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے بھی اپلائی کر دیا۔ پھر آفیسر کی پوسٹ کے لیے تحریری امتحان ہوا جو میں نے شاندار نمبروں سے پاس کر لیا۔ اسی طرح انٹرویو بھی کوالیفائی کر لیا۔ پھر وہ دن آیا جب مجھے اپنے اسی محکمے میں آفیسر کا اپائنٹمنٹ لیٹر مل گیا اور میری تعیناتی میرے آبائی شہر میں ہی کی گئی۔ آج میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

یہ پسماندہ شہر جہاں مجھے سزا کے طور پر بھیجا گیا تھا میرے لیے بہت لکی ثابت ہوا تھا۔ یہیں سے میں نے ایم اے کیا۔ شمراق سے دوستی ہوئی لاکھوں روپے ملے۔ میں یہاں بطور سینئر کلرک آیا تھا اور اب گریڈ آفیسر بن کر اپنے شہر واپس جا رہا تھا۔ آج مجھے بزرگ بابا کی کہی ہوئی بات یاد آ رہی تھی کہ ابھی تمہارے وہاں رہنے میں بہت بڑی مصلحت ہے اور آج مجھے اس مصلحت کی سمجھ آگئی تھی۔ اگلے دن میں نے یہاں سے رخصت ہونا تھا تو آج میں نے شام سے پہلے بازار سے موٹے حروف والا قرآن پاک لیا اور شام کو چٹائی بچھا کر ایک چھوٹی سی میز رکھی۔ میز پر قرآن پاک رکھا اور وظیفہ پڑھا تو شمراق میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ سلام دعا کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ کل یہاں سے جا رہا ہوں اور یہ قرآن پاک آپ کو تحفے کے طور پر پیش کر رہا ہوں، جسے انہوں نے بڑی خوشی اور شکریے کے ساتھ قبول کیا۔ پھر انہوں نے کہا کہ جب آنکھیں کھولو گے تو ان کی طرف سے بھی تحفہ ملے گا۔ شمراق نے بتایا کہ ان کا وظیفہ بھی مکمل ہو چکا ہے۔

اب وہ بھی اپنے قبیلے اور قوم میں واپس جا رہے ہیں۔ ہمارے درمیان کچھ اور بھی باتیں ہوئیں۔ پھر میں نے درود شریف پڑھا اور آنکھیں کھول دیں۔ قرآن پاک وہ لے گئے تھے۔ اب وہاں ایک چاندی کی انگوٹھی پڑی تھی جو انہوں نے اپنی نشانی اور تحفہ مجھے دیا تھا میں نے وہ انگوٹھی اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی میں پہن لی۔ یہ ہماری آخری ملاقات اور گفتگو تھی۔ اگلے دن میں نے کوارٹر خالی کر دیا اور چابی اس کے مالک کے حوالے کر دی۔ آج میں افسر بن کر اپنے شہر آگیا جہاں میں کلرک تھا اور سزا کے طور پر یہاں سے میرا تبادلہ کیا گیا تھا۔ جب چارج لینے کے لیے اپنے آفس پہنچا تو سب لوگ میرے استقبال کے لیے کھڑے تھے اور مبارک بادیں پیش کر رہے تھے۔

☆☆☆



بڑی آپا



ایڈیسن ادریس مسیح

سب یہی سمجھتے تھے کہ بڑی آپا پر آسیب ہے لیکن حقیقت آسیب سے بھی زیادہ پراسرار تھی

بڑی آپا پر جن عاشق ہو گئے تھے۔

پہروں بیٹھی خلاؤں میں کچھ تلاشتی آنکھوں میں اسرار سے رینگتے تھے کوئی پکار لیتا تو گردن گھما کر اس طرح دیکھتیں جیسے سمجھنا چاہ رہی ہوں کہ کیا کہا گیا ہے۔ یا پھر جیسے کچھ سمجھانا چاہتی ہوں۔ سمجھ تو خیر کسی کے کیا آتا بس آنکھوں کی وحشت ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا دیا کرتی اور پکارنے والا نظریں چرا لیتا تھا۔

اور نظریں بھی تو نہیں چرائی جاتی تھیں کون جانتا تھا کہ اچانک بیٹھے بٹھائے یہ سب ہو جائے گا ابھی دو چار دن پہلے کی تو بات تھی۔ روز کی طرح بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر ہانڈی بنائی تھی آٹا گوندھ کر رکھا تھا اور نہانے گھس گئی تھیں اس روز ان کو نہانے میں بڑی دیر ہو گئی تھی کوئی پون گھنٹے بعد نہا کر باہر نکلی تو اپنے آپ میں ہی مسکرائی جاتی تھیں صحن کے بیچوں بیچ کھڑی ہو کر تولیے سے بال جھٹک جھٹک کر سکھاتی نہایت ہی ہلکی سی آواز میں جانے کیا گنگناتی رہیں۔ پھر جو گیلے بال سلجھانے بیٹھیں تو پتا نہیں کتنی ہی دیر تک کنگھے میں لپٹے بالوں کے گچھے بنا بنا کر پیر کے انگوٹھے اور برابر والی انگلی میں بھینچتی رہیں۔

اماں پڑوس سے آئیں تو اس گمان میں تھیں کہ آپا اب تک فارغ ہو چکی ہوں گی اور وہ ان سے بیٹھ کر ڈائجسٹ کی کہانی سنیں گی لیکن ان کو اس طرح تخت پر بال سنوارتے دیکھا تو سٹپٹا کر رہ گئیں۔

”آئے ہائے غضب خدا کا کتنی بار کہا ہے کہ شام کو بال کھلے چھوڑ کر اس طرح نہیں بیٹھتے جن عاشق ہو جاتے ہیں۔“

بڑی آپا نے پہلی بار اماں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا ورنہ وہ ہنس کر کہا کرتی تھیں ”کچھ نہیں ہوتا اماں تم تو خواہ مخواہ کے وہم پالتی ہو۔“

اماں ماتھے پر بل ڈالے اس کے جواب کی منتظر رہیں اور وہ چپ چاپ اٹھ کر پیروں میں بالوں کے گچھے نکال کر ہاتھ میں دبائے۔ کنگھا لیے کچرا دان کے پاس جا کھڑی ہوئیں اور بجائے بال پھینکنے کے کنگھا کچرا دان میں ڈال دیا اور وہیں کھڑی ہو کر بالوں کے گچھے اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھنے لگیں۔ اماں حیرت میں بھری سر پر آن کھڑی ہوئیں اور غصے سے کہا۔



"کیا باولی ہوگئی ہو۔ بالوں کا کیا اچار ڈالوگی۔ اور کنگھا کیوں پھینک دیا پنجرے میں"

بڑی آپا نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور ایک گہری پر اسراری نظر اماں پر ڈال کر چند لمحے گھورتی رہی اور پھر تیزی سے اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس چند لمحوں کی نظر میں کیا تھا جو اماں کو پتھر کر گیا تھا ان کی سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا۔ اگلے چند لمحے تو وہ بونقوں کی طرح صحن میں ہی کھڑی سوچتی رہیں پھر زیتون خالہ کی آواز ان کو چونکا گئی۔

"مجھے تو کچھ سجھائی نہیں دیتا عذرا۔ تم ہی بتاؤ۔ سدرہ کے سسرال سے کوئی خبر نہیں آرہی نکاح کو پانچواں سال ہے جانے شادی کا کیا ہوگا۔ مشورہ دو مجھے کیا بات کروں۔"

اماں تو اپنی ہی ادھیڑ بن میں تھیں خاموشی سے ان کو دیکھی گئیں۔ ان کے دوبارہ بلانے پر ہڑبڑا کر بولیں۔

"آں ہاں۔ چلو اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

بڑی آپا نے دوسری عجیب حرکت یہ کی کہ زیتون خالہ کے لیے جو چائے بنانے باورچی خانے گئیں تو نکلنے کا نام نہیں لیا۔ اماں کی بڑی بنی ہوئی تین چار بار آوازیں دے کر خود ہی تلملا کر اٹھیں اور باورچی خانے میں آکر سر پیٹ لیا۔ بڑی آپا تو باورچی خانے میں زمین پر بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھیں چولہا جل رہا تھا چائے کی پتیلی سلیب پر یوں ہی دھری تھی۔ چینی پتی کے ڈبے کھلے پڑے تھے۔

"تمہیں چائے بنانے کا کہا تھا۔ یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو تم۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں۔"

بڑی آپا نے سر اٹھایا کچھ بولیں نہیں بڑی بڑی آنکھوں سے بس اماں کو دیکھتی ہی گئیں۔ چولہے میں جلتی آگ سے زیادہ لو دے رہی تھیں ان کی آنکھیں۔ اماں نے دیکھا تو دیکھتی رہ گئیں۔ یوں بھی بڑی آپا کے دلکش چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں ان کی آنکھیں ہی تھیں۔

"کیا بات ہے بیٹا۔ پریشان لگ رہی ہو۔ کچھ برا لگا تم کو۔"

بڑی آپا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور عجیب سے انداز میں بولیں۔

"اس نے کہا تھا کہ یہاں بیٹھو میرے پاس۔"

اماں دہل کر رہ گئیں "آئے ہائے کیا اول فول بکے جا تی ہو۔ کس نے کہا تھا۔ کون ہے یہاں۔ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔"

بڑی آپا نے اس طرح دیکھا جیسے ان کو اماں کے بچپنے اور لاعلمی پر حیرت ہوئی ہو مسکراتے ہوئے اماں کو دیکھا اور پھر نظریں پھیر لیں اور آہستگی سے باہر نکل گئیں۔ اماں نے دیکھا آج تو بڑی آپا کی چال ہی الگ تھی۔ موقع اب بھی ایسا نہیں تھا کہ بات کو طول دیتیں اندر بیٹھیں زیتون خالہ کا نیٹ ورک بہت وسیع تھا آن کی آن میں بات سارے محلے میں پھر جاتی اماں بدنامی سے زیادہ اس بات سے ڈرتی تھیں کہ بات اگر بڑی آپا کے سسرال جا پہنچی تو معاملہ کچھ کا کچھ ہو جائے گا۔

ابھی تین مہینے پہلے ہی تو ہوئی تھی شادی اور پہلے ہی مہینے میں شوہر اس کو واپس چھوڑ گیا تھا جانے کیا بات ہوئی تھی بڑی آپا کچھ کہتی نہیں اور شوہر کچھ اور ساس کی تو خیر زبان کو ویسے ہی آرام نہیں تھا۔ ان کی کہانیاں ہی سب سے الگ ہوتی تھیں ہاتھ نچا نچا کر بولی تھیں۔

"لڑکی تیار نہیں تھی شادی کے لئے تو کی کیوں۔ اب ظاہر ہے بیاہ کر لایا ہے میرا بیٹا۔ بہن بنا کر تو نہیں رکھ سکتا ناں۔"

اماں تو شرم سے پانی پانی ہو گئیں ابا سے بھی بات کی تو ابا کی حالت بھی اماں سے کم مختلف نہ رہی۔ اس کے علاوہ کیا کہہ سکتے تھے کہ "اس کو سمجھاؤ عذرا میں تو بات کر ہی نہیں سکتا۔"

اماں کیا سمجھاتی کسی کے سمجھانے سے کچھ ہوتا ہے کیا۔ بات تو اندر سے اٹھتی ہے بڑی آپا کے نہیں اٹھنی تھی سو نہیں اٹھی اور پھر دبتی ہی چلی گئی۔ چوتھا مہینہ لگ گیا تھا سسرال والے تو سمجھو بھول ہی بیٹھے تھے اماں نے مشہور کر دیا کہ "حسن خیر سے دبئی چلا گیا ہے اس لئے یہاں چھوڑ گیا ہے اس کو۔"

چار دن چہ میگوئیاں ہوئیں اور پھر زبانوں نے ذائقہ بدل لیا۔ پر اب اماں کو لگتا تھا۔ بات دبنے کی نہیں ہے رات میں شوہر گھر آیا تو اس کے سر ہولیں۔

"مجھے تو ڈر لگتا ہے اس کی آنکھوں سے۔ کچھ کریں جمیل صاحب دکھائیں کسی کو۔ کہیں اوپر کی کوئی چیز تو نہیں۔"

جمیل صاحب بھی اماں کی طرح کم اعتقاد والے تھے دونوں نے آدھی رات تک بات کی اور صبح جلدی جلدی ناشتہ کر کے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور کسی عامل سے جا ملے ساری بات ان کے گوش گزار دی عامل نے کچھ پڑھ وڑھ کر پانی دیا ابا لے آئے گھر آئے تو اماں کے پیروں میں بلیاں بندھی تھیں سارے گھر میں چکراتی پھرتی تھیں۔

"صبح سے کمرے میں بند ہے۔ جتنی بار بھی گئی ہوں بیٹھی باتیں کر رہی ہے دبی دبی زبان میں۔ مجھ سے تو کچھ نہیں بولتی نہ سنتی ہے نہ جواب دیتی ہے۔ کیا کہا عامل بابا نے؟"

ابا تھکے تھکے سے انداز میں صوفے پر ڈھے سے گئے تھے۔

"اس کے ساتھ جن ہے۔ شادی سے پہلے سے ہے۔ یہ پانی دیا ہے بابا نے۔ پلانا ہے اس کو۔ اللہ کرم کرے گا۔"

بڑی آپا کو پانی دیا تو پہلے تو ٹکٹکی باندھ کر پانی کو دیکھتی رہیں پھر ایک جھٹکے سے بوتل اٹھا کر غٹا غٹ پی گئیں آنکھیں وحشت سے ابل پڑیں اور عجیب سی آواز میں بولیں۔

"پی لیا اب تم لوگ جاؤ۔ مجھے تنگ مت کرو۔ جاؤ یہاں سے مجھے آرام کرنا ہے۔"

اماں ابا پہلے ہی خوفزدہ تھے فوراً باہر چلے گئے تھے ابا نے اماں کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ چھوٹی کو کچھ مت پتا چلے وہ سسرال میں پریشان ہو گی۔ کیا جواب دے گی وہاں اس کی اور بڑی آپا کی شادی ایک ساتھ ہی ہوئی تھی۔ اور نعمان بھائی کو اماں خود نہیں بتانا چاہتی تھیں مر مر کے تو ان کی اسلام آباد میں نوکری لگی تھی۔ بہن بھائیوں کے پیار سے واقف تھیں۔ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ نوکری چھوڑ کر آ جائے۔

بڑی آپا کی آنکھوں کی آگ بابا جی کا پانی پی گئی تھی۔ کچھ اثر نہ ہوا۔

تعویز گنڈے جھاڑ پھونک سب کروایا گیا۔ چلے بھی کٹے پر نہ گئی تو بڑی آپا پر سے یہ مصیبت نہ گئی۔

چھ سات ماہ ہو گئے تھے بڑی آپا کی حالت سمجھنے میں ہی نہ آتی تھی بلکہ مزید خراب ہونے لگی تھی کبھی کہتی کہ کمرے سے بدبو آتی ہے اور سرف ڈال کر پورا کمرا دھوتے دھوتے شام کر دیتیں کبھی ہر گھنٹے بعد نہانے گھس جاتیں اور کبھی دس دس دن تک پانی کو ہاتھ نہ لگاتیں۔ اب تو سر میں جوئیں پڑ گئی تھیں جسم سے بدبو آتی تھی۔ آنکھیں اندر جا دھنسی تھیں ہفتوں کچھ نہ کھاتی تھیں اور جو کبھی کھانے بیٹھتی تو سات سات روٹیاں ڈکار جاتیں۔ کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔

اماں نے کوشش تو بہت کی مگر بات چھپی نہ رہی چھوٹی کے سسرال والے بھی آئے اور نعمان بھائی بھی ہفتہ رہ کر چلے گئے۔ محلے والے آ آ کر اب آنا چھوڑ گئے تھے رہ گئی غریب اماں، ابا، بڑی آپا اور ان کا جن لگتا تھا جن تو عاشق ہے ہی بڑی آپا بھی کم عاشق نہ تھیں اس پر۔ اب تو راتوں کو اٹھ اٹھ کر سنگھار کرنے لگی تھیں سرخی پوڈر لگا کر بدن کو خوشبوؤں میں رچا کر کمرا بند کرا بیٹھتی صبح نئی نویلی دلہن کی طرح شرماتی پھرتیں اماں اور ابا نے کوششیں تیز کر دیں۔

کوئی بنگالی بابا تھا ہر جمعرات کو گھر آنے لگا اماں بے چاری تو پاگل ہی ہو گئی تھیں بنگالی بابا نے خوب نوٹ کمائے اور نتیجہ کچھ نہیں پھر انہوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ بڑی آپا کی آنکھوں کی وحشت اب پورے گھر میں پھیل چکی تھی سناٹے راج کرنے لگے۔ ابا اماں آپس میں اب بس آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کیا کرتے تھے۔ بڑی آپ تو گویا دنیا جہان سے بے خبر ہو گئیں تھیں۔ ان کو نہ آواز سنائی دیتی تھی نہ سناتا ہولاتا تھا۔

پھر ایک دن ساس آن دھمکی اور بڑی آپا کو دیکھ کر ڈر ہی گئیں۔۔۔ اماں نے بہت کوشش کی تھی کہ بڑی آپا سامنے نہ آئیں لیکن وہ آ گئیں اور وہ واویلا مچایا کہ خدا کی پناہ۔۔۔ گندی گالیاں، طعنے کوسنے اور جانے کیا کیا جو منہ میں آتا تھا بکی جاتی تھی ایک ہی رٹ تھی کہ یہ مجھے کیوں لینے آئی ہے میں اس عورت کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ ساس بے چاری صحن میں بیٹھی کانپ کانپ کر رو رہی تھی۔ اماں نے زندگی میں شاید پہلی بار ہی بڑی آپا پر ہاتھ اٹھایا تھا اور ساس کے آگے ہاتھ پیر جوڑ کر بات سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کہاں سننے کو تیار تھیں اٹھ کر چلی گئیں۔ اگلے دن طلاق نامہ آ گیا۔

گھر پر تو موت کا سا سماں تھا پر بڑی آپا۔ ان سب باتوں سے بے خبر ایک طرف بیٹھی گنگناتی رہیں اور اسی شام انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ ماں بننے والی ہیں۔ ابا نے تو ڈنڈا اٹھا لیا اور مار مار ان کا بھرکس نکال دیا اماں بے چاری بے ہوش ہوئی جاتی تھیں کہ اس بے چاری کا کوئی قصور نہیں پر قصور تو ابا کا بھی نہیں تھا سال بھر سے بغیر شوہر کے یہاں بیٹھی بیٹی نے حاملہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا وہ بھی کیا کرتے۔

اس مار پیٹ نے بڑی آپا پر بہت اثر ڈالا تھا۔ وہ سب سے خائف ہو گئی تھیں کھانے میں ان کو لگتا کہ اماں نے زہر ملایا ہے۔ پانی میں ان کو کتے بھونکتے دکھائی دینے لگے۔ شروع میں کپڑے پھاڑنے لگیں اور پھر الف ننگی ہو کر کمرے میں ناچنے لگیں ابا تو اب بس بیٹھک میں ہی رہتے تھے بھوک پیاس اڑ گئی تھی دونوں کی کسی عالم کو بھی بلانے سے رہے۔

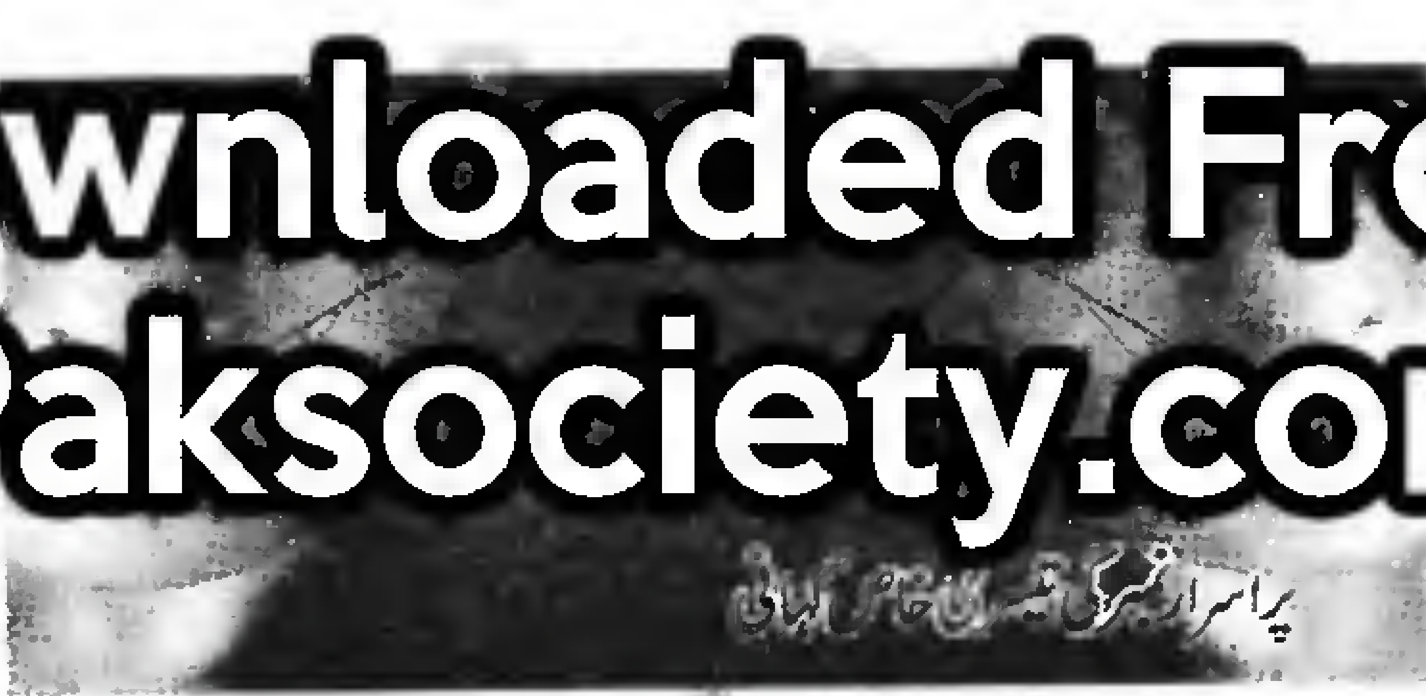
اٹھتے بیٹھتے ماں باپ بڑی آپا کے مرنے کی دعائیں مانگتے تھے مگر دعائیں بھی اثر کھو چکی تھیں بڑی آپا ایک معمہ بن چکی تھیں۔ جن تو بڑا ہی بے غیرت تھا اچھی خاصی نیک اور شریف لڑکی کو تماشہ بنا دیا تھا۔

نعمان بھائی اس مرتبہ چھٹی لے کر آئے تو ان کے ساتھ ایک خاتون بھی تھیں۔ اماں نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ عاملہ ہیں بڑی آپا کا علاج کریں گی۔

عاملہ نے تین چار گھنٹوں کے بعد ہی بڑی آپا کے جن کا راز کھول دیا تھا۔

بڑی آپا پر عاشق جن کا نام "شیزوفیرینیا" تھا۔

☆☆......☆☆



سہیلی

رضیہ مہدی

گھر میں ٹیلی فون کٹے تو عرصہ ہوا تو پھر ماکن ٹیلی فون پر اپنی کس سہیلی سے بات کرتی تھیں

وہ بہت دیر سے اپنی پرانی ڈائری الٹ پلٹ رہی تھیں جس میں وہ ٹیلی فون نمبر لکھتی تھیں۔ ایک لمبی پتلی سی ڈائری پتا نہیں کس نے بیگم وقارالنساء کو تحفے میں دی تھی، بیگم وقارالنساء...... وہ یاد کرکے ہنسنے لگیں۔ کیا دن تھے وہ کہاں گئیں وہ، جن کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے لوگ سوچتے تھے۔ پھر ڈائری یاد آ گئی کس نے دی تھی ارے حافظے کو کیا آواز دیتا وہ تو کب کا خدا حافظ کہہ کر رخصت پر جا چکا ہمیشہ کے لیے۔

وہ ڈائری پر جھک گئیں اور پھر پورے استغراق سے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ وہ پرانے نمبروں کو کاٹ رہی تھیں جن سے مدتوں سے رابطہ نہ ہوا تھا اور ان کی گود میں دھرا ٹیلی فون سیٹ ایسا تھا جیسے کوئی پیارا بچہ، وہ اسے سمیٹے بیٹھی تھیں۔ موبائل فون اور انٹرنیٹ سے تو ان کا کبھی دوستی کا ساتھ ہوا نہیں بلکہ انہوں نے ہاتھ لگانا ہی پسند نہ کیا۔ کسی نے اصرار بھی نہ کیا۔ اصرار...... وہ ہنس پڑیں اب کہاں تھے ان سے کسی بات کے لیے اصرار کرنے والے۔ اب لے دے کر یہ فون ہی تو تھا ان کی تنہائی کا ساتھی۔

وہ نمبر کاٹتے کاٹتے آخری نمبر پر چونک سی گئیں۔ ''تبسم، تبسم کا نمبر مگر وہ تو شاید...... مگر وہ تو شاید......'' ماسی پوچا لگاتے لگاتے چونک سی پڑی۔ انہوں نے شاید نمبر ملا لیا تھا ان کے چہرے پر پھیلے اضطراب نے ماسی کو چونکا دیا۔

ماسی یک ٹک ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ عجیب سی مسکراہٹ جیسے کوئی تکلیف میں ہو اور درد کے ساتھ مسکرانے کی کوشش کر رہا ہو پھر انہوں نے ریسیور کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر زور سے چیخیں۔

''تبسم! تبسم!!'' ماسی نے اپنا کام چھوڑ دیا اور ان کے بیڈ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''تم ٹھیک ہو ناں۔ تمہارا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا ناں۔ میرا مطلب تھا تم تو......'' وہ جیسے سانس کو کھینچ رہی تھیں۔

''میرا مطلب ہے تم بات کر سکتی ہو۔ تبسم تم نے رابطہ کیوں چھوڑ دیا مجھ سے۔'' وہ بلک رہی تھیں۔

''میں تو بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ تم تو جانتی ہو میرا کوئی نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں۔''

ماسی کو ان کی بات اچھی نہیں لگی ماشاء اللہ دو دو بیٹے، بہویں، پوتے، پوتیاں بھرا پرا گھر، پھر وہ سوچنے لگی مگر بات تو ان کی ٹھیک ہے۔ اس کی آنکھ بھی بھر آئی۔

وہ یاد کرنے لگی کچھ دن پہلے کی بات ہے یا شاید کچھ مہینے پہلے کی۔ بہرحال وہ دو میاں بیوی تھے جو یہ گھر ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے۔ باجی سے شاید دس پندرہ سال قبل انہوں نے ملیر کا کوئی مکان خریدا تھا۔ اب کے ڈی اے نے کہا تھا کہ اپنے نام کروانے یا پتا نہیں کیا کروانے کے لیے انہیں باجی کا ایک دستخط چاہیے۔ وہ بہت ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے گلشن اقبال اور باجی کے لان سے گزر کر سامنے ہی تو باجی کا پورشن تھا۔ ماسی ہی تو انہیں یہاں لائی تھی۔ باجی اس وقت کچن میں روٹیاں پکا رہی تھیں۔ تب باجی اپنا کھانا خود پکاتی تھیں۔ اب کہاں..... اب تو جب اوپر والوں کو یاد آتا ہے بھیج دیتے ہیں۔ باجی کا دل چاہتا ہے کچھ کھا لیتی ہیں ورنہ بھر میں لے لیتی ہوں ان کا حصہ بھی، کیا کروں۔ وہ دونوں پریشان ہوتے رہے۔ باجی نے دو روٹیاں بھی اتنی دیر میں پکائیں کہ وہ دونوں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے اتنا سا کمرہ اور کچن اور یہ بھی سی ذرا سی جگہ بیٹھنے کی پندرہ سال پہلے یہ کالج سے ریٹائر ہوئی تھیں پرنسپل تھیں۔ میاں سعودی عرب سے آئے تھے کیا کمرہ تھا ان کا، نوکر تھے، وقت ہائے وقت..... باجی روکتی رہیں کھانا کھا کر جائیں مگر بے چارے جلدی ہے بس آپ سائن کر دیں..... کروا کر چلے گئے۔ ماسی ہی گیٹ بند کرنے گئی تو ان کی بیگم نے پوچھا۔ ان کے دو بیٹے تھے ناں۔ وہ کہاں ہیں ماسی کو یاد آیا اس نے بتایا تھا کہ وہ اوپر رہتے ہیں۔ دو پورشن کر لیے ہیں۔ وہ دونوں جلدی سے نکل گئے۔ پھر وہ سوچنے لگی پتا نہیں۔ یہ تبسم کون ہیں روز شام کو ان سے فون پر باجی بات کرتی ہیں۔ خوش رہتی ہیں بتاتی ہیں رات کو آرام سے سو بھی جاتی ہیں۔ وہ بھی کبھی باتیں سنتی تھی۔

''اور تبسم تمہاری وہ ہنسی کہاں گئی۔ ہاں یار سبھی کچھ وقت کی گرد میں کھو جاتا ہے۔ میں بھی ویسی کہاں ہوں۔ ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو نصیحت خانم بن گئی ہوں اور کوئی کیوں میری نصیحتوں کو جھیلے کس کے پاس وقت ہے۔ پتا ہے تبسم میری امی ایک ایک کے بعد سن اور



سمجھ تو سکتی تھیں بول نہیں سکتی تھیں۔ میں ان سے کہتی تھی خوش رہا کیجیے کہ نصیب ور ہیں آپ۔ نہ بولنا بھی خدا کی نعمت ہے۔ باتیں، عمل برے لگیں تو انسان کلبلاتا ہے اور اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد اپنی عمر بھر کی کمائی کی اصلاح کی کوشش ضرور کرتا ہے اور بول پڑتا ہے۔ بس یہی غضب ہے۔ برداشت نہیں ہوتا۔ اب آپ نہیں بول پاتیں چاہ کر بھی تو برداشت کر جاتی ہیں، مجھے دیکھیں نا ڈھنگ سے سنائی دے نہ دکھائی دے مگر جو زبان عمر بھر آرام سے پڑی سوتی رہی اب وہ جاگی ہے تو جیسے عمر بھر کی چپ کی سزا دے رہی ہے سب کو۔ کون برداشت کرے اس کو۔"

پھر جو رونا شروع کیا تو ماسی گھبرا کر پھر بیڈ سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر میں یوں لگا شاید وہاں سے تسلی ملی اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔

"اچھا تم نہ رو۔ لو میں اپنے آنسو پونچھ رہی ہوں۔ اچھا نہ، پانی پی رہی ہیں بس اب تم بھی چپ ہو۔"

ایک دن بات کر کے خوش خوش دکھائی دیں۔ ماسی کی ہمت بڑھی پوچھ بیٹھی۔

"باجی یہ تبسم باجی کون ہیں۔"

"ہیں..... آں ہاں۔" وہ چونک سی گئیں پھر مسکرا کر بتانے لگیں۔

"ہم دونوں اسکول میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ بڑی مزے دار دوستی تھی ہماری حالانکہ شکل و صورت، عادات، اطوار، مزاج حتیٰ کہ زبان تک میں فرق تھا۔ میں گول چہرے قدرے سانولے رنگ، موٹی موٹی آنکھوں والی اور ہمیشہ بھرے بھرے جسم کی لڑکی تھی جب کہ ہماری تبسم صاحبہ خوب گوری، لمبی پتلی دبلی تھیں۔ میں کتابوں میں گم اور بقول ان کے زبان بھی گم کر کے بیٹھی رہتی اور وہ شاید زبان کو کبھی آرام دینے کی قائل ہی نہیں تھی اور صرف ہر کھیل میں دلچسپی تھی بس کتابوں میں دلچسپی بالکل نہیں تھی۔ میں کلاس میں پہلی پوزیشن سنبھالے بیٹھی رہتیں اور وہ میری کاپیوں کو امتحانات میں نے کر رٹنے لگاتی۔ میں ایسی اردو بولتی جس کو کلاس کی لڑکیاں گاڑھی اردو کہتیں اور وہ ایسی کہ پنجابی میں کہیں کہیں اردو کا کوئی جملہ یا صرف لفظ ہی آجاتا مگر ہم آپس میں مگن تھے۔ پھر کچھ یوں ہونے لگا کہ میں گھر میں کچھ ایسے بولنے لگی کہ میرے دادا ڈانٹنے لگے۔

بیٹی یہ آپ کس طرح کی زبان بول رہی ہیں۔ اچھا ہے کہ آپ کی دوست پنجابی ہیں ان سے ان کی زبان سیکھیے۔ بابا بلھے شاہ کی زبان، وارث شاہ کی زبان اور انہیں اپنی سکھایئے مگر یوں نہیں۔" ہائے بے چارے میرے دادا انہیں کہاں پتا چلا کہ نہ وہ، وہ رہی نا میں، میں رہی۔ ہم دونوں کراچی کی زبان بولنے لگے جس میں پھڈا بھی ہوتا ہے۔" وہ زور سے ہنسنے لگیں۔

"خیر سب ٹھیک چلتا رہا پھر ہم یونیورسٹی پہنچ گئے۔ ہماری دنیا الگ الگ ہو گئی مگر دل ایک ہی رہے۔" وہ ایسی کھوئی رہیں کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوئی کہ ماسی کب کی اٹھ کر جا چکی ہے۔

☆.....☆

پھر وہ اچانک بہت بیمار ہو گئیں۔ ماسی صبح آئی تو وہ آدھی بیڈ پر تھیں اور آدھی زمین پر، اتفاق سے اتوار تھا۔ وہ تیزی سے اوپر دوڑی، دونوں پورشن میں ناشتا ہو رہا تھا۔ بیگمات نے ترچھی نظر سے دیکھا۔

"ارے ہم کر لیتے تو بھیج بھی دیتے۔" مگر وہ اتنی بوکھلائی تھی کہ ان پر توجہ دیے بغیر بیٹوں سے مخاطب ہوئی۔

"بھائی! باجی....."

"کیا بات ہے۔" بیگمات نے پھر غصے سے کہا۔

"نیچے باجی بے ہوش پڑی ہیں۔" اب دونوں بیٹے نیچے دوڑے۔

اسپتال گئیں۔ دو دن موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہیں۔ وہاں بھی کون ساتھ رہتا۔ اس سے پہلے کہ پریشان ہوا جاتا ماسی نے خود اپنی خدمات پیش کر دیں۔ سب کو سکون ہوا اور پھر دو دنوں بعد وقار النساء بیگم بڑے وقار اور سکون سے ابدی سکون کی طرف چل دیں۔ ایمبولینس گھر آ گئی۔

دونوں سلیقہ شعار بہوئیں اس سے پہلے ہی لان اور اطراف میں اگربتیاں جلوا چکی تھیں۔ دریاں اور

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

سفید چاندنیاں، بچھی ہوئی تھیں۔ لوگ پارے پڑھ رہے تھے۔ بہوئیں خود بھی سوگواری آ کر بیٹھی تھیں۔ تھوڑی سی دیر میں پڑوسی اور اعزاء آنے لگے۔ وہ پھر سے رونے لگیں۔ وہ رو رہی تھیں۔ آنسو رک نہیں رہے تھے۔ ماں جیسی ہی جانا اب ان کا دنیا سے جانا شاک تھا۔ کوئی بزرگ خاتون سمجھا رہی تھیں۔

''بہت خدمت کی تم لوگوں نے، قسمت کی دھنی تھیں، میاں چاہنے والا تھا، بیٹے تابعدار رہے، بہوئیں خدمت گزار ملیں۔''

کوئی خاتون سب کو چنے پڑھنے کی طرف بلا رہی تھی۔

''آئیے رونے سے بہتر ہے زیادہ سے زیادہ مرحومہ کو پڑھ کر بھیجیے اس میں زیادہ ثواب ہے۔'' تدفین کا انتظام ہو رہا تھا۔ گھر اتنا بڑا تھا۔ کس چیز کی تھی۔ پڑوسیوں کے پاس سے چائے آ گئی تھی۔ صبح سے رونا دھونا ہو رہا تھا۔ بے چارے وارثین کے چہرے زرد ہو رہے تھے۔ پیارے کی محبت میں مرنے کا جی چاہتا ہے۔ ''امی امی۔'' بہوئیں دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔ عورتیں ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں۔

''بیٹی نہیں تھی مگر ایسی بہوئیں بیٹی سے کم ہوتی ہیں کیا۔''

ایسے میں ایک لموزین دروازے پر آ کر رکی۔ گھر کا بڑا سا گیٹ ایک چرچراہٹ آواز کے ساتھ خود پورا کھلتا چلا گیا۔ پیچھے والی گاڑی سے کچھ گارڈ ٹائپ لوگ اترے اور انہوں نے دونوں طرف کا راستہ روک لیا۔ لموزین کا دروازہ کھولا اور اس پر ایک ویل چیئر لگائی گئی۔ پھر ماحول پر جیسے ایک عجیب سا سکوت طاری ہو گیا۔ کوئی جادو کی چھڑی پھر گئی۔ وہ حور تھی، پری تھی یا کوئی اور آسمانی مخلوق جو سفید سایا سا تھی۔ سر سے پیر تک سفید لباس میں جب کہ اس نے چہرے پر نقاب بھی سفید لگائی تھی پر چہرے سے ایک روشنی سی نکل رہی تھی۔ جو ویل چیئر گھسیٹ کر رو رہی تھی وہ شاید ملازمہ تھی۔ سب چونک گئے مگر بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔

''یہ کون ہے؟''

''تبسم صاحبہ محترمہ وقار النساء بیگم کو رخصت کرنے آئی ہیں۔''

''تبسم! کون تبسم؟'' آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا جا رہا تھا آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال و جواب ہو رہے تھے۔ ماسی پیچھے کھڑی تھی اور وہی تھی جو واقعی آنسو گرا رہی تھی۔ سچے آنسو۔ وہ چونکی۔ اسے یاد آیا اپنی مالکن کی بات۔

تبسم تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تو ٹانگ میں چوٹ آگئی تھی۔''

وہ پھر جیسے دوڑی اور آگے آگئی۔ بہوئیں چونکیں پاگل ہوگئی ہے۔ پھولی ہوئی سانس میں بولی۔

''آپ تبسم ہیں...... آپ تبسم ہیں۔ باجی نے آپ کو بہت یاد کیا۔ وہ بے ہوشی میں بھی بس آپ کو ہی پکار رہی تھیں۔'' وہ رونے لگیں۔

''ہم بھی اسی لیے تو آئے ہیں۔''

ماسی قریب آنے لگی۔

ملازمہ نے آہستہ سے اسے دور کیا اور کہا جسے صرف ماسی ہی سن سکتی تھی۔

''تمہاری محبت اور محنت کا صلہ تمہیں مل جائے گا۔''

پتا نہیں ماسی نے سنا یا نہیں وہ تو جیسے کرنٹ سے بے ہوش ہوگئی تھی۔

جنازہ تیار ہو چکا تھا۔ وہ ویل چیئر کو وہاں لے گئی۔ لوگ خود بخود ادھر ادھر ہو گئے انہوں نے چہرہ دیکھا اور آہستہ سے خدا حافظ کہا۔

ویل چیئر مڑی اور پھر لوگوں کو لگا کہ شاید پل بھر میں وہ سب کچھ وہاں نہیں تھا جو انہوں نے دیکھا تھا یا شاید نہیں۔ سب لوگ جادو کی چھڑی کے اثر سے باہر آ گئے تھے۔ وہ ماسی سے حساب کتاب لے رہے تھے مگر اسے جو پتا تھا بتا دیا تھا۔

دونوں بہوئیں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے گھر میں لینڈ لائن کہاں تھی۔ انہوں نے تو کب کی کٹوا دی تھی۔ سب کے پاس اپنے موبائل فون تھے۔ سب ہی انٹرنیٹ کے قیدی تھے۔ انہیں اس کی ضرورت کہاں تھی۔ البتہ ماسی نے نوکری چھوڑ دی تھی اسے بھی ضرورت نہیں رہی تھی اسے واقعی بہت کچھ مل گیا تھا۔

☆☆☆

پراسرار نمبر کی چوتھی خاص کہانی

بچ گیا ایمان



افتخار چوہدری

اُس سفلی عامل کا قصہ جو کالے علم کے آخری درجے تک رسائی حاصل کر چکا تھا مگر

ایمان والوں کو خدا کفر کی دلدل سے اس طرح نکالتا ہے کہ عقل بھی دنگ رہ جاتی ہے

''مورکھ اگر اپنی محبت حاصل کرنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں شانے کی ہڈی لانے کا کشٹ تو اٹھانا ہی پڑے گا۔'' لٹاں والی سرکار نے جلالی لہجے میں سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا تو اس کے منہ سے نکلنے والے بدبو کے بھبکے سے میرا دماغ چکرا کر رہ گیا، چاہنے کے باوجود میں ناگواری کا اظہار نہ کر سکا کیونکہ اس کی سرخ آنکھوں میں موجود مقناطیسی کشش نے مجھے اپنے حصار میں لے کر بے بس کیا ہوا تھا۔ میں بنا پلکیں جھپکائے ایک ٹک اسی کی طرف دیکھے جا رہا تھا، کچھ دیر بعد اس نے اچانک اپنی آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے میں چلا گیا، اس کی نظریں ہٹتے ہی مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا اور ایسے محسوس ہوا جیسے میں اس کی قید سے آزاد ہو چکا ہوں اور میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت واپس آ گئی ہے۔

''مگر بابا جی میں شانے کی ہڈی کہاں سے لاؤں گا کیونکہ قصاب جانتے ہیں کہ اس ہڈی پر سفلی اور کالا جادو ہوتا ہے اس لیے وہ ہڈی کو توڑے بنا نہیں چھوڑتے۔'' میں نے منمناتے ہوئے اپنی جان چھڑانے کے لیے عذر تراشا۔

''کلرکی کرتے ہو سارا دن فائلیں اِدھر سے اُدھر کر کے خوب پیسے کماتے ہو تو کیا اپنی محبت کے کارن تم ماس کا وہ پورا ٹکڑا نہیں خرید سکتے جس کے اندر وہ ہڈی ہوتی ہے۔'' اس نے بند آنکھوں سے ہی میری بات کا جواب دیا، میں اس غلیظ بابے کے منہ سے اپنی نوکری کے بابت سن کے مبہوت رہ گیا۔ اب تو مجھے حقیقتاً اس سے خوف آنے لگا تھا، میں زندگی میں پہلی بار اس سے مل رہا تھا مگر وہ میرے بارے میں ہر بات پہلے سے جانتا تھا جیسے وہ مدتوں سے میرا آشنا ہو۔ کچھ دیر مراقبے کی کیفیت میں رہنے کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھول دیں، مسکرانے سے اس کے گہرے پیلے دانت جن پر سیاہی غالب آ چکی تھی نظر آنے لگے۔ اس کی مسکراہٹ میں خباثت نمایاں تھی شاید اس نے بچپن سے بال نہیں کٹوائے تھے جس کی وجہ سے اس کے بال موٹی رسیوں جیسی لٹوں کی صورت اختیار کر چکے تھے، جسم ڈھانپنے کے نام پر جسم کے زیریں حصے پر ایک انتہائی گندے کپڑے کا لنگوٹ بندھا ہوا تھا جو اپنا اصل



رنگ اور پرنٹ تو نہ جانے کب کا کھو چکا تھا اب تو وہ محض ایک چیتھڑے سے مشابہہ تھا جو کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا، اور عریانی کو چھپانے کی بجائے مزید عیاں کر رہا تھا اس پراسرار شخصیت کے جسم پر گوشت نام کو بھی نہیں تھا اسے دیکھ کر بدھ مت کے بانی گرینڈ بودھا کا وہ مجسمہ ذہن میں ابھر رہا تھا جس میں وہ اکثر سمادھی جمائے بیٹھا ہوتا ہے، اس مجسمے کی طرح اس بابے کی جسمانی ہڈیوں پر بھی گوشت کی بجائے محض چمڑا چڑھا ہوا نظر آ رہا تھا، تمام پسلیاں اور ہڈیاں علیحدہ علیحدہ گنی جا سکتی تھیں، مجموعی طور پر وہ ایک کراہیت آمیز بوڑھا شخص تھا جو غذائی کمی کا شکار نظر آ رہا تھا، نجانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے فوزیہ کی باتوں میں آ کر یہاں آنے کی حامی بھری تھی فوزیہ میری پڑوسن اور بچپن کی محبت تھی ہم شادی کرنا چاہتے تھے مگر اس کی فیملی اپنے خاندانی اقدار اور کئی مجبوریوں کی وجہ سے کسی بھی صورت میں اسے میری دلہن بنانے پر راضی نہیں تھے، میں ہر ممکن کوشش کر چکا تھا مگر دال گلتی نظر نہیں آ رہی تھی، دو بار میرے والدین رشتہ مانگنے کے نام پر ان کے گھر سے بے عزت کر کے نکالے جا چکے تھے، دوسری بار تو میں خود بھی انہیں فوزیہ کے گھر بھیجنے کے حق میں نہیں تھا مگر فوزیہ نے مجھے پکا یقین دلایا تھا کہ اس بار اس کے گھر والے رشتہ دے دیں گے، جب میں نے امی ابو کو ایک بار پھر فوزیہ کے گھر جانے کے لیے کہا تو وہ ہتھے سے ہی اکھڑ گئے تھے، پھر میں نے خودکشی کی دھمکی دی تو انہیں میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے، لیکن پہلے کی طرح اس بار بھی میرے فرشتہ صفت والدین کو بے عزت کر کے نکالا گیا تو میں واقعی شرم کے مارے سنجیدگی سے خودکشی کے بارے میں سوچنے لگا، میں فوزیہ کی محبت میں تمام حدیں پھلانگ چکا تھا اسی لیے تو بات میرے والدین کی ہتک تک آ پہنچی تھی اس سانحے کے بعد میں حتمی طور پر فیصلہ کیے بیٹھا تھا کہ اب کبھی اس دشمن جاں کی شکل تک نہیں دیکھوں گا، مگر دوسرے دن ہی اس نے

میرے سیل فون پر میسج بھیجا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے کوئی ضروری بات کرنی ہے، تو میرے خود کا کیا ہوا فیصلہ تنکوں کی طرح ہوا میں بکھر کر رہ گیا، ہمارے گھر کی چھت ان کی چھت سے ملحق تھی ہماری اکثر ملاقاتیں وہیں ہوا کرتی تھیں، میں اس کے بتائے ہوئے وقت پر وہاں پہنچ گیا، وہ پہلے سے ہی چھت پر موجود تھی۔

''اب کیوں بلوایا ہے کیا ابھی ہماری عزت افزائی میں کوئی کسر رہ گئی ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں بے رخی سے کہا، تو مجھے محسوس ہوا جیسے آج سے پہلے میں اتنے غصے میں کبھی نہیں آیا ہوں گا۔

''اوہو جناب ابھی تک غصے میں ہیں، اوکے یار سوری اور وہ بھی کان پکڑ کر۔'' فوزیہ نے مسکین سی صورت بنا کر اپنے کان پکڑتے ہوئے کہا، تو غصے کی وجہ سے میری رگوں میں بہتا ہوا خون جو تیز رفتاری کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا یکدم سرد ہونے لگا اور اس کی رفتار بھی کم ہونا شروع ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ہی دل پر رکھی ہوئی سرد مہری کی سل جیسے تیزی سے پگھلنے لگی۔

''مجھے خود ای نے تمہارے گھر والوں کو دوبارہ بلوانے کے لیے کہا تھا مگر پھر آخری لمحوں میں ایک بہت امیر شخص کا میرے لیے رشتہ آیا تو سب کچھ الٹ ہو گیا۔'' فوزیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں صفائی دی تو میرا دل اس کی طرف سے صاف ہو گیا اور میں اپنے والدین کی بے عزتی بھول کر ایک بار پھر پسیج گیا۔

''اوکے ٹھیک ہے مان لیتا ہوں کہ تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا تو وہ کھل اٹھی۔ ''میں نے آج تک تمہاری کوئی بات رد نہیں کی کیا تم ہماری محبت کی خاطر میری ایک بات بھی نہیں مان سکتی ہو۔'' میں نے جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا، تو اس نے اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔

''نزاکت ایسا کیوں کہہ رہے ہو تم حکم تو کرو، میری جان بھی تمہارے لیے حاضر ہے۔'' فوزیہ نے مجھ سے بھی زیادہ جذباتی زبان استعمال کی تو مجھے لگا جیسے ابھی الفاظ میرے منہ میں ہوں گے اور وہ میری بات مان کر میرے ساتھ چل پڑے گی۔

''چلو کورٹ میرج کر لیتے ہیں یقین مانو چند دن میں ہی سب راضی ہو جائیں گے۔ میں سب سنبھال لوں گا پلیز مجھ پر ایک بار اعتماد کرو۔'' آخر کار میں اپنے دل کی بات زبان پر لے ہی آیا، میری بات سن کر اسے ایسے جھٹکا لگا جیسے اس کا ہاتھ برقی رو سے چھو گیا ہو۔

''میرے والدین کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ وہ شرم سے ہی مر جائیں گے۔'' اس نے روہانسی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''ہاں میرے والدین ہی شرم پروف ہیں جو تمہارے گھر والوں سے وو دو بار بے عزت ہونے کے باوجود ڈھٹائی سے زندہ ہیں۔ جاؤ بی بی جاؤ اپنے والدین کی عزت کو سنبھالو کسی نے ہمیں یہاں اکٹھے دیکھ لیا تو تمہارے گھر والوں کی عزت مٹی میں مل جائے گی اور پھر انہیں شرم سے مرنا پڑ جائے گا۔'' میں نے غصے سے ابلتے ہوئے لہجے میں کہا اور واپسی کے لئے پلٹ آیا۔

''نزاکت سنو، سنو تو پلیز سنو۔'' فوزیہ نے عقب سے مجھے کئی بار پکارا مگر میں نہیں رکا تو وہ دونوں چھتوں کے درمیان موجود پانچ فٹ کی دیوار کو ایک ہی جست میں پھلانگ کر ہماری چھت پر آگئی اور مجھے پیچھے سے ہی جپھی ڈال کر کھڑی ہو گئی، میرا نامراد دل ایک بار پھر سے امید و ناامیدی کے درمیان ڈولنے لگا۔

''نہ تمہارے گھر والے مانتے ہیں اور نہ تم میری بات مان رہی ہو تو اس طرح چھپ چھپ کر ملنے کا کوئی مقصد باقی نہیں رہ جاتا۔'' میں نے بے بسی کی کیفیت میں جھنجلاتے ہوئے کہا۔

''اگر تم اپنے غصے کو کنٹرول کر کے ٹھنڈے دل سے میری بات سنو تو ہو سکتا ہے اس مسئلے کا کوئی حل نکل ہی آئے۔'' اس نے نرم و ملائم لہجے میں کہا۔

''بتاؤ اگر تمہارے پاس کوئی قابل عمل حل ہے تو۔'' میں نے ایک گہری سانس لیکر خود کو نارمل کرتے

ہوئے کہا، اور اپنے بیٹے پر سے اس کے بازوؤں کا حلقہ کھول کر اس کی طرف گھوم گیا۔

''میری سہیلی نے ایک بہت ہی کرنی والے بزرگ لِطاں والی سرکار کے بارے میں بتایا ہے جو شہر کے مضافات میں دریا کے کنارے ایک جھونپڑی میں رہتے ہیں، وہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں، تم اگر ان کی خدمت میں حاضری دو تو ہمارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے، پلیز انکار مت کرنا۔'' اس نے ہاتھ جوڑ کر میری منت کرتے ہوئے کہا۔ میں ایسے دو نمبری بابوں کے سخت خلاف تھا، اس لیے میرے ذہن نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا، مگر فوزیہ نے اپنی سہیلی کی زبانی اس کرنی والے بابے کی کرامات کے ایسے نقشے کھینچے کہ مجھ جیسا حقیقت پسند انسان بھی سبز باغ دیکھنے پر مجبور ہو گیا، اور اگلے دن ہی میں آفس سے چھٹی کر کے اس بابے کو ڈھونڈتا ہوا دریا کے پاس ویران جنگل میں پہنچ گیا۔

☆......☆

اب اس منحوس بابے نے میرے بتائے بغیر ہی میری ساری پریشانی مجھے بتا دی جس سے میں بہت متاثر بھی ہو گیا، اب بابا کام کرنے کی حامی تو بھر رہا تھا مگر مجھے کسی جانور کے شانے کی ہڈی اور سات عدد لیموں لانے کا کہہ رہا تھا جبکہ میں تو یہی سوچ کر آیا تھا، کہ بابا مجھے کوئی تعویز وغیرہ بنا کر دے گا، یا پھر کوئی چلہ کر کے میرا کام کر دے گا، اب مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق حامی بھرنی پڑی۔

''ٹھیک ہے بابا جی، میں ہڈی اور لیموں لے آؤں گا، مگر آپ کی فیس کیا ہوگی۔''

بالآخر میں نے وہ بات کی جس سے اسے دلچسپی ہو سکتی تھی۔

''میں تم سے کچھ نہیں لوں گا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا، تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، کہ وہ واقعی کہہ رہا تھا، کہ فیس نہیں لوں گا۔

''بابا جی میں سمجھا نہیں۔'' میں نے بے اعتباری سے پوچھا۔

''میں تم سے کوئی روپیہ پیسہ نہیں لوں گا، ہاں اگر تم مجھے کچھ دینا ہی چاہتے ہو تو، جب تمہارا کام ہو جائے تو میرا ایک چھوٹا سا کام کر دینا۔'' بابے نے ایک بار پھر سے اپنی پراسرار مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میرا کام ہو گیا تو آپ جو کہو گے میں کروں گا۔'' میں نے دھڑکتے دل سے وعدہ کر لیا، فوزیہ سے شادی کا سن کر ہی میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو گئی تھی۔

''دیکھو بالک تم ہم سے وعدہ کر رہے ہو کہ تم فوزیہ سے سگائی کے بعد میرا کام کرو گے، اب اگر تم وعدے سے مکرے تو پھر ہم بھی رنگ میں بھنگ ڈال دیں گے۔'' بابے نے وعدے کے ع کو ء سے بدلتے ہوئے کہا۔

''آپ بتا ئیں میں پہلے ہی وہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے اس کی تسلی کے لیے کہا۔

''نہیں بالک ہمیں تمہارے وعدے پر یقین ہے، اب تم جاؤ اور جا کر ہڈی کا بندوبست کرو۔'' اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید کوئی بات کرنے سے روکتے ہوئے کہا، اور ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے مراقبے کی حالت میں چلا گیا، میں چند ثانیے خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر واپس چلا آیا۔

اگلے دن میں گھر کے قریب بازار میں موجود تمام قصابوں کی دکانیں کھنگال چکا تھا، مگر کسی کے پاس مطلب کا پارچہ نہیں تھا، دوسرے محلے کے بازار سے بالآخر مجھے مطلوبہ ہڈی والے گوشت کا پورا پیس مل گیا، وزن کرنے کے بعد قصاب اس کی بوٹیاں کرنے لگا تو میں نے اسے منع کر دیا اور کہا کہ گھر جا کر خود ہی کر لوں گا۔

''بیٹا اس میں سے نکلنے والی ہڈی ضرور توڑ دینا اگر کسی خبیث کے ہاتھ لگ گئی تو کئی غریبوں کا خانہ خراب کر دے گا۔'' قصاب نے مجھے نصیحت کرتے ہوئے کہا، تو میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گوشت کے پارچے کو تھیلے میں ڈال کر موٹر سائیکل پر اپنے آگے رکھ لیا، اور دریا کی طرف چل پڑا۔

ایک ویران جگہ دیکھ کر میں نے وہاں گوشت میں سے ہڈی کو علیحدہ کر لیا، اور ایک بار پھر بابے کے پاس پہنچ گیا، وہ جھونپڑی کے قریب ہی ایک درخت کے نیچے سادھی لگائے بیٹھا تھا، میرے پاس پہنچتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں، جو خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

''آ گئے بالک میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' اس نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا اور میرے ہاتھ میں موجود تھیلا لے لیا، اور اس میں سے ہڈی نکال کر اسے غور سے دیکھنے لگا، اسی دوران میں نے پولی تھین کا بیگ بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔ جس میں لیموں تھے۔

''یہ تم نے اچھا کیا کہ ماس کا پورا ٹکڑا خرید کر خود ہڈی نکالی ورنہ قصاب تو اس ہڈی کو توڑ دیتے ہیں یا پھر داغی ضرور کر دیتے ہیں، سمجھ لو تمہارا کام ہو گیا۔'' اس نے ہڈی کو واپس تھیلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''بابا جی کیا ایک بار پھر مجھے اپنے گھر والوں کو رشتے کے لیے بھیجنا پڑے گا۔'' میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا، کیوں کہ اب تو یہ کسی صورت ممکن نہیں تھا، کہ میرے والدین ایک بار پھر رشتے کے لیے جاتے، چاہے اس بار میں سچ میں ہی خودکشی کیوں نہ کر لیتا۔

''نہیں اب تمہارے گھر والوں کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے لڑکی والے خود چل کر رشتہ دینے آئیں گے۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، تو مجھے لگا کہ پہلی ملاقات کی طرح اس بار پھر اس کی آنکھوں کی کشش نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہو۔ مجھ پر بے خودی سی طاری ہونے لگی تھی۔

''اب آپ بتائیں میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟'' میں نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ تم کس دن پیدا ہوئے تھے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا تو مجھے اس کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی، اب وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا، مجھے بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ جیسے میں ہوا میں معلق ہوں، اور میرے اردگرد دھند چھائی ہوئی ہے۔

''جی میں فلاں سن میں پیدا ہوا تھا، میں نے اپنی پیدائش کا سال بتاتے ہوئے کہا۔''

''نہیں بالک میں جنم کی تاریخ نہیں پوچھ رہا۔ چلو ہم خود ہی تمہیں بتا دیتے ہیں، کہ تم کب پیدا ہوئے تھے، اس دن سورج کو گرہن لگا ہوا تھا، اور پھر اسی رات کو چندرما کو بھی گرہن لگا تھا، ایسا ہزاروں سال بعد ہوتا ہے، کہ ایک ہی دن اور رات میں سورج اور چاند کو گرہن لگے، تمہارا جنم اسی خاص گھڑی میں ہوا تھا، اور اس خاص گھڑی میں پیدا ہونے والے بچوں میں سے آج صرف تم زندہ ہو، اسی لیے اب پوری دنیا میں تم اکیلے ہو جو میرا کام کر سکتے ہو۔'' یہ باتیں سن کر بے خودی کی کیفیت میں ہونے کے باوجود میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''میرے والدین نے تو کبھی کچھ نہیں بتایا اس بارے میں۔'' میں نے حیرانگی سے کہا۔

''ہو سکتا ہے ان کے لیے یہ کوئی اہم بات نہ ہو، مگر ہمارے لیے تو یہ بات تمہیں بہت مہان بنا دیتی ہے، اب تم جاؤ کل تک تمہارا کام ہو جائے گا، مگر یاد رکھنا جب تمہارا کام ہو جائے تو تمہیں اپنا وعدہ نبھانے کے لیے واپس آنا ہو گا، اور اگر تم نہ آئے تو تمہیں بہت نقصان اٹھانا پڑے گا، تب ہم سے گلہ مت کرنا۔'' بات کے اختتام تک اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ اس وقت تک میرے اردگرد سے دھند چھٹ چکی تھی، میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا، مگر اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے ہی وہاں سے جانے کا کہا، تو میں ذہن میں بے شمار سوال لیے واپس آ گیا۔

☆......☆

اگلے دن جب میں سہ پہر کے وقت آفس سے گھر پہنچا، تو فوزیہ کے والدین کو اپنے گھر میں دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے، وہ لوگ خوش گوار موڈ میں امی ابو سے گپیں لگا رہے تھے، مجھے دیکھتے

ہی آنٹی نے اٹھ کر میرا ماتھا چوما، اور انکل جو میری شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، مجھ سے گلے لگ کر ایسے ملے جیسے وہ میرے بچپن کے لنگوٹیے ہوں۔ یہ تو معجزہ ہو گیا تھا، میں حیرت سے گنگ ہو کر رہ گیا تھا، مجھے ایسے لگ رہا تھا، کہ میں جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہوں، میں بار بار خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ سب حقیقت میں ہے۔

''ٹھیک ہے شفیق صاحب اگر آپ کہتے ہیں تو ہم یہ محرم کے چند دن رُک جاتے ہیں ورنہ اسلام میں تو کوئی پابندی نہیں ہے ان دنوں میں نکاح کرنے کی۔ میری مانیں تو آج ہی نکاح کر دیتے ہیں، نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے، ولیمہ وغیرہ محرم کے بعد کر لیں گے۔'' انکل نے ابو سے مخاطب ہو کر کہا۔

''نہیں سلیم صاحب ان سوگ کے دنوں میں خوشی کی تقریب مناسب نہیں ہے، اور پھر لوگ بھی باتیں بنائیں گے، ہم محرم کے بعد دھوم دھام سے شادی کریں گے۔'' ابو نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

''چلیں بھائی صاحب جیسے آپ کی مرضی بہر حال فوزیہ آپ لوگوں کی امانت ہے ہمارے پاس، آپ کی جب مرضی ہو آ کر لے جائیں۔'' آنٹی نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''بیگم بیٹے کا منہ تو میٹھا کرواؤ۔'' انکل سلیم نے کہا تو قہقہوں کی گونج میں انہوں نے پلیٹ میں سے گلاب جامن اٹھا کر میرا منہ میٹھا کروا دیا، منزل کو اتنا قریب دیکھ کر میرے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی، اس وقت میرے بہن بھائیوں اور والدین کے چہروں پر چند دن پہلے فوزیہ کے گھر والوں کی طرف سے کی گئی بد سلوکی کا شائبہ تک نہیں تھا، جو میرے لیے مزید دلی سکون کا باعث بن رہا تھا۔

اگلے دن میں مٹھائی لے کر بابے کے جھونپڑی نما آستانے پر حاضری دینے پہنچ گیا۔ میں آج سے پہلے تک ان تعویز گنڈے کرنے والوں کو خبیثوں کی لسٹ میں شمار کرتا تھا، مگر آج اس بابے کی تمام تر کراہیت آمیز شخصیت کے باوجود میں اس کے سامنے مجسم تابعدار مرید کی طرح بیٹھا تھا، میں نے اپنی والدہ سے بھی تصدیق کر لی تھی۔ بابے نے واقعی سچ کہا تھا، میں ایسے ہی دن پیدا ہوا تھا جب سورج کو گرہن لگا تھا اور اسی رات کو چاند گرہن بھی لگا تھا۔

''بابا جی بتائیں میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں۔'' میں نے انتہائی فرمانبرداری سے پوچھا۔

''بتا دیں گے بتا دیں گے، ایسی بھی کیا جلدی ہے، بالک ویسے تمھارے والد نے انکار کر کے اچھا نہیں کیا، انہیں چاہیے تھا کہ کل ہی فوزیہ کو تمھاری دلہن بنا کر گھر لے آتے، تو اسی بہانے تمھیں ہمارا کام کرنے سے پہلے معاوضہ تو مل جاتا۔'' بابے نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو مزید بھینچتے ہوئے خباثت بھرے لہجے میں کہا، تو میرے پاس اس کی مسکراہٹ میں شامل ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

''کوئی بات نہیں بابا جی میں کچھ دن مزید انتظار کر لوں گا، آپ نے ہمارا گھر خوشیوں سے بھر دیا ہے میرے لیے اتنا ہی کافی ہے، آپ بتائیں میرے لیے کیا حکم ہے۔'' میں نے ایک بار پھر اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

''اتنا اصرار کر رہے ہو تو بتا ہی دیتے ہیں بابے نے پہلو بدلتے ہوئے کہا، تمھیں تین کام کرنے ہیں جب تم ایک کام کر لو گے تب ہم تمھیں دوسرا اور پھر تیسرا کام بتائیں گے۔ سب سے پہلے تو تمھیں ہمارے لیے کچی مٹی کے بنے ہوئے سات چراغوں کا بندوبست کرنا ہو گا۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، جب میں یہاں آیا تھا تو اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں، مگر اب وہ نارمل لگ رہی تھیں۔

''سمجھ گیا آپکا کام ہو گیا، اور کوئی حکم۔'' میں نے تابعدار مریدوں کی طرح پوچھا۔

''چراغوں کو جلانے کے لیے بھی تو کچھ چاہیے ہو گا، اس نے میری توجہ تیل کی طرف دلائی، جی میں تیل بھی لیتا آؤں گا۔''

''تیل نہیں بالک ہمیں کچھ خاص چیز چاہیے۔'' بابے کے لہجے میں اس بار کچھ خاص بات تھی جس کا میں ادراک نہیں کر پا رہا تھا۔

''آپ حکم کریں آپ جو کہیں گے میں لے آؤں گا۔'' میں نے ایک بار پھر انکساری سے جواب دیا۔

''سور یا کتے کی تازہ چربی چاہیے ہو گی۔'' بابے نے اتنے سادہ سے لہجے میں اپنی ڈیمانڈ بتا دی، جیسے وہ کسی حلال جانور کی چربی لانے کا کہہ رہا ہو، میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، کسی سور یا کتے کو ذبح کر کے اس میں سے چربی نکالنے کا سوچ کر ہی مجھے ابکائی آ گئی۔'' بابا جی میں نے تو کبھی مرغی بھی ذبح نہیں کی، یہ کام میں کیسے کروں گا، آپ کی جتنے پیسے چاہیے ہیں وہ مجھ سے لے لیں اور کسی سے منگوا لیں۔'' میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا، اس خبیث کی بات سن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، اور دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔

''تم ایسے کرو جو پیسے مجھے دے رہے ہو وہ کسی اور کو دے کر اپنی اور فوزیہ کی شادی کا تعویذ بنوا لینا، ہوسکتا ہے اس طرح تمھاری اس سے شادی ہو جائے میں نے جو تمھارا کام کیا ہے، وہ ابھی ختم کیے دیتا ہوں۔'' بابے نے برا سا منہ بناتے ہوئے دھمکی دی تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا، اچانک میرے ذہن میں ہماری گلی سے کوڑا اٹھانے والے ولیم مسیح کا خاکہ ابھرا تو مجھے مسئلے کا حل نظر آ گیا۔

''ٹھیک ہے بابا جی آپ کو کتے کی تازہ چربی بھی مل جائے گی۔'' میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''یہ کام تمھیں اپنے ہاتھوں سے کرنا ہوگا، ولیم مسیح کی لائی ہوئی چربی ہمارے کسی کام کی نہیں ہو گی، ہاں تم اس سے کسی حد تک مدد لے سکتے ہو مگر چربی تمھیں خود نکالنی ہو گی، اور ہاں ایک بات کا خاص خیال رکھنا، تم جب اسے ذبح کرو تو اپنے مذہب کے مطابق ذبح کرنا، جیسے حلال جانور کو ذبح کرتے وقت تکبیر پڑھتے ہو اس کو بھی بالکل ویسے ہی ذبح کرنا۔''

بابے کے منہ سے ولیم مسیح کا نام سن کر میں سناٹے میں آ گیا، اس کا مطلب کہ اسے میرے دل میں ابھرنے والے خیال تک رسائی تھی، اس نے مجھے عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا، ایک طرف میری محبت تھی، اور دوسری طرف یہ بوڑھا شیطان مجھ سے شیطانی کام کروانا چاہتا تھا، جسے کر کے ہی فوزیہ میری ہو سکتی تھی، میں نے بے بسی کے عالم میں ہاں کرنا چاہی تو زبان نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا، میں نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی، تو اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اب تم جاؤ اور تب ہی لوٹنا جب چراغ اور چربی لے آؤ، وہ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اٹھا اور جھونپڑی کے اندر چلا گیا، میں بوجھل قدموں سے گھر واپس آ گیا، بار بار ایک ہی خیال ذہن میں آ رہا تھا، کہ اگر کسی نے مجھے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا تو میں اپنی فیملی سمیت کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا، رات کو فوزیہ سے بھی ملاقات ہوئی پر میں اسے بابے کی شیطانی ڈیمانڈ بتانے کی جرأت نہیں کر سکا۔

☆.....☆

اگلی صبح جب ولیم مسیح کوڑا اٹھانے آیا تو میں پہلے سے اس کا منتظر تھا، میں نے بات کرنے سے پہلے نذرانہ دینا مناسب سمجھا، اتنے سارے لال نوٹ دیکھ کر وہ پہلے تو حیران ہوا، مگر پھر میری بات سننے کے بعد اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ آ گئی۔

''باؤ جی کیا آپ کو ایک ہی چاہیے؟'' اس نے ایسے پوچھا جیسے یہ اس کے لیے کوئی کام ہی نہ ہو۔

''یار میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ مجھے نہیں میرے ایک دوست کو ضرورت ہے، اگر تم میری بتائی ہوئی جگہ پر بروقت پہنچ گئے تو مزید اتنے نوٹ دوں گا۔'' میں نے اسے لالچ دیتے ہوئے کہا، تو مزید رقم کا سن کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی اور پھر جب میں مقررہ جگہ پر پہنچا، تو وہ ایک صحت مند کتے کے ساتھ پہلے سے وہاں موجود تھا۔

''باؤ جی پھر بھی ضرورت ہو تو مجھے ضرور کہنا۔'' اس نے نوٹ گنتے ہوئے کہا۔

''ہاں ضرور۔'' میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے

آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں!!

آیئے! دوشیزہ کے قلم قبیلے میں شامل ہو جایئے۔

یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے......!



اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سفر کرتے ہوئے آس پاس کے مناظر آپ کو روکتے ہیں۔

شاعری آپ کو اچھی لگتی ہے۔

تو پھر قلم اٹھایئے اور کسی عنوان کو کہانی یا افسانے

میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمایئے

ماہنامہ دوشیزہ آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے

ہوسکتا ہے عنقریب منعقد ہونے والی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

تقریب میں آپ بھی ایوارڈ حاصل کریں

تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:

88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

کہا اور اسے وہاں سے رخصت کر دیا، اور کتے کو لے کر قریب ہی موجود درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں آ گیا اور اسے ایک درخت کے تنے کے ساتھ اس انداز سے باندھ دیا کہ اس کا منہ بالکل تنے کے ساتھ لگ گیا، اس کے بعد اس کی ٹانگیں باندھ کر اسے مکمل طور پر بے بس کر دیا۔

تکبیر پھیر کر چربی نکالنے تک کوئی خاص دشواری تو نہیں ہوئی مگر مجھے خود سے نفرت ہوئی ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ گھناؤنا کام میں نہیں بلکہ مجھ میں موجود کوئی دوسری قوت کر رہی ہے میں تو محض خاموش تماشائی کی حیثیت رکھتا ہوں۔

اس غلیظ کام سے فارغ ہو کر میں سیدھا بابے کے پاس جا پہنچا، وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا، میں نے مٹی سے بنے سات چراغ اور چربی اس کے سامنے رکھ دی۔

''وہ بالک مجھے اندازہ ہے کہ تم یہ سب کچھ کرنے میں کتنی تکلیف اٹھا رہے ہو، بس دو کام اور اس کے بعد تمہیں دنیا کا امیر ترین شخص بنا دوں گا، بس دو کام اور رہ گئے ہیں۔'' اس نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا، تو میری گھبراہٹ دیدنی ہو گئی۔

''وہ....وہ..کیا ہیں۔'' میں نے لکنت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''دیکھو بالک اگر تم ہمارا کام کرو گے تو ہم تمہیں وہ کچھ دان کریں گے، جو تم نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا، ہم چند دن میں ہی تمہیں تمہارے آفس کی سب سے اونچی کرسی پر بٹھا دیں گے۔ اس شہر میں جس جگہ کہو گے محل بنوا دیں گے، تمہاری تمام خواہشات پوری کر دیں گے، اور اگر تمہیں ہماری بات پہ شک ہے تو ہم پہلے ہی تمہیں یہ سب کچھ دینے کو تیار ہیں، اس کے بعد تم ہمارا کام کر دینا، ہم تم سے یہ سب کروانے کے لیے اس لیے مجبور ہیں کہ تم واحد شخص ہو جو یہ کر سکتے ہو اور کوئی نہیں۔''

مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ جو کچھ مجھے دینے کی بات کر رہا ہے، وہ اسے پورا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا، مگر اس کے بتائے ہوئے کام میری طبیعت اور استطاعت سے باہر تھے، میں بری طرح سے پھنس چکا تھا۔

''ٹھیک ہے آپ دوسرا کام بتائیں۔'' میں نے مردہ سے لہجے میں پوچھا۔

''دوسرا کام یہ ہے کہ جب کسی نوجوان کنواری لڑکی کی لاش کو دفنایا جائے تو تم نے اسی رات اس کی قبر کھول کر اس کے کانوں اور ناک میں موجود روئی نکال کر لاؤ گے، میں اسی روئی سے چراغوں کی بتیاں بناؤں گا۔'' اس کی بات مکمل ہونے تک میرے جسم کے تمام مساموں نے بیک وقت پانی پسینے کی شکل میں خارج کرنا شروع کر دیا تھا فضا میں اچھی خاصی خنکی ہونے کے باوجود میں پسینے میں ایسے نہا گیا جیسے کسی نے پانی کی بھری ہوئی بالٹی مجھ پر انڈیل دی ہو، میرا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا، میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت یکسر مفقود ہو کر رہ گئی، میرے لیے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی صورت حال بن گئی تھی۔ آنکھوں کے آگے فوزیہ کا عکس گھوم رہا تھا وہ مجھے مل تو رہی تھی مگر اس کی قیمت میری توقع سے کہیں زیادہ لگائی جا رہی تھی میرے خود کے اندر جنگ چھڑ چکی تھی بالکل ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اندر دو قوتیں آپس میں بھڑ گئی ہوں اور ان کے درمیان گھمسان کا رن پڑ گیا ہو، ایک دل چاہ رہا تھا کہ لعنت بھیجو اس محبت کے کھیل پر اور اپنا ایمان بچا کر یہاں سے بھاگ جاؤں، مگر دوسرے لمحے ہی اندر سے آواز اٹھتی کہ اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہو رہا اگر میں اپنی محبت کو پانے کے لیے کسی مردے کے کانوں سے روئی چرا لوں گا تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ اس سے مردے سمیت کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا، بس مجھے قبر کھولنے کی ہمت کرنی پڑے گی اور فوزیہ ہمیشہ کے لیے میری ہو جائے گی۔

میں ماؤف دماغ کے ساتھ واپس آ گیا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میں تو اندھیرے سے پہلے ہی خوف کھاتا تھا ایسے میں کسی ویران قبرستان میں رات کے وقت کسی قبر کو کھولنے کا

خیال ہی میرے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ دل ایسے ڈوبا جا رہا تھا جیسے ہارٹ اٹیک ہو رہا ہو، اگلے دو دن اسی کیفیت میں گزر گئے اس دوران میرے کان لاشعوری طور پر مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کی طرف لگے رہے، مگر ابھی تک سوائے ایک بزرگ شخص کی فوتگی کے علاوہ اور کوئی اعلان نہیں ہوا تھا، دفتر سے واپسی پر میں آرام کی غرض سے لیٹا ہوا تھا اور مجھ پر نیم غنودگی کا عالم طاری تھا کہ اس خبیث بابے کی شکل ذہن کی سکرین پر ابھر آئی۔

''مورکھ ایسے کسی نوجوان لڑکی کی موت کا انتظار کرتے ہوئے تو تمہیں کئی سال لگ جائیں گے، تم خود ہمت کر کے کسی لڑکی کی جان لے لو یا پھر ہسپتال کی ایمرجنسی میں چلے جاؤ تو امید ہے کام بن جائے گا۔'' اس کے ہونٹ ہلے اور غصیلی آواز سنائی دی تو میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، آواز صاف اور واضح تھی میرا وہم یا خیال نہیں تھا۔

☆......☆

اگلے دن میں اس کے سمجھائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے ہسپتال جا پہنچا، وہاں جاتے ہی میرا کام بن گیا، وہ کسی نوجوان کنواری لڑکی کی لاش ہی تھی، جو ایمرجنسی میں پوسٹ مارٹم کے لیے لائی گئی تھی، پوسٹ مارٹم کے بعد جب لاش اس کے لواحقین کے سپرد کی گئی تو میں بھی اپنی بائیک پر ایمبولینس کے پیچھے چل دیا، گھر دیکھ آنے کے بعد میں اس کے جنازے میں بھی شامل ہوا اور اب آدھی رات کے بعد اس کی قبر کے پاس کھڑا خوف سے کانپ رہا تھا میں بیچ اور کسی ساتھ لے کے آیا تھا قبر پر کسی چلانے سے، ایسے محسوس ہوا کہ جیسے میں نے اپنے دل پر ہی کسی چلائی ہو، اس کے بعد میں نے بے خودی کے عالم میں قبر سے ساری مٹی نکال کر لحد پر رکھے ہوئے لکڑی کے پھٹے بھی اٹھا دیے، پھٹے اٹھتے ہی فضا میں کافور کی خوشبو پھیل گئی، کفن کا بند کھولنے کے بعد میں نے ٹارچ آن کی تو مجھے لگا کہ لاش جیسے جاگتی آنکھوں سے مجھے گھور رہی ہو میں ڈر کے مارے قبر سے باہر نکلنے کے لیے واپس مڑا مگر لحد کے

کنارے سے میرا پاؤں پھسل گیا اور میں لحد میں لاش کے اوپر جا گرا، خوف سے میری گھگی بندھ گئی، جیسے تیسے کر کے میں لحد سے باہر نکل آیا اور اپنے جسم کی تمام قوت صرف کر کے ٹارچ کا رخ ایک بار پھر لاش کی طرف کیا اور نیچے جھک کر اس کے کانوں اور منہ میں دی گئی روئی کو باہر کھینچ لیا، منہ والی روئی لیس دار رطوبت سے بھری ہوئی تھی، رطوبت کے انگلیوں سے لگتے ہی مجھے جھرجھری آ گئی، میں نے جلدی سے روئی کو اپنے پاس موجود ڈبیا میں رکھ لیا اور وہاں سے حقیقت میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، اس وقت مجھ میں اتنی سی بھی اخلاقی جرات نہیں رہ گئی تھی کہ اس معصوم لڑکی کی قبر کو واپس بند ہی کر دیتا، گھر پہنچنے تک مجھے شدید بخار ہو گیا تھا اور صبح تک تو بار بار بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے تھے، ابو مجھے ہسپتال لے گئے سارا دن کئی قسم کی بوتلیں اور ٹیکے لگنے کے بعد طبیعت سنبھل گئی تو رات گئے ہم واپس گھر آ گئے، اگلا سارا دن گھر میں گزار کر شام کے وقت میں ایک بار پھر بابے کے پاس جا پہنچا۔ روئی دیکھ کر بابا انتہائی جذباتی ہو گیا جذبات کی شدت سے اس کے چہرے کے عضلات پھڑکنے لگے، میری پشت پر سورج غروب ہونے کو تھا، جس کی آخری کرنیں میرے سامنے بیٹھے ہوئے بابے کے چہرے پر پڑ رہی تھیں، اس کا چہرہ کسی دہکتے ہوئے شعلے کے جیسا لگ رہا تھا، مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے آگ سے بنا ہوا چہرہ مسکرا رہا ہو۔

''بس بالک آج کے بعد تم ہمارے شرن میں ہو، ہم نے تمہیں اپنا پتر مان لیا ہے، ہم تمہیں اس دنیا کا امیر ترین شخص بنا دیں گے۔ لوگ تمہارے جیسی زندگی کی تمنا کریں گے، تم جس ناری کی طرف دیکھو گے وہ خود تمہارے قدموں میں آ بیٹھے گی، بس یوں سمجھ لو ہم تمہارے لیے سورگ اور حوروں کا بھی بندوبست کر دیں گے۔'' بابے نے ایک ہاتھ اٹھا کر اتنے تکبرانہ انداز میں کہا، جیسے اس کائنات کا سارا نظام اسی کے اشارے کا محتاج ہو۔

''یہ تو سب ٹھیک ہے مگر اس روئی سے آپ کو کیا

حاصل ہوگا، میں نے جرأت کر کے اپنے ذہن میں آنے والا سوال پوچھ ہی لیا، وہ چند ثانیے میری طرف غور سے دیکھتا رہا، اور پھر گویا ہوا۔

''ہم نے تمہیں اپنا پتر مان لیا ہے اس لیے تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں، ہم ساری عمر تپسیا کر کے کالے علم کے پانچویں درجے پر پہنچے ہیں، اس علم کی تاریخ میں اس درجے پر پہنچنے والے ہم ساتویں انسان ہیں، اس سے آگے آج تک کوئی نہیں بڑھ سکا، اب تم جیسا دھن بھاگی مجھے مل گیا ہے، تو میرے ست چراغی چلے کی راہ ہموار ہوگئی ہے، اب مجھے چھٹے درجے کی طاقتیں حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا، بس تم آخری چیز مجھ تک پہنچا دو اس کے بعد ساری زندگی عیش کرو، اور عیش بھی ایسا جس کی دنیا حسرت کرے۔'' اس نے تفصیل کے ساتھ سارے عمل کی وجہ بتائی اور خاموش ہوگیا۔

''اور تیسرا کام کیا ہے۔'' میں نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا، اس وقت تک سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا تیزی سے گہرا ہونے لگا تھا۔

''آخری کام تو پہلے سارے کاموں سے آسان ہے تمہاری مقدس مذہبی کتاب کے پہلے چار اور آخری تین ورق چاہئیں، بابے نے اپنا بیت سے کہا۔

''ان اوراق کا کیا کرو گے۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''جو سات چراغ جلاؤں گا ان چراغوں کے نیچے رکھنے ہیں۔'' اس نے بدستور ملائم لہجے میں جواب دیا، اس کی بات سن کر میرے اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی اور یکدم میری رگوں میں بہنے والا خون پارہ بن گیا، میں لاحول پڑھتا ہوا اچھل کر کھڑا ہو گیا، مجھ جیسا گنہگار اور دین سے دور شخص بھی مقدس کتاب کی بے حرمتی کا سن کر ہتھے سے اکھڑ گیا، میرے منہ سے لاحول ولاقوۃ کے الفاظ سن کر بابا بھی ایسے جھٹکا کھا کر اٹھا جیسے اچانک اس کے سامنے کوئی زہریلا سانپ نکل آیا ہو۔

''مورکھ ہم نے فوزیہ کو تمہارے قدموں میں لا پھینکا، اپنا پتر بنایا، اور دنیا کی تمام آسائشیں تمہارے نام کر رہے ہیں، بدلے میں تم ہمیں دغا دینے پر تل گئے ہو، ہم تم سے فوزیہ سمیت سب کچھ چھین لیں گے۔'' بابے نے غضب ناک لہجے میں پھنکارتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے ایمان سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے ایک چھوڑ دو میں ایک ہزار لڑکیوں کے بدلے بھی اپنے ایمان کا سودا نہیں کروں گا، نامعلوم باپ کی اولاد میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور فوزیہ پر بھی۔'' میں نے غراہٹ بھرے لہجے میں جواب دیا، اور غصے کی شدت سے اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا اور پوری قوت سے اسے تھپڑ دے مارا، مگر تھپڑ اسے لگنے کی بجائے میرا ہاتھ ہوا میں ہی گھوم گیا، وہ ایک لمحہ پہلے جہاں موجود تھا، اب وہاں

صحابہ کرامؓ کی محبت

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''یہ نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔'' (سورۃ الاحزاب' آیت نمبر 6)

صحابہ کرامؓ کی پوری پوری زندگیاں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مصداق تھیں۔ بلاشبہ انہوں نے ایک اشارہ رسالت ﷺ پر اپنی جانیں نچھاور کر دیں اور ایک آج ہم ہیں ہمارے پاس عشق مصطفیٰ ﷺ کے دعوے ہیں ہم جاں نثارانِ مصطفیٰ کے نعرے لگاتے ہیں مگر ہماری زندگیاں اس کے برعکس رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی میں بسر ہو رہی ہیں۔ محبت کے تقاضے تو کچھ اور ہی ہوا کرتے ہیں۔ محبت تو یک جنبش لب دنیا جہان چھڑوا دیتی ہے جب کہ ہماری محبت تو ہم سے معمولی نوعیت کی معاشرتی برائیاں چھڑوانے سے بھی عاجز ہے۔ چہ جائیکہ ناجائز سے بچا جائے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ گناہوں اور مصیبت سے بچنے کا بہترین نسخہ اللہ کے رسول ﷺ سے سچی محبت ہے۔

حسنِ انتخاب: کرن شہزادی۔ راولپنڈی

نہیں تھا، میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ ایک طرف کھڑا مجھے گھور رہا تھا، اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے، اس کے اس طرح غائب ہو کر دوسری جگہ پہنچ جانے پر میں بہت خوفزدہ ہو گیا تھا۔

''میں تمھارا سب کچھ نشٹ کر کے تمھیں دنیا کے سامنے عبرت بنا دوں گا۔'' اس نے مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا تو اس کا لہجہ غیر انسانی تھا، اب میرے پاس وہاں سے بھاگنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں مقدس کتاب کی آیات با آواز بلند پڑھتا ہوا موٹر سائیکل تک پہنچا اور پھر آندھی طوفان کی طرح اسے اڑاتا ہوا شہر کی طرف جانے لگا۔ ابھی میں نے چند فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ موٹر سائیکل جھٹکے کھانے کے بعد بند ہو گئی، میری ہر ممکن کوشش کے بعد بھی وہ دوبارہ اسٹارٹ نہیں ہوئی، تو میں اسے لے کر پیدل ہی چل پڑا، مجھے بار بار ایسے لگ رہا تھا کہ کوئی میرے پیچھے آرہا ہے مگر جب مڑ کر دیکھتا تو کوئی نظر نہیں آتا، کئی بار تو ایسے ہوا کہ کوئی چیز مجھے چھوتی ہوئی گزری ہو، خوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اس تمام دورانیے میں میں مقدس کلام اونچی آواز میں پڑھتا رہا، خوف سے پیچھا چھڑانے کے لیے شاید میں لاشعوری طور پر ایسا کر رہا تھا۔ آخر کار میں ایسی صورتحال سے نپٹتا ہوا کئی کلومیٹر کا سفر کر کے شہر پہنچ گیا، راستے میں ایک دوست کے گھر موٹر سائیکل کھڑی کرتے کے بعد بس کے ذریعے اپنے اسٹاپ پر پہنچ گیا، یہاں سے ہمارا گھر چند گلیوں کی مسافت پر تھا، رات گہری ہو چکی تھی، ابھی میں گھر کی طرف چلا ہی تھا، کہ اس سارے علاقے کی بجلی آف ہو گئی، اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، دفعتاً مجھے اپنے پیچھے کسی کے چلنے کی آواز آئی، جیسے کوئی عورت پازیب پہنے میرے پیچھے آرہی ہو۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو اندھیرا ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ نظر نہیں آیا، اتنا ضرور ہوا کہ میرے رکنے سے پازیبوں کی آواز بھی رک گئی، میں اپنا وہم سمجھ کر ایک بار پھر چل پڑا تو وہ آواز پھر سے آنے لگی۔ میرے اعصاب ایک بار پھر سے تن گئے، میں نے اپنی رفتار بڑھا دی اور ساتھ ساتھ با آواز بلند آیت کریمہ پڑھنے لگا، میرے پیچھے آنے والی آواز کی رفتار بھی تیز ہو گئی، میں خوف کے مارے دوڑنے لگا میرے پورے جسم کی طاقت سمٹ کر ٹانگوں میں آ گئی تھی، میں اپنی زندگی میں پہلے کبھی اتنا تیز نہیں دوڑا، کچھ دیر پہلے تو ایسا لگ رہا تھا کہ میرے پیچھے کوئی عورت آرہی ہے مگر اب ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ میرے ساتھ ہی دوڑ رہی ہے، میں خوف کی وجہ سے اپنے برابر میں دیکھنے سے بھی گریز کر رہا تھا کچھ دیر میں ہی میرا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تو خود بخود میری رفتار کم ہونے لگی، میری ٹانگیں خوف سے کانپ رہی تھیں، میں قدم رکھ کہیں رہا تھا اور وہ پڑ کہیں رہا تھا، اسی کشمکش میں اپنی گلی میں پہنچ گیا تو دل کو کچھ ڈھارس ہوئی، ابھی میں اپنے گھر کے تقریباً سامنے پہنچا ہی تھا جب اچانک کسی نے مجھے زور سے دھکا دیا تو میں توازن کھو بیٹھا اور قلابازیاں کھاتا ہوا دور تک چلا گیا اس طرح گرنے سے جسم پر کئی جگہ خراشیں آ گئیں، میں نے مڑ کر عقب میں دیکھا تو میری سٹی گم ہو گئی، میرا حلق اس قدر خشک ہو چکا تھا کہ تھوک نگلنا بھی مشکل ہو گیا، بلا شبہ وہی خبیث کچھ فاصلے پر کھڑا مجھے شعلہ بار نظروں سے گھور رہا تھا۔

''میں تمھیں آخری موقع دے رہا ہوں، اپنے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرو، ورنہ تم ساری زندگی فوزیہ کی شکل دیکھنے کو ترسو گے، اور میں تمھارے جیون کو نرکھ بنا کے رکھ دوں گا، بالکل گندی نالی کے کیڑے جیسی۔'' اس نے انتہائی سرد لہجے میں وارننگ دی تو مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی، بری طرح گرنے کی وجہ سے میرے آنکھوں کے آگے نیلے پیلے تارے گردش کر رہے تھے، تاریکی جیسے بار بار ذہن پر جھپٹ رہی تھی، میں نے اپنی ہمت کو مجتمع کیا، اور اس کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میری جان لے سکتے ہو تو لے لو، مگر تم میرا ایمان کسی صورت نہیں چھین سکو گے، چاہے تم کالے جادو کے آخری درجے پر ہی کیوں نہ پہنچ جاؤ، میں تم پر اور ایسی محبت پر لعنت بھیجتا ہوں جس کے لیے مجھے اپنا ایمان گنوانا پڑے۔''

آخری الفاظ کہتے ہوئے میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ مجھے واپس ہوش و حواس کی سرحد میں داخل ہونے پر سب سے پہلے جو احساس ہوا، کہ جیسے میں بارش میں بھیگ رہا ہوں، اس کے ساتھ ہی مجھے جسم کے مختلف حصوں میں اٹھنے والی درد کی تیز لہروں نے مکمل ہوش کی وادی میں لا پھینکا، تو میں نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں، میرے اوپر ایک سفید باریش فرشتہ صورت شخص میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈال رہا تھا۔ قریب ہی گھر کے سب افراد موجود تھے جن کے چہرے غم کی تصویر بنے ہوئے تھے، وہ فرشتہ صورت شخص میرے لیے اجنبی تھا، مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر سب کے چہرے کھل اٹھے، پہلے تو میں خالی الذہنی کی کیفیت میں صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا، کچھ دیر میں تمام واقعات جزئیات سمیت مجھے یاد آ گئے۔

''سب لوگ ذرا باہر جائیں مجھے برخوردار سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے۔'' اس باریش بزرگ نے کہا تو سب لوگ باہر چلے گئے، میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو میں ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

''تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے سب معلوم ہے کہ تم کن چکروں میں پھنس کر اس خبیث کے ہتھے چڑھے تھے، تمہارے ایمانی جذبات دیکھ کر میری ڈیوٹی لگائی گئی کہ میں تمہاری جان اس سے چھڑواؤں، تمہاری قسمت اچھی تھی کہ میں بروقت پہنچ گیا ورنہ اب تک تو منکر نکیر تمہارا حساب بھی لے چکے ہوتے۔ بہر حال تم مبارک باد کے مستحق ہو، کہ تم نے اس کے کسی لالچ میں آ کر اپنی ابدی زندگی خراب نہیں کر لی۔ میں نے اس خبیث کا ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ وہ اب تمہیں کبھی تنگ نہیں کر سکے گا۔ تمہیں اپنے گھر والوں کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے بھی انہیں کچھ نہیں بتایا ہے، اور ہاں فوزیہ کا خیال ذہن سے نکال دو وہ تمہاری قسمت میں نہیں ہے۔'' اس فرشتہ صفت انسان نے تفصیل سے بات کی تو صورتحال مجھ پر واضح ہو گئی۔

''اب مجھے اجازت دو۔'' اس نے جانے کی بات کی تو بے اختیار میں نے پوچھ لیا کہ آپ کون ہیں۔''

''تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں اور مجھے بتانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔''

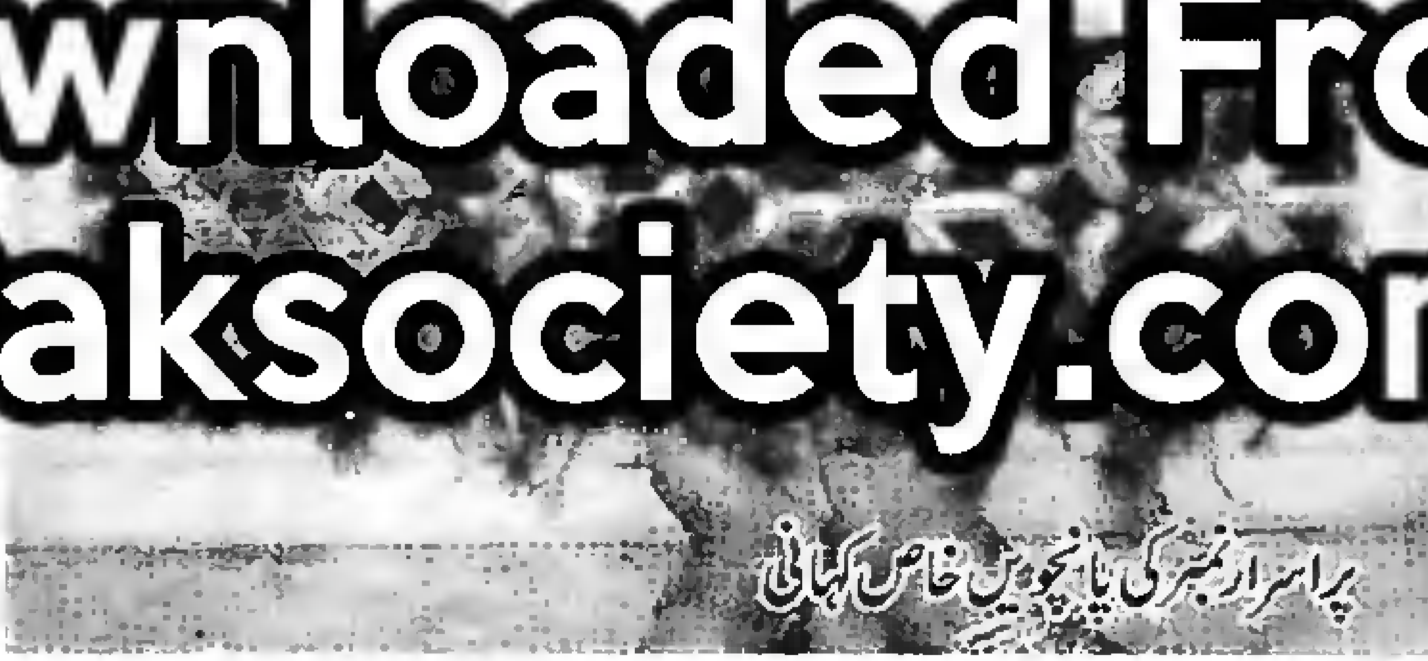
اس نے بات ختم کرنے کے بعد جھک کر میرے ماتھے پر بوسہ دیا اور کمرے سے باہر چلا گیا، اس کی بات سن کر مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی، وہ یقیناً کسی غیر مرئی مخلوق سے تعلق رکھتا تھا، کچھ دیر بعد سب گھر والے اندر آ گئے۔

''بیٹا تم زخمی کیسے ہو گئے۔'' ابو نے اندر آتے ہی پوچھا۔

''وہ ابو.. ایک چھوٹا سا حادثہ ہو گیا تھا، میں اپنی گلی تک تو جیسے تیسے کر کے پہنچ گیا، لیکن پھر اچانک گر کر بے ہوش ہو گیا۔'' امی بے اختیار میری طرف دیکھے جا رہی تھیں وہ میری اتنی سی چوٹ پر اتنی پریشان ہو گئی تھیں اگر آج مجھے کچھ ہو جاتا تو ان کا کیا حال ہوتا، میں نے امی کی گود میں سر رکھا اور چھوٹے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

دوسرے ہی دن فوزیہ کے گھر والے اچانک ہی کسی اور جگہ چلے گئے تھے۔ مہینوں بعد بھی ان کی کوئی خبر نہ آئی تو مجبوراً ہمیں اس شادی کی تاریخ کو ختم کرنا پڑا تھا۔ آج میں اپنے چار بچوں کے ساتھ ایک بھرپور زندگی گزار رہا ہوں اور فریحہ جیسی حسین ترین اور محبت کرنے والی بیوی کے ساتھ پر میں خدا کا جتنا شکر کروں، کم ہے۔

☆☆☆





جوگی

ارم ناز

اس جوگن کی داستانِ عجب، جس کا جوگی آج بھی اس کے ہمراہ ہے

شکل وصورت کامیاب زندگی گزارنے کے لیے کتنی اہمیت کی حامل ہے، اس کا اندازہ مجھ سے زیادہ کسے ہو سکتا ہے۔ مجھ سے بڑے دو بھائی خوب صورت، مجھ سے چھوٹی دو بہنیں خوب صورت، میرے ماں باپ خوب صورت پھر پتا نہیں میں کیوں اتنی بدصورت تھی۔ موٹے ہونٹ، موٹی ناک، چھوٹی آنکھیں سیاہ رنگ غرض یہ کہ تمام بری چیزیں ایک جگہ اکٹھی ہو گئی تھیں۔ میں بچپن سے جوانی تک لوگوں کے طنز کا نشانہ بنتی رہی۔ جو بھی مجھے دیکھتا مجھ پر جملہ ضرور کستا۔ ''اندھیری رات، کالی چڑیل، کوئلے کی کان، کلو پری، کلموہی اور اسی طرح کے کئی جملے میں سن سن کے تنگ آ گئی تھی۔

میرے لیے کپڑے خریدے جاتے تو رنگ کا انتخاب بڑا سوچ سمجھ کے کیا جاتا۔ چپل خریدی جاتی تو ہمیشہ بند جوتا کیونکہ اماں کا خیال تھا کہ بند جوتے میں میرے سیاہ اور بھدے پیر چھپے رہتے ہیں۔ میرے منہ دھونے پر میری بہن طنز کرتیں۔

''جتنا بھی رگڑ رگڑ کر منہ دھولو، چاہے جتنا صابن گھس دو مگر تمہارے چہرے پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ تم وہی کلوٹی کلوٹی رہو گی۔''

میرا رنگ صرف کالا ہوتا تو گزارا تھا۔ میرے نین نقش بھی سونے پہ سہاگا تھے۔ صرف ابو ہی تھے جو میرا خیال کرتے ورنہ سب گھر والوں کو مجھ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ دو خوب صورت بھائیوں کے لیے خوب صورت بھابیاں آ چکی تھیں۔ میرے لیے جو بھی رشتہ آتا وہ میری بہنوں کو پسند کر لیتے یہی سب ہوتے ہوتے میری بہنوں کی بھی شادی ہو گئی اب صرف میں ہی کم نصیب رونے کو رہ گئی تھی۔ خدا جانے میری ماں نے مجھے کیا کھا کے پیدا کیا تھا اور اس شکل پر میرا نام نازنین بھی رکھ چھوڑا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتی کہ خوب صورت لوگوں کی زندگی کتنی آسان اور زندگی سے بھرپور ہوتی ہے۔ حسن سے محبت کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش میرے دل میں بھی تھی مگر اس شکل وصورت کے ساتھ یہ ناممکنات میں سے تھا۔ ٹھکرائے جانے کے احساس سے میں چڑچڑی بھی ہو گئی تھی یوں سمجھ لیں کریلا وہ بھی نیم چڑھا۔

بدصورت کو منحوس تصور کیا جاتا ہے۔ میں اپنی ماں

کی نظر میں بدصورت تھی۔ میں انڈے سے نکلنے والا وہ چڑیا کا بچہ تھی جو چڑیا سے بالکل مشابہت نہیں رکھتا بلکہ چڑیا کا بچہ کم اور کیڑا مکوڑا زیادہ لگتا ہے۔ میں بس زندگی کو دھکا دے رہی تھی۔

☆......☆

ان ہی روکھے پھیکے دنوں میں میری خالہ جان امریکہ سے آگئیں۔ ان کے ساتھ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بھی تھا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ خالہ جان اماں کی بہن ہوتے ہوئے بھی ان سے بہت مختلف تھیں۔ خالہ جان دو تین سال بعد پاکستان کا چکر لگاتیں تو سیر سپاٹوں کے پروگرام بنتے۔ اس مرتبہ بھی ہم نے کلری جھیل جانے کا پروگرام بنایا۔ طے یہ پایا کہ ہم ہفتے کی صبح گھر سے نکلیں گے اور ٹھٹھہ میں عبداللہ شاہ اصحابی کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے کلری جھیل جائیں گے۔

میری دونوں بہنیں جمعہ کی رات ہی آگئیں تمام تیاری مکمل ہوگئی۔ خالہ جان کے بچے بہت خوش تھے۔ صبح سب تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے بھی نہا کر لان کا جوڑا پہن لیا کیونکہ یہ گرمیوں کے دن تھے۔

ہم پہلے مزار پر پہنچے۔ فاتحہ پڑھی۔ ٹھٹھہ میں اور بھی بہت سے مزارات ہیں مگر شہنشاہی عبداللہ شاہ اصحابی کی ہے۔ میں مزار سے باہر آ کر گھنے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ گئی۔ ماحول پر گہرا سکوت طاری تھا۔ دور کہیں ریڈیو پر الن فقیر کی آواز گونج رہی تھی۔ کتنی پرسوز آواز تھی۔ لگتا تھا ساری کائنات اس آواز میں سمٹ آئی ہے۔ میں آٹھ دس قدم چل کر ایک گھنے درخت کے سائے میں منڈیر پر بیٹھ گئی۔ درختوں پر بیٹھے پرندے بھی خاموش تھے۔ لگتا تھا شریر بچے منہ پر انگلی رکھ کر چپ بیٹھے ہیں۔ الن فقیر کی آواز میں وہ سحر تھا کہ پرندے بھی خاموشی سے سن رہے تھے۔



کچھ فاصلے پر بیٹھا جوگی گاہے بگاہے میری طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے بری نہیں لگ رہی تھی۔ جوگی معمولی شکل وصورت کا تھا مگر آنکھیں غضب کی تھیں۔ خاص کشش والی آنکھیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی کوشش کی بس ایک لمحہ اس سے زیادہ میں اس سے نظر نہ ملا پائی اور اسی ایک لمحے میں صدیوں کا سفر طے ہو گیا۔ جوگی میرے لیے اجنبی نہ رہا میں جوگی کی اور جوگی میرا ہوگیا۔

ہم لوگ ٹھٹھہ سے کلری پہنچے۔ سب نے پکنک کا خوب لطف اٹھایا مگر میں گم صم تصویر بنی ایک جگہ بیٹھی رہی۔ دماغ کہتا تھا جوگی کے علاوہ کچھ نہ سوچ۔ آنکھیں کہتی تھیں جوگی کے علاوہ کچھ نہ دیکھ۔ دل جوگی جوگی کی پکار لگا رہا تھا۔ دل، دماغ، آنکھیں میرے ہوتے ہوئے بھی میرے قابو میں نہ تھے۔

اچھا خاصا بیٹھا بیٹھا گم ہو جاتا ہوں
اب میں اکثر میں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں

مغرب کے وقت پکنک اختتام کو پہنچی۔ رات دس بجے ہم گھر پہنچے مگر میں تو اپنا آپ ہی کہیں کھو آئی تھی۔

☆......☆

بستر پر لیٹی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رات کے آخری پہر نیند آئی تو خواب میں جوگی مسکراتے ہوئے مجھے بلا رہا تھا۔ میں کھنچی چلی جارہی تھی۔ دور کہیں اماں ابو کی آواز آرہی تھی۔ وہ مجھے آگے بڑھنے سے روک رہے تھے مگر میں جوگی کی جوگن بننے جارہی تھی۔ میں جوگی کے قریب پہنچ گئی۔ جونہی جوگی نے میرا ہاتھ تھاما میرے وجود میں ایک روشنی کا جھماکا سا ہوا اور آنکھ کھل گئی۔

میں بستر پر لیٹی پسینے میں شرابور ہورہی تھی۔ صبح ہونے کو ہی تھی کچھ دیر بعد دن چڑھ آیا۔ روزمرہ کے کام ہوتے رہے۔

رات آئی میں سوگئی اور پھر خواب میں جوگی کی ہمراہی میں ایک حسین وادی کی سیر کی۔ اب تو میں ہر رات جوگی کے ساتھ ہوتی۔ دن بے چینی میں گزرتا اور رات کا انتظار رہتا۔ رات آتے ہی جوگی خواب میں آجاتا۔ عہد و پیماں ہوتے، روشنی پھیلتے ہی خواب ٹوٹ جاتا۔ میری حالت عجیب پاگلوں کی سی ہوگئی تھی۔ دن بھر کھوئی کھوئی رہتی۔ میں نہیں جانتی تھی یہ عشق کی کون سی منزل ہے۔ میں اپنے محبوب کے ساتھ خوابوں کے سفر میں ہی خوش تھی۔ اب میں دن میں آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی تھی۔ درحقیقت میں جوگی سے بات کررہی ہوتی تھی۔ کبھی رات خواب میں بھی جوگی جوگی چیخنے لگتی۔ گھر والے سوتے سے اٹھ جاتے اور میرے گرد جمع ہو جاتے۔ میں ہوش وخرد سے بیگانہ ہوتی جارہی تھی۔

ابو کا خیال تھا مجھے ہسٹریا کے دورے پڑتے ہیں جب کہ اماں کی سوچ اس کے برعکس تھی وہ کہتی تھیں آسیب کے زیر اثر ہے۔ سال بھر دوا دارو ہوتا رہا۔ کبھی یہ ڈاکٹر کبھی وہ ڈاکٹر مگر سب بے سود...... مجھ پر دواؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

پھر عاملوں کے چکر کبھی یہ عامل کبھی وہ عامل، آستانے پر آستانہ بدل دیا گیا مگر نتیجہ صفر۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا احساس محرومی ہے۔ کچھ لوگ کہتے تھے شادی کردو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

اماں کو کسی خاتون نے مشورہ دیا۔ ”ٹھٹھہ لے جاؤ شاید وہاں جا کر ٹھیک ہوجائے۔“

خاتون کی بات پر غور کیا تو اماں کو خیال آیا کہ بیماری بھی تو وہیں سے ہو کر آئی ہے ٹھیک بھی وہیں سے ہوگی۔

☆......☆

اماں اور بھائی مجھے ٹھٹھہ لے گئے۔ میں گاڑی سے اترتے ہی دوڑی اور دوڑ کر وہیں پہنچ گئی جہاں جوگی بیٹھا تھا مگر وہاں جوگی نہ تھا۔ میں اونچے نیچے راستوں پر دوڑنے لگی۔ گرتی پھر اٹھ جاتی پھر دوڑتی نہ چپل کا ہوش نہ دوپٹے کی فکر سر پر دھوپ برساتا سورج اور میں دوڑتی پھرتی جوگی جوگی چیختی۔

کیا محبت اتنی ہی طاقت ور ہوتی ہے؟ محض ایک نظر نے مجھے پاگل بنادیا۔ کچھ تو غیر معمولی تھا جوگی میں

ورنہ ایک نظر میں یونہی تو کوئی پاگل نہیں ہوتا۔ میں سارا دن بھاگتی رہی۔

شام ڈھلے تھک ہار کے، وہیں گر گئی۔ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ اماں اور بھائی مجھے اٹھا کر مزار کے احاطے میں لے آئے۔ جو لوگ مزار پر حاضری کو گئے ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا کہ مزار کے ساتھ ہی خواتین کے لیے ایک کمرہ بنا ہے، جس میں مسافر خواتین ٹھہرتی ہیں۔ مجھے بھی اسی کمرے میں ڈال دیا گیا۔

ادھر میرا یہ عالم تھا کہ ہوش سے بیگانہ ہوتے ہی جوگی میرے پاس آ گیا۔ میں نے لپک کر جوگی کا دامن پکڑ لیا۔

''جوگی میں اب تمہیں جانے نہ دوں گی۔ میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ کیوں مجھے اپنے عشق میں پاگل کر کے چھوڑ گئے۔ اگر تم میرے ساتھ نہ گئے تو میں یہیں پتھروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گی۔ تم جانتے ہو میں جب سوہنی بھی تو کچے گھڑے کی پروا کیے بغیر چناب میں اتر گئی۔ سسی بنی تو زمین میں سما گئی۔ جوگی تاریخ گواہ ہے کہ میں قربانی سے کبھی نہیں ڈری۔''

میں نے اپنی محبت کا واسطہ دے کر جوگی کو اپنے ساتھ جانے پر راضی کر لیا۔ ہوش میں آتے ہی پہلا لفظ میرے منہ سے یہی نکلا۔

''گھر چلیں اب میں ٹھیک ہوں۔''

اب جوگی میرے ساتھ ہی میرے کمرے میں رہتا ہے۔ جوگی کہتا ہے نازنین تم بہت خوب صورت ہو۔ بالکل سنگھاڑے جیسی۔ باہر سے سیاہ مگر اندر سے سفید۔ تمہارا ظاہر کچھ بھی ہو مگر باطن بہت ستھرا ہے۔ ہم پہروں باتیں کرتے ہیں مگر اماں کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ ہر ایک سے کہتی پھرتی ہیں۔

''میری جوان بچی پاگل ہو گئی ہے۔ خود سے باتیں کرتی ہے۔''

اماں کو شاید جوگی نظر نہیں آتا۔ اب انہیں کیسے بتاؤں کچھ چیزیں عقل سے ماورا بھی ہوتی ہیں۔ کچھ لوگوں کو ہم صرف دل کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ جوگی بھی ایسا ہی ہے۔

☆☆☆

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
- ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
- کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ایڈ فری لنکس
- ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
- ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-





لاہوری گیٹ کا وہ مکان

محمد بلال فیاض

اُس جوڑے کی کہانی جو نئے مکان میں شفٹ ہوا تھا'
مگر وہ جگہ تو ہزاروں برس سے کسی اور ہی مخلوق کی آماجگاہ تھی

جیسے ہی اس نے کچن کی دہلیز پر قدم رکھا، وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ سامنے سلیب پر کوئی عجیب سی چیز پڑی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی آگے بڑھی تو بے اختیار خوف کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ سلیب پر چولہے کے پاس ایک بڑے سائز کی چمگادڑ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ وہ الٹے قدموں واپس کچن کی دہلیز تک آئی۔ ایک ہاتھ سینے پر رکھے وہ یک ٹک پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ کالی سی وہ بدصورت چمگادڑ آخر آ کہاں سے سکتی تھی۔ کچن کے روشن دان میں جالی لگی ہوئی تھی۔ کچن سے باہر نکل کر اس نے ہر طرف کا جائزہ لیا۔ تمام کھڑکیاں اور روشن دان جالیوں سے پُر تھے۔ پھر یہ چمگادڑ؟ دماغ میں بہت سے سوالیہ نشان چکرانے لگے۔

''نسرین خالہ.... خالہ....'' وہ چلائی۔ چہرے پر خوف اور حیرت کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔ خالہ ہاتھ میں جھاڑن پکڑے بھاگی بھاگی آئی تھی۔

''وہ.... وہاں.... وہ دیکھیے۔'' اس کے اشارہ کرنے پر خالہ کچن کی طرف بڑھی۔ قریب جا کر جانچتی نظروں سے وہ بغور اسے دیکھتی رہی۔

''خالہ قریب نہ جائیں کہیں یہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔'' وہ کچن کی دہلیز پر کھڑی ہی ہدایات دے رہی تھی۔ اندر جانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

''ارے کچھ نہیں ہوتا بی بی جی۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھی۔ ہاتھ بڑھا کر انگلی سے جیسے ہی اس چمگادڑ کو چھوا تو اسی ہی لمحے وہ چمگادڑ حرکت میں آئی اور تیزی سے پھڑ پھڑاتی ہوئی، نادیہ کے کندھے کو چھوتی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور کندھے کو چھوتے ہی جیسے اس کی جان نکل گئی تھی۔ کچن سے نکل کر وہ چمگادڑ کہاں غائب ہوئی اس بات کی فکر اس وقت کسے تھی۔ ایک زوردار چیخ تھی جو نادیہ کے حلق سے برآمد ہوئی تھی اور خالہ کچن میں اپنی جگہ پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

اس نے فوراً اظہر کو فون کیا مگر وہ اپنے باس کے ساتھ کسی میٹنگ میں مصروف ہونے کی وجہ سے فوراً نہ آ سکا۔ حواس کچھ بحال ہوئے تو اس نے خالہ کے ساتھ مل کر گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر وہ چمگادڑ تو یوں غائب ہوئی تھی جیسے سرے سے وہاں آئی ہی نہ ہو۔

''آخر چگا دڑ گئی تو گئی کہاں؟'' تھک ہار کر وہ صوفے پر ڈھے گئی۔ خالہ پاس ہی نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

''نجانے کہاں دفعان ہوئی..... میں نے تو اسے کچن سے نکلتے ہی دیکھا تھا..... اس کے بعد کا پتا نہیں۔'' خالہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔ نادیہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تھیں۔

''آپ لوگوں کے آنے سے پہلے یہ گھر کچھ عرصہ بند رہا تھا اور بند گھروں میں ایسی ویسی چیزیں نکل ہی آتی ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں بی بی جی۔'' خالہ کی اس بودی دلیل پر اس نے گھور کر اسے دیکھا کیونکہ پچھلے تین دن سے تو وہ خالہ کے ساتھ مل کر اس گھر کو صاف کر کر کے ہلکان ہوگئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اب گھر شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔

اور چگا دڑ کسی سوالیہ نشان کی طرح ہی رہی۔ وہ کہاں سے آئی اور کہاں گئی۔ یہ معمہ حل نہ ہو سکا۔

انہیں اس مکان میں شفٹ ہوئے تین دن ہی ہوئے تھے۔ اندرون شہر کے ایک بہتر محلے میں انہیں یہ مکان کافی سستے داموں مل گیا تھا۔ ابھی انہیں اس مکان میں آئے ایک دن ہی ہوا تھا جب اگلے دن صبح صبح بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی اور پھر دروازہ زور زور سے بجایا جانے لگا۔ ان کے اس گھر میں شفٹ ہونے کے بعد یہ پہلی اجنبی دستک تھی۔

''کون؟'' نادیہ نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھنا ضروری سمجھا کیونکہ احمر اس وقت ناشتا لینے باہر گیا ہوا تھا اور وہ گھر میں اکیلی تھی۔

''دروازہ کھولیں بی بی جی..... میں ہوں نسرین۔'' ایک شفیق زنانہ آواز آئی۔ اس نے پرسوچ انداز میں بند دروازے کو دیکھا۔ فی الوقت اس کے ذہن میں ایسی کوئی نسرین نامی خاتون نہ آسکی جسے وہ جانتی ہو۔

دروازہ ایک بار پھر بجایا گیا۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ درمیانی عمر کی ایک عورت نے نرم مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی اور ساتھ ہی سلام جھاڑا۔

''سلام بی بی جی! میرا نام نسرین ہے.... اور ویسے



مجھے سب خالہ، خالہ کہتے ہیں۔ آپ لوگ شاید یہاں نئے شفٹ ہوئے ہیں۔ آپ سے پہلے جو باجی یہاں رہتی تھیں وہ تو مجھے اچھی طرح جانتی تھیں۔ میں اس گھر میں صفائی کرتی تھی، بلکہ کپڑے، برتن سب کچھ..... محلے داروں سے مجھے پتا لگا کہ یہ گھر پھر سے آباد ہوگیا ہے تو سوچا کہ پوچھ لوں آپ کو گھر کے کام کاج کے لیے کسی عورت کی ضرورت ہے تو میں حاضر ہوں۔ بیوہ عورت ہوں جی..... اور یہی کام کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہوں۔'' اس نے ایک ہی سانس میں سارا تعارف کرا ڈالا۔ وہ پہلے چپ چاپ سنتی رہی، پھر بولی۔

''یہاں، اس محلے میں کس گھر میں کام کرتی ہیں آپ؟''

''یہ جو گلی کی نکڑ پہ سبز گیٹ والا گھر ہے نا باجی فرحت کا، وہاں کام کرتی ہوں جی۔ آپ اپنی تسلی کرلائیں۔ میں جانتی ہوں آج کل حالات اچھے نہیں اور انجان بندے پر اعتبار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن میں کوئی ایسی ویسی عورت نہیں ہوں بی بی جی۔''

''ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں....'' نادیہ شرمندہ سی ہوگئی۔ شاید خالہ نے اس کی جانچتی نظروں کے جواب میں یہ وضاحت پیش کی تھی۔

''ٹھیک ہے خالہ، آپ آج دوپہر سے ہی آجایئے۔'' کہہ کر وہ دروازہ بند کیے اندر آگئی۔ وہ عورت اسے شریف اور ضرورت مند لگی تھی مگر دل ہی دل میں اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ فرحت باجی کی طرف جا کر تصدیق ضرور کرلے گی کیونکہ آج کل کے دور میں واقعی کسی پر اعتبار کرنا مشکل تھا۔

دوپہر کو خالہ آگئی اور بڑی دل جمعی سے اس کے ساتھ سارا کام کروایا۔ شام کو وہ اتنا تھک چکی تھی کہ فرحت باجی کے گھر جانے اور ان سے نسرین خالہ کی بابت پوچھنے کا ٹائم ہی نہ ملا۔ سو اس نے یہ کام اگلے دن پر اٹھا رکھا۔

اگلے دن احمد کے آفس جانے کے چند گھنٹوں بعد چمگادڑ والا واقعہ رونما ہوگیا جسے لے کر نادیہ خاصی پریشان تھی۔

''ویسے خالہ ایک بات بتائیں۔ یہ گھر کب سے بند پڑا تھا؟'' کسی سوچ کے زیر اثر نادیہ اس سے پوچھ بیٹھی۔

''کافی عرصے سے بند پڑا تھا۔ کوئی گاہک ہی نہیں لگتا تھا اس کا۔ محلے والے تو سب جانتے ہی تھے کیونکہ......'' اپنی ہی رو میں بولتے بولتے وہ اچانک خاموش ہوگئی۔ نادیہ چونکی۔

''کیا مطلب؟ کیا جانتے تھے محلے والے..... اور آپ اچانک کچھ بتاتے بتاتے رک کیوں گئیں خالہ؟''

''پتا نہیں بی بی آپ ایسی باتوں پر یقین کرتی بھی ہیں یا نہیں..... مگر حقیقت تو یہی ہے کہ.....'' چند ثانیوں کے لیے وہ رکی پھر بولی۔ ''بس بی بی جی! یہاں تو کئی لوگ آئے اور کئی گئے..... آپ سے پہلے جو رابعہ باجی یہاں رہتی تھیں ان کے ساتھ بھی بہت برا ہوا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، کئی عجیب وغریب واقعات تو میری آنکھوں کے سامنے رونما ہوئے تھے۔'' بتاتے ہوئے خالہ اس کے قریب کھسک آئی۔ اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہ تھی۔ وہ یوں بول رہی تھی جیسے کسی اور کے سن لینے کا خطرہ لاحق ہو۔ نادیہ دہل کر رہ گئی۔

''کک..... کک..... کیا؟'' وہ بمشکل اتنا ہی بول پائی۔

''کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ گھر آسیب زدہ ہے۔ یہاں تو کوئی ٹکتا ہی نہیں۔ بڑے بڑے نقصان اٹھائے ہیں جی لوگوں نے جو یہاں رہ کر گئے ہیں۔ میں نے تو خود اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھا تھا۔ رابعہ باجی نے اپنے تینوں بچے گنوا دیے۔ ہائے بیچاری! مجھے تو بڑا ترس آتا تھا جی ان کی حالت پر۔ نیم پاگل سی ہوگئی تھیں۔ یقیناً یہ گھر آپ کو بڑے سستے داموں ملا ہوگا۔'' ساری باتیں بتا کر اس نے قیاس آرائی کی۔

''ہاں..... مگر.....'' نادیہ نے گھبرائی آواز میں اتنا ہی کہا تھا کہ خالہ بول اٹھی۔

''ہائے بےچاری باجی رابعہ....'' خالہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر سے شروع ہوگئی۔

''پہلے تو کئی دن گھر کی دیواروں پر خون کے چھینٹے پڑتے رہے۔ بڑے بڑے عاملوں کو لایا گیا۔ مگر قسمت میں جو لکھا ہو وہ تو ہوکر ہی رہتا ہے جی۔ ایک

رات اچانک ان کے تینوں بچے غائب ہو گئے۔ بڑا بیٹا دس سال کا تھا۔ اس کے بعد بیٹی تھی آٹھ سال کی اور سب سے چھوٹا بیٹا پانچ سال کا تھا۔ ہائے معصوم بچے۔ آج بھی سوچتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیا راتوں رات تینوں بچے خودبخود گھر سے غائب ہو گئے؟'' نادیہ آلتی پالتی مارے صوفے میں دھنس بیٹھی۔ خوف سے مزید سمٹ کر رہ گئی۔ ایک ہاتھ سینے پر دھرا تھا۔

''ارے ہاں تو اور کیا..... صبح اٹھ کر دونوں میاں بیوی نے پاگلوں کی طرح انہیں ڈھونڈا۔ پورا گھر چھان مارا مگر بچے تو کہیں نہ ملے لیکن گھر کے پچھلے صحن کا نقشہ ہی اور تھا۔ صحن میں ایک ساتھ قطار میں تین قبریں بنی ہوئی تھیں.....''

''ہائے نہیں.....'' نادیہ کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔

''ارے آگے تو سنیے بی بی جی! رابعہ باجی تو خوف سے وہیں بے ہوش ہو گئیں۔ ان کے شوہر نے پاگلوں کی طرح آگے بڑھ کر قبریں کھود ڈالیں۔ ان کے تینوں بچے قبروں میں مردہ حالت میں پڑے تھے۔ اف کیا قیامت تھی جو ان دونوں پر ٹوٹی تھی۔ ہر آنکھ اشک بار تھی۔ خدا ایسا دکھ دشمن کو بھی نہ دے۔'' خالہ نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا اور نادیہ کی تو وہ حالت تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ اس نے زندگی میں پہلی بار بے اولاد ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

''بس بی بی جی! سنا ہے کوئی ایسا زبردست آسیب ہے یہاں جو کسی کو بسنے بھی نہیں دیتا اس گھر میں۔ برباد کر کے رکھ دیتا ہے..... خدا آپ لوگوں کو محفوظ رکھے۔''

سکڑی سمٹی بیٹھی نادیہ سانس روکے، آنکھیں پھاڑے خالہ کی باتیں سن رہی تھی۔

''اور جب بچوں کا پوسٹ مارٹم کروایا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ بچوں کی موت دم گھٹنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔''

''اوہ میرے خدا! تو کیا بچوں کو زندہ سلامت قبر میں گاڑ دیا گیا تھا؟'' نادیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ہاں جی! سب یہی خیال کرتے ہیں۔ اور بچوں کی الم ناک موت سے ایک دن پہلے میں نے رابعہ باجی کے بیڈ روم میں جو منظر دیکھا میری تو جان نکل گئی جی۔''

''کک..... کیا دیکھا خالہ آپ نے؟''

''ایک صبح میں صفائی کرنے باجی کے بیڈ روم میں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ عین بستر کے درمیان میں ایک کالا سر کٹا کتا پڑا تھا اور پورے بیڈ پر تازہ خون پھیلا ہوا تھا۔ میں الٹے قدموں واپس بھاگی۔ رابعہ باجی اس وقت کچن میں تھیں۔'' خالہ ابھی بات کر رہی تھی کہ بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی۔ گھنٹی بجانے کا وہ مخصوص سا اسٹائل احمر کا ہی تھا۔

''احمر آ گئے۔'' نادیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''میں کھولتی ہوں دروازہ۔'' خالہ بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نن..... نہیں ..... خالہ میں کھولتی ہوں۔ بلکہ ہم دونوں اکٹھے چلتے ہیں۔'' مارے خوف کے نادیہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ دو منٹ بھی تنہا بیٹھنا اس کے لیے سوہان روح تھا۔

احمر کے آنے پر نادیہ نے خالہ کو چھٹی دے دی اور خود احمر کو لیے کمرے میں آ گئی۔

''احمر! ہم سے تو بڑی غلطی ہو گئی جو یہ گھر خرید لیا۔'' پریشانی اور خوف سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''ارے یار! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ایک چمگادڑ کو لے کر تم اتنا سیریس ہو رہی ہو۔ میں بھی بھاگم بھاگ آیا آفس سے کہ پتا نہیں محترمہ کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا زندگی میں کبھی چمگادڑ نہیں دیکھی تم نے؟''

''یہ بات نہیں ہے کہ میں نے کبھی چمگادڑ نہیں دیکھی یا میں چمگادڑ سے ڈر گئی۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر چمگادڑ آئی کہاں سے اور پھر غائب کہاں ہو گئی؟''

''چمگادڑ ہی تھی، کوئی ہاتھی تو نہیں تھا جو کچن میں یا گھر میں داخل نہیں ہو سکتا اور غائب ہونے کا کیا مطلب ہے۔ ارے بھئی اڑ گئی ہو گی ادھر ادھر کہیں۔ تم پڑھی لکھی عورت ہو، دل میں ایسے وہم کیوں پال رہی ہو۔'' احمر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے خالہ نسرین کی

بتائی ساری باتیں اس کے گوش گزار کر دیں۔

''یہ خالہ تمہیں حوصلہ دینے کے بجائے تمہیں ڈرا رہی ہے کیا۔ عجیب جاہل عورت ہے یہ۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''اور حیرت مجھے اس بات کی ہے کہ تم نے اس ان پڑھ، ضعیف الاعتقاد عورت کی باتوں پہ یقین کر لیا۔ کمال ہے بھئی۔''

''یہ بات تو میں مانتی ہوں کہ وہ ان پڑھ عورت ہے مگر اس نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے احمر۔ وہ نہ ہوتی تو شاید میں بے ہوش پڑی ہوتی اس وقت.... خالہ کی موجودگی سے میرے دل کو بڑا حوصلہ ہوا اور میرا دل کہتا ہے کہ خالہ کی ساری باتیں جھوٹ یا فرضی ہرگز نہیں ہیں.... بھلا وہ کوئی میری دشمن ہیں جو ایسے فرضی واقعات گھڑ گھڑ کر مجھے سنائیں گی۔ کچھ تو ہے۔ کچھ تو ہے ان واقعات کے پس پردہ۔''

''یار تمہارے منہ سے ایسی باتیں سوٹ نہیں کرتیں۔ تم تو ایک ایجوکیٹڈ عورت ہو۔ اگر کوئی ان پڑھ عورت ایسی باتیں کرتی تو مجھے حیرت نہ ہوتی۔'' اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

''اس کائنات پر جنات کے وجود سے تو انکار نہیں ہے نا آپ کو؟ اور ایک بات آپ مجھے بتائیں کہ ہمیں یہ گھر اتنا سستا کیوں ملا؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ اس علاقے میں زمین کا کیا ریٹ ہے اور اس حساب سے تو یہ گھر ہمیں کوڑیوں کے مول ملا ہے۔ آخر کیوں؟''

''نادیہ تم کیوں دو مختلف باتوں کو آپس میں گڈمڈ کر رہی ہو۔ تمہیں یاد ہوگا ڈیلر نے ہمیں بتایا بھی تھا کہ مالک مکان جلد از جلد بیرون ملک شفٹ ہونا چاہتا ہے اور اس کے پاس وقت بھی کم تھا۔ وہ جلد از جلد اپنی جائیداد فروخت کرنے کے چکر میں تھا۔ اور پلیز اب یہ سوال مت اٹھانا کہ وہ اتنی جلدی بیرون ملک کیوں جانا چاہتا تھا، کیونکہ یہ اس کا پرسنل معاملہ تھا۔'' احمر کی باتوں پر نادیہ نے مزید بحث کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ احمر اپنی ضد کا پکا ہے۔ وہ کبھی بھی سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرے گا۔

مگر وہ رات نادیہ پر خاصی بھاری گزری تھی۔ ساری رات وہ سو نہ سکی۔ کبھی اس کی آنکھوں کے سامنے سر کٹا کالا کتا آجاتا اور کبھی بدصورت چمگادڑ۔ تین بچوں کو گھر کے پچھلے صحن میں قبریں بنا کر ان میں زندہ گاڑ دینے والی بات اس کے ذہن کی اسکرین پر ساری رات کسی فلم کی طرح چلتی رہی تھی۔

☆......☆

اگلے دن احمر کے دفتر جانے کے بعد وہ خالہ کا انتظار کرنے لگی۔ آج وہ معمول سے کچھ لیٹ ہوگئی تھی۔ آدھا گھنٹہ مزید انتظار کے بعد بھی جب وہ نہ آئی تو اس نے دھوپ لگوانے کے لیے بستر اٹھائے اور چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چھت کا دروازہ کھول کر جیسے ہی اس نے چھت پر پہلا قدم رکھا، خوف و دہشت سے بے اختیار اس کی چیخ نکل گئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ پتھرا کر رہ گئی۔ یہ سب اسے اپنی آنکھوں کا دھوکا محسوس ہو رہا تھا۔ پوری چھت اس وقت چھوٹے بڑے چمگادڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ بدصورت ہئیت کے بہت سے چمگادڑ چھت پر اڑتے گرتے بڑا ہی ہیبت ناک منظر پیش کر رہے تھے۔ دن کی اس روشنی میں بھی اسے لگا جیسے وہ کوئی رات کے آخری پہر کا ڈراؤنا خواب ہے۔ ایک جھٹکے سے وہ الٹے قدموں پیچھے بھاگ آئی تھی بستر تو سیڑھیوں پر ہی گر گیا تھا۔ کچھ دیر بعد خالہ آئی تو وہ ڈرتے ڈرتے دروازے تک گئی۔

''شکر ہے خالہ آپ آگئیں۔'' وہ اس سے لپٹ گئی۔

''ارے کیا ہوا بی بی! خیریت تو ہے؟''

''بس خیریت ہی تو نہیں ہے خالہ۔'' یہ کہہ کر اس نے سارا واقعہ ان کے گوش گزار کیا۔

''ہائے میرے خدا۔'' خالہ نے سینے پر دو ہتھڑ مارا۔ ''بی بی میری بات مانو تو یہاں سے چلی جاؤ۔ اس سے پہلے کہ یہ آسیب تمہیں یا تمہارے شوہر کو کوئی جانی نقصان پہنچائے۔'' وہ جو پہلے ہی خوف زدہ تھی خالہ کی بات سن کر مزید دہل گئی۔

شام کو احمر آفس سے آیا تو نادیہ آج کا تازہ واقعہ اس کو سنانے کے لیے بے چین تھی۔ اس نے خاموشی سے سارا واقعہ سنا۔ دل ہی دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ نادیہ کو وہم ہو چلا ہے اور اب اس کے وہم کا علاج تسلی

کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ اسے اس بات کا احساس دلاتا کہ وہ مستقل وہم کا شکار ہو گئی ہے تو ایک نئی بحث کا آغاز ہو جاتا تھا سو اس نے فی الوقت بات بدلنا ہی مناسب سمجھا۔

''تم فکر نہ کرو۔ اللہ خیر کرے گا۔ تم بس جلدی سے میرے لیے کھانا لگاؤ۔ بہت بھوک لگی ہے۔ میں جلدی سے نہا کر فریش ہو جاؤں۔'' یہ کہہ کر وہ واش روم میں گھس گیا۔ نادیہ مرے مرے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

پندرہ منٹ بعد وہ واش روم سے باہر نکلا تو ششدر رہ گیا۔ اٹیچ واش روم کی دہلیز پر قدم رکھے وہ ساکت تھا۔ بستر کی چادر جو پندرہ منٹ پہلے بے داغ تھی اب اس پر جابجا تازہ خون کے دھبے تھے۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے قدموں سے آگے بڑھا۔ خون کے تازہ سرخ قطرے کو انگشت شہادت سے چھوا اور چند لمحے بغور دیکھتا رہا۔ یکا یک اسے احساس ہوا کہ خون اس کی انگلی کی پور سے بہہ رہا ہے۔ بالکل اسی جگہ سے جہاں سے اس نے بستر پر موجود خون کو چھوا تھا۔ اس نے کندھے پر پڑے تولیے سے انگلی صاف کی مگر خون دوبارہ بہنا شروع ہو گیا۔ کبھی وہ حیرت سے اپنی انگلی سے بہتے خون کو دیکھتا اور کبھی بستر پر موجود خون کے چھینٹوں کو۔ یہ وہم ہرگز نہ تھا۔ اگر یہی بات اسے نادیہ بتاتی تو وہ ہرگز یقین نہ کرتا اور اسے اس کا وہم قرار دے دیتا مگر اس غیر معمولی نوعیت کے واقعے نے فی الوقت اس کے حواس منجمد کر دیے تھے۔

''کھانا تیار ہے احمر، آجائیں۔ میں کب سے آپ کا ویٹ کر رہی ہوں۔'' اپنی ہی رو میں بولتی وہ اندر داخل ہوئی لیکن اندر کا منظر دیکھ کر اس کی زبان تالو سے چپک گئی تھی۔

☆......☆

''جب تک خالہ نہ آجائیں آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر آفس نہ جائیے گا۔'' اگلے دن صبح ناشتے کے بعد نادیہ نے اسے بڑی فکرمندی سے کہا تھا۔ وہ رات دونوں نے تقریباً جاگتے ہی گزاری تھی۔

''فکر نہ کرو، میں تب ہی جاؤں گا جب خالہ آجائے گی۔ تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتا۔'' اس نے تسلی دی۔

''اور پلیز کچھ کریں احمر۔ کوئی اور گھر دیکھیں۔ ہمیں جلد از جلد اس گھر کو چھوڑ دینا چاہیے۔ پہلے تو آپ میری بات پر یقین نہیں کرتے تھے مگر اب تو آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ اس گھر میں کیسے کیسے عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔''

''تم فکر نہ کرو.....میں کچھ کرتا ہوں۔''

اسی وقت بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی۔

''لگتا ہے خالہ آگئیں۔'' نادیہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆......☆

شہروز اس کا کولیگ ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا دوست بھی تھا۔ آفس میں آکر چند ضروری کام نمٹانے کے بعد وہ شہروز کے کیبن میں چلا آیا اور سارے واقعات من و عن اس کے گوش گزار کر دیے۔ وہ خاموشی سے سب سنتا رہا پھر بولا۔

''بات تو خاصی تشویش ناک ہے۔ میں ایک بابا جی کو جانتا ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ اس سلسلے میں تمہاری مدد ضرور کریں گے۔''

''پھر کب چلیں ان کے پاس؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''جب تم کہو۔''

''ٹھیک ہے آج آفس سے واپسی پر چلتے ہیں۔'' وہ جھٹ سے بولا کیونکہ وہ جلد از جلد ان سے ملنا چاہتا تھا اور اب تو اسے بھی کافی حد تک یقین ہو چلا تھا کہ گھر میں 'کچھ' ہے۔

اس نے اپنی انگشت شہادت کو غور سے دیکھا جہاں ابتدائی طبی امداد کے بعد خون تو اب رک چکا تھا مگر ایک بڑا سا زخم کا نشان وہاں موجود تھا جو اس کے لیے کسی معمے سے کم نہ تھا۔

☆......☆

احمر کے آفس سے آنے تک اس نے خالہ کو روک کے رکھا تھا کیونکہ تنہا رہنے کا سوچ کر ہی اس کے رونگٹے

کھڑے ہو جاتے تھے۔
اس دن احمر آفس سے واپس آیا تو اس کے ہمراہ ایک لمبی سفید داڑھی والے بزرگ تھے۔ احمر نے نادیہ کو ایک طرف لے جا کر باباجی کے بارے میں بتایا تو اسے امید کی ایک کرن نظر آئی۔
باباجی پورے گھر کا بغور جائزہ لیتے رہے۔ گھر کے تمام افراد، احمر، نادیہ اور حتیٰ کہ خالہ کو بھی گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ پھر ہنکارا بھر کے بولے۔
''گھر میں کل کتنے افراد رہائش پذیر ہیں؟'' اس دوران وہ ہاتھ میں تسبیح لیے مسلسل کچھ پڑھتے چلے جا رہے تھے۔
''ایک سو بیس۔'' بے اختیار خالہ نسرین کے منہ سے نکلا۔ نادیہ اور احمر نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ انہیں خالہ کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔ نادیہ کو خالہ سے اس بے وقوفی کی توقع نہ تھی۔ باباجی بھی پورے کے پورے خالہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ گڑبڑا کر بولی۔
''معاف کیجیے گا..... میں مکان نمبر بتا بیٹھی..... یہ مکان نمبر ایک سو بیس ہے۔'' اس بودے جواز پر احمر اسے گھور کر رہ گیا۔ سوال گندم جواب چنا۔ خالہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔
''ہوں۔'' باباجی نے حسب عادت ہنکارا بھرا۔ پھر گھر کے در و دیوار کو بغور دیکھتے ہوئے بولے۔
''پورا کنبہ ہے۔ اچھی خاصی تعداد ہے بھئی۔''
''کیا مطلب باباجی؟ میں سمجھا نہیں۔'' وہ باباجی کو لیے ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا اور نادیہ خالہ نسرین کو لیے بیڈروم میں چلی گئی۔
''سمجھا دیں گے۔ اتنی جلدی کاہے کی ہے۔ لیکن فی الحال اتنا ہی کہیں گے کہ اس گھر میں جنات کا بسیرا ہے۔ اور تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ میاں تمہارا کام ذرا مشکل ہے مگر ہو جائے گا۔ ذرا دیر لگے گی مگر اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ تم کل آنا میرے پاس۔ ہم تمہیں کچھ تعویذات دیں گے اور ساری تفصیل بھی بتا دیں گے۔ اور جتنا زیادہ ہو سکے گھر میں قرآن کی تلاوت کیا کرو با آواز بلند۔ مصیبتوں سے بچے رہو گے۔ اچھا بھئی۔ فی الحال ہمیں اجازت دو۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
''اور ہاں میاں! ایک بات اور۔'' وہ جاتے جاتے رکے، پلٹے، پھر بولے۔ ''گھر کے تمام افراد پر کڑی نظر رکھنا۔'' یہ آخری بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ان کی اس بات کا آخر کیا مطلب تھا اور گھر میں افراد ہی کتنے تھے؟ وہ سخت الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔
☆......☆
اگلا دن بڑا عجیب تھا۔ وہ آفس کے بعد فوراً باباجی کی طرف بھاگا مگر وہاں پہنچ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ باباجی آج ہی حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے ہیں۔ اس نے اسی وقت شہروز کو کال کر کے یہ اطلاع دی، وہ بھی حیران رہ گیا۔ اس بات نے احمر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اچھے بھلے باباجی جنہیں وہ کل رات اپنے ساتھ گھر لے کر گیا تھا آج اس دنیا میں ہی نہ رہے تھے۔ بہت سے راز وہ اپنے سینے میں لیے اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ انہوں نے آج اسے تعویذ دینے کے ساتھ ساتھ بہت سی باتیں بھی بتانی تھیں مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اور ان کی گھر کے افراد پر نظر رکھنے والی بات نے تو اسے خاصا بے چین کر رکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ آج یہ عقدہ بھی کھل جائے گا مگر اس کی تو نوبت ہی نہ آئی تھی۔ بے حد رنجیدہ سا وہ گھر واپس آ گیا۔
''کیا بات ہے، خالہ جلدی چلی گئیں کیا آج؟'' گھر پر نادیہ کو اکیلا دیکھ کر اس نے استفسار کیا۔
''ہاں ان کو کوئی کام تھا، میں نے بہت روکا مگر وہ بڑی منت سماجت کر رہی تھیں۔''
''اچھا، سب ٹھیک ہے نا گھر میں؟'' اس نے مخصوص سے لہجے میں پوچھا تھا۔
''ہاں اب تک تو ٹھیک ہے۔''
''ایک بری خبر ہے۔''
''کیا؟''
''باباجی انتقال کر گئے ہیں۔''
''کیا؟؟؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی کل تو وہ.....'' وہ بھونچکی رہ گئی۔ امید کی ایک کرن جو باباجی کی صورت میں سامنے آئی تھی اب ختم ہو گئی تھی۔

''اب کیا ہوگا؟'' سینے پر ہاتھ رکھے وہ پوچھ رہی تھی۔
''اللہ خیر کرے گا..... وہ مالک ہے، کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالے گا۔'' احمر نے حسب معمول تسلی دی مگر نادیہ کی پریشانی میں رتی برابر فرق نہ آیا۔
اگلے دو دن خالہ نسرین غائب تھی۔ وہ دونوں حیران تھے۔ آخر وہ بغیر اطلاع کے گئی تو گئی کہاں؟ دو دن دونوں پر خاصے بھاری تھے۔ احمر خوب تسلیاں دینے کے بعد بڑی دیر سے آفس جاتا اور پھر بھاگم بھاگ شام سے پہلے پہلے گھر واپس آجاتا۔ دن کا وہ حصہ نادیہ اکیلی بڑی اذیت سے گزارتی۔ ہر دم دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ خوف کے سائے منڈلاتے رہتے۔ اوپر سے روز کوئی نہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہونا بھی گویا لازم تھا۔ کبھی چھت سے کسی کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آتیں، کبھی کمرے کی کھڑکی سے چمگادڑوں کے پھڑ پھڑانے کی آوازیں اور یوں لگتا جیسے بہت سے چمگادڑ کمرے کی کھڑکیوں سے اندھا دھند ٹکریں مار رہے ہیں۔ کبھی پچھلے صحن سے بہت سی عورتوں کے قہقہے سنائی دیتے۔ زرد چہرہ لیے وہ خوف سے کانپتی رہتی۔ اور ہر رات ان کے بیڈ پر خون کے چھینٹے پڑنا تو معمول کی بات ہوگئی تھی۔ دونوں کی زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔
تیسرے دن اس کے اعصاب جواب دے گئے، برداشت کی ہمت ختم ہوگئی تھی۔ اسے یاد آیا خالہ نے بتایا تھا کہ وہ گلی کی نکڑ پر فرحت باجی کے گھر میں بھی کام کرتی ہے۔ گھر میں ہونے والے پراسرار واقعات میں پھنس کر دماغ ایسا ماؤف ہوا تھا کہ وہ اب تک ان کے گھر بھی نہ جا سکی تھی۔ تیسرے دن احمر کے آفس جاتے ہی وہ نکل کھڑی ہوئی۔ فرحت باجی کو اپنا تعارف کرانے کے بعد اس نے خالہ نسرین کے بارے میں پوچھا تو وہ حیرت سے بولیں۔
''میں تو ہمیشہ سے ہی سارے گھر کا کام خود ہی کرتی ہوں..... آج تک کوئی کام والی نہیں لگوائی۔''
''کیا؟'' وہ ششدر رہ گئی۔
''تو کیا آپ کسی خالہ نسرین کو نہیں جانتیں؟''
''نہیں تو..... میں نے تو کبھی یہ نام نہیں سنا، اس محلے میں جو دو تین عورتیں مختلف گھروں میں کام کرتی ہیں، ان کو تو میں اچھی طرح جانتی ہوں، اور مجھے تو اس محلے میں رہتے ہوئے پندرہ سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے۔'' فرحت باجی کی باتیں سن کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔
پھر نسرین خالہ کون تھیں؟ کہاں سے آئیں اور کہاں گئیں؟ وہ حیرت زدہ، خوف میں ڈوبی گھر واپس آئی۔ اس وقت وہ اتنی حواس باختہ تھی کہ بیرونی دروازہ لاک کرنے کا ہوش بھی نہ رہا تھا۔
اندر داخل ہوتے ہی اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ اسے یوں لگا وہ پتھر کی ہوگئی ہے۔ لاؤنج میں صوفے پر خالہ نسرین براجمان تھی۔ وہ حیران تھی، اول تو خالہ نے کبھی اتنی جرأت ہی نہ کی تھی کہ صوفے پر اتنے طمطراق سے براجمان ہو۔ دوسرا سوال یہ اٹھتا تھا کہ خالہ اندر کیسے آئی جب کہ وہ بیرونی دروازہ لاک کرکے فرحت باجی کے گھر گئی تھی۔
''خا..... لہ..... آ..... پ..... اندر..... کک..... کیسے؟'' وہ مشکل اتنا ہی بول پائی تھی۔ جواباً خالہ نے عجیب سے انداز میں زوردار قہقہہ لگایا۔ یہ ایک غیر انسانی قہقہہ تھا۔
نادیہ کا دل بند ہونے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خالہ کی شکل تبدیل ہونے لگی۔ اس کی آنکھیں پھیل کر کانوں تک پہنچ گئیں اور نچلا جبڑا کھل کر یوں لٹک گیا جیسے فالج زدہ ہو۔
نادیہ مارے خوف کے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ یہ مناظر اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھے۔
''یہ گھر ہمارا ہے۔ ہم نے تمہیں بہت دفعہ سمجھانے کی کوشش کی کہ چلی جاؤ یہاں سے اپنے شوہر کو لے کر۔ چھوڑ دو یہ مکان۔ مگر تم لوگ نہیں سمجھے..... اور چلے تھے ہمیں یہاں سے نکلوانے..... ہاہاہا..... کہاں گیا وہ تمہارا بابا؟ اس کی بھی چھٹی کرادی ہم نے..... جو بھی ہمارے راستے میں آیا زندہ نہ بچ سکا۔''
شکل کے ساتھ ساتھ خالہ کی آواز بھی بدل گئی تھی۔
نادیہ آنکھیں پھاڑے دیکھ اور سن رہی تھی۔ اسے یہ

سب کسی ڈراؤنے خواب کی مانند لگ رہا تھا۔ اچانک گھر کے پچھلے صحن سے شور کی آواز سنائی دینے لگی اور پھر یکا یک بہت سی خوف ناک شکلوں والی عورتیں اور عجیب وغریب ہئیت والے بچے دھڑا دھڑ لاؤنج میں داخل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا لاؤنج اس غیر انسانی مخلوق سے بھر گیا۔ پچھلے صحن سے مسلسل عجیب وغریب آوازیں آرہی تھیں جیسے وہاں ابھی بھی بہت سے لوگ موجود ہوں۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہ رہی تھی۔ فق چہرہ لیے وہ بامشکل دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچا پائی تھی۔

وہ عورت جس نے خالہ نسرین کے نام سے انسانی روپ دھار رکھا تھا اچانک نادیہ کے بے حد قریب آگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ نادیہ کو چھوتی، وہ چکرا کر گری اور ہوش وخرد سے بیگانہ ہوگئی۔

☆......☆

بہت دیر سے اسے عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ بار بار کام سے توجہ بھٹک جاتی۔ شہروز نے اس کی بڑھتی ہوئی بے چینی نوٹ کی تو بول اٹھا۔

''خیریت تو ہے یار! طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں..... نہیں..... پتا نہیں..... پتا نہیں نادیہ اکیلی گھر میں کس حال میں ہوگی؟ خالہ بھی نہیں آرہی آج کل۔''

''تمہارا تو ذہن گھر میں ہی اٹکا رہتا ہے یار۔ کال کرلو گھر۔'' شہروز کے کہنے پر اس نے گھر کال کی مگر نادیہ فون ہی نہیں اٹھا رہی تھی۔ اس نے بار بار کال کی مگر جواب ندارد۔ اب اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

''تم ایسا کرو، گھر کا ایک چکر لگا آؤ.... تب تک میں کام سنبھال لوں گا۔'' شہروز کی تسلی پا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ بڑا حیران ہوا۔ بیرونی دروازہ کھلا پڑا تھا۔ نادیہ اتنی لاپروا تو ہرگز نہ تھی کہ دروازہ اس طرح کھلا چھوڑے رکھے۔ اسے انہونی کا احساس ہوا تو وہ کھلا گیٹ پار کر کے اندر داخل ہوا۔ اندر سے آنے والی عجیب وغریب آوازوں نے اسے تیز تیز چلنے پر مجبور کر دیا۔ دروازہ کھول کر وہ لاؤنج میں داخل ہوا تو اندر کا منظر دیکھ کر اس کی گھگی بندھ گئی مگر پھر نادیہ کو اس غیر انسانی مخلوق کے ہاتھوں میں دیکھتے ہی اس نے ہوش کے ناخن لیے۔ اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کی تو اسے باباجی کی بات یاد آگئی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے باآواز بلند قرآنی آیات کی تلاوت کرنا شروع کر دی۔ جو جو آیات اسے زبانی یاد تھیں وہ پڑھتا رہا۔ جب اسے کمرے میں خاموشی اور تنہائی کا احساس ہوا تو اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ نادیہ ایک کونے میں بے ہوش پڑی تھی۔ وہ برق رفتاری سے اس کی طرف بڑھا۔ اسے اٹھا کر باہر گاڑی تک لایا۔ گاڑی میں ڈال کر اس نے گاڑی فل اسپیڈ سے اسپتال کی طرف بڑھا دی۔

☆......☆

ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں سے نادیہ کو بچا لیا گیا تھا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ نادیہ کو گلا دبا کر مارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر اسے اسپتال لانے میں کچھ دیر ہو جاتی تو اسے بچانا ممکن نہ ہوتا۔ یہ عقدہ بھی کھل چکا تھا کہ باباجی نے گھر کے افراد پر نظر رکھنے کو کیوں کہا تھا۔ اس سارے واقعے کو احمر نے میڈیا اور پریس سے کیسے بچایا یہ ایک الگ کہانی ہے۔ آج اس واقعے کو کئی برس بیت چکے ہیں۔ نادیہ کے صحت یاب ہونے کے بعد ان دونوں نے غلطی سے بھی اس آسیب زدہ مکان میں قدم نہیں رکھا اور دوسرا مکان کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ مگر اتنے سال گزر جانے کے بعد آج بھی اندرون لوہاری گیٹ لاہور کے ایک محلے میں آج بھی وہ پراسرار مکان بڑی ہیبت سے کھڑا ہے۔ ویران اور خالی۔ شام کے بعد لوگ اس مکان کے آگے گزرنے سے بھی خوف کھاتے ہیں۔

☆☆☆



وہ پیتل کا دیا

مہتاب خان

مکان خریدنے سے پہلے اُس کی جانچ پڑتال کرنے والے اُس نوجوان کا قصہ عجب جو اُس گھر کے آسیب کا شکار ہو چلا تھا

میرا نام فیصل ہے اور میرا تعلق ضلع بہاولپور کے نزدیک واقع ایک گاؤں بستی سہانوالہ سے ہے۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں روزگار کی خاطر کراچی آیا تھا۔ میری طرح ہزاروں نوجوان اپنے علاقوں میں روزگار نہ ہونے کی وجہ سے بڑے شہروں کا رخ کرتے ہیں اور دوہری مشقت میں پستے ہیں۔ ایک طرف روزگار کی مشقت اور دوسری طرف اپنے گھر اور گھر والوں کی دوری برداشت کرتے ہیں۔

کراچی آنے کے بعد مجھے سائٹ ایریا میں واقع ایک گارمنٹ فیکٹری میں جاب مل گئی تھی۔ فیکٹری آنے جانے میں دقت نہ ہو، یہ سوچ کر میں نے فیکٹری کے قریب ہی رہائش کے لیے جگہ تلاش کرنی شروع کر دی تھی۔ میری فیکٹری سے قریب ترین رہائشی علاقہ میٹرو ول تھا۔ اس علاقے کے شروع میں کچے پکے مکانوں پر مشتمل زیادہ تر پٹھانوں کی ایک گنجان آبادی ہے جو آگے پہاڑی تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں زیادہ تر مزدور طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ ذرا آگے بڑھیں اور خیبر گیٹ سے داخل ہوں تو آگے متوسط طبقے کی آبادی ہے۔

میں جس وقت کا ذکر کر رہا ہوں اس وقت یہ جگہ اتنی گنجان آباد نہیں تھی نہ ہی یہ خیبر گیٹ بنا تھا۔ بہرحال اسی گیٹ کے ساتھ دائیں جانب پہلی گلی میں مجھے رہائش کے لیے ایک کمرہ باتھ روم کے ساتھ مناسب کرایے پر مل گیا تھا۔

میرے گھر کے برابر میں ایک فیملی رہتی تھی جو تین افراد پر مشتمل تھی۔ دو بیٹے اور ایک ان کی والدہ۔ یہ ایک بڑا نیک اور دیندار گھرانہ تھا۔ بڑے لڑکے کا نام سفیان اور چھوٹے کا نام نعمان تھا۔ نعمان میرا ہم عمر تھا لہٰذا بہت جلد میری اس سے اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ ان کی امی محلے کے بچوں کو قرآن پاک پڑھایا کرتی تھیں۔ بڑی نیک اور خدا ترس خاتون تھیں۔ ان دونوں بھائیوں نے بھی قرآن پاک حفظ کیا ہوا تھا۔ بڑا بھائی سفیان کسی اچھی فرم میں جاب کرتا تھا جب کہ نعمان ان دنوں گریجویشن کر رہا تھا۔

نعمان سے دوستی ہوئی تو کبھی کبھار میں ان کے گھر بھی جانے لگا یا کبھی نعمان میری طرف آ جاتا تھا۔ نعمان کی امی جنہیں میں آنٹی کہتا تھا اکثر میرے لیے کھانا بھیج دیتی تھیں۔ یوں مجھے گھر کا پکا ہوا کھانا میسر

آ جاتا تھا جو اس وقت میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا تھا۔ نعمان کا گھرانہ بھی میری طرح کرائے کے گھر میں رہ رہا تھا۔ سفیان بھائی چاہتے تھے کہ اب اپنا گھر خرید لیا جائے۔ کچھ جمع پونجی آنٹی کے پاس تھی اور کچھ پیسوں کا انتظام سفیان بھائی نے آفس سے لون لے کر کر لیا تھا۔ وہ سستا زمانہ تھا، مکان کی قیمتیں ابھی آسمان پر نہیں پہنچی تھیں۔ سفیان بھائی نے اسٹیٹ ایجنٹ کو کہہ رکھا تھا کہ اس کو بجٹ کے مطابق اگر کوئی گھر ملے تو انہیں بتا دے۔

اسٹیٹ ایجنٹ نے ہفتے بھر میں ہی ان کے لیے گھر ڈھونڈ لیا تھا۔ یہ گھر ہماری ہی گلی میں واقع تھا۔ ہماری گلی کافی طویل ہے اور آگے جا کر یہ ایک چھوٹے سے قبرستان سے جا ملتی ہے۔ وہ گھر نعمان کی فیملی کے بجٹ کے مطابق اور اچھا بنا ہوا تھا مگر قباحت یہ تھی کہ وہ قبرستان کے سامنے واقع تھا۔

میں اس شام نعمان کے گھر گیا تو آنٹی نے بتایا کہ گھر بہت اچھا بنا ہوا ہے۔ وہ اور نعمان آج ہی وہ مکان دیکھ کر آئے تھے۔ تین کمروں پر مشتمل یہ مکان ان کی فیملی کے لیے کافی تھا۔ ایک فاضل کمرہ مکان کی چھت پر بھی بنا ہوا تھا۔ آنٹی نے مجھ سے کہا کہ فیصل بیٹا اگر ہم نے وہ خرید لیا تو اوپر والا کمرہ تم لے لینا۔ ”میں بھی خوش ہو گیا۔

”ٹھیک ہے آنٹی جو کرایہ میں ابھی مالک مکان کو دیتا ہوں، وہ آپ کو دیا کروں گا۔“

انہوں نے مجھے پیار بھری ڈانٹ پلائی اور کہا کہ ”تمہارا کرایہ بچانے کے لیے تو تمہیں یہ پیشکش کی ہے۔“

بہر حال نعمان اور آنٹی کو وہ مکان پسند آ گیا تھا اور مکان کی چابی نعمان اپنے ساتھ لے آیا تھا کہ شام کو سفیان بھی مکان دیکھ لے تو پھر خریدنے کی بات کی



جائے۔ اتنے میں سفیان بھائی بھی آ گئے۔ انہوں نے مکان کی چابی یہ کہہ کر نعمان سے لے لی کہ آج تو وہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ کل شام وہ دفتر سے واپسی پر مکان دیکھتے ہوئے آئیں گے۔

یہ دوسرے دن کی بات ہے۔ رات کے کوئی بارہ بجے تھے، میں گہری نیند میں تھا کہ اچانک دروازہ زور سے بجانے کی تیز آواز سے میری نیند ٹوٹی تھی۔ میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا تو بارہ بج رہے تھے۔ یا اللہ خیر اتنی رات گئے کون ہوسکتا ہے۔ کیا افتاد پڑی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے میں اٹھ بیٹھا اور تیزی سے دروازہ کھولنے بڑھا۔ جیسے ہی دروازہ کھولا سامنے حواس باختہ نعمان کھڑا تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

''فیصل جلدی سے میرے ساتھ چلو، سفیان بھائی کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے۔ وہ مکان دیکھنے گئے تھے اور ابھی گھر پہنچے ہیں، آتے ہی چلانے لگے۔ مجھے بچالو، مجھے بچالو۔ پھر گر کر بے ہوش ہوگئے۔''

میں نے جلدی سے دروازے کو تالا لگایا اور نعمان کے ساتھ ان کے گھر آ گیا۔ سفیان بھائی کو نعمان نے برآمدے میں پڑی ہوئی چارپائی پر لٹا دیا تھا۔ وہ ہوش وحواس سے بیگانہ بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ آنٹی شاید اندر کمرے میں سوئی ہوئی تھیں۔ ہم نے انہیں اس وقت اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے نعمان کو ٹیکسی لانے بھیج دیا تھا اور خود سفیان بھائی کو ہوش میں لانے کے جتن کرنے لگا تھا۔ میں نے جیسے ہی انہیں چھوا ان کا جسم بخار میں تپ رہا تھا۔ اتنی دیر میں ٹیکسی آ گئی۔ ہم سفیان بھائی کو لے کر اسپتال چلے گئے۔

اسپتال میں سفیان بھائی کا فوری طور پر علاج شروع ہوگیا تھا۔ انہیں دوسرے دن ہوش آیا تھا۔ نعمان نے صبح آنٹی کو سفیان بھائی کے بارے میں بتایا تھا جب سے وہ اسپتال میں سفیان بھائی کے سرہانے بیٹھی دعائیں پڑھ پڑھ کر ان پر پھونک رہی تھیں۔ جوان بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر ان کے آنسو نہیں رکتے تھے۔ سفیان بھائی کو جیسے ہی ہوش آیا وہ چلانے لگے۔

''بچاؤ بچاؤ، خدا کے لیے میری مدد کرو۔'' ان کی چیخ و پکار سن کر ڈاکٹر صاحب آ گئے اور ہمیں کمرے سے باہر بھیج کر ان کا معائنہ کرنے لگے۔ بعد میں نعمان کے استفسار پر ڈاکٹر نے بتایا کہ سفیان بھائی کسی چیز سے ڈر گئے ہیں۔ جب ان کا یہ خوف دور ہو جائے گا تو وہ نارمل ہو جائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اس لیے ان سے زیادہ بات نہ کی جائے۔

سفیان بھائی اسپتال میں تقریباً ایک ہفتہ ایڈمٹ رہے تھے۔ اس دوران آنٹی اور نعمان بہت پریشان رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی حالت بہتر ہوتی چلی گئی۔ آنٹی نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ آخر کار انہیں اسپتال سے چھٹی مل گئی اور وہ گھر آ گئے۔ وہ بالکل نارمل ہو چکے تھے لیکن ابھی انہوں نے آفس جوائن نہیں کیا تھا۔ آفس سے انہیں میڈیکل لیو مل گئی تھی۔

☆......☆

اس شام میں نعمان کے گھر گیا تھا۔ سفیان بھائی بڑے خوشگوار موڈ میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ہم سب نے رات کا کھانا اکٹھے کھایا تھا۔ نماز کے بعد آنٹی ہم تینوں کے لیے چائے بنا کر لے آئی تھیں اور خود سونے چلی گئیں۔ دوسرے دن اتوار تھا اس لیے مجھے بھی گھر جانے کی جلدی نہیں تھی۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ اچانک ہی نعمان نے سفیان بھائی سے پوچھا۔

''بھائی جان! اس دن ایسا کیا واقعہ ہوا تھا جو آپ اتنے خوفزدہ ہوگئے تھے؟'' نعمان نے ان سے ڈرتے ڈرتے یہ سوال کیا تھا کہ کہیں ان کی ذہنی کیفیت پھر نہ بگڑ جائے لیکن اس کے اس خیال کے برعکس سفیان بھائی نے اطمینان سے چائے پیتے ہوئے کہا۔

''میں اس سوال کی توقع بہت پہلے کر رہا تھا۔''

''آپ کی حالت کے پیش نظر آپ سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ انہوں نے چائے کا خالی کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

''جیسا کہ تم لوگ جانتے ہو میں ڈرپوک یا بزدل

بالکل بھی نہیں ہوں مگر اس رات اتنے عجیب و غریب واقعات میرے ساتھ پیش آئے کہ میں ٹوٹ کر رہ گیا۔ ہوا یوں کہ اس دن آفس سے نکلتے ہوئے مجھے دیر ہو گئی تھی۔ اس مکان پر پہنچتے پہنچتے مجھے رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ چاروں طرف تاریکی چھا گئی تھی۔ میں نے ٹارچ اپنے ساتھ رکھی ہوئی تھی اور سوچا تھا کہ مکان کا سرسری جائزہ لے کر جلدی گھر واپس چلا جاؤں گا۔ امی اور نعمان نے تو مکان پسند کر ہی لیا تھا۔ نعمان نے مجھے بتایا تھا کہ اس مکان کا مالک برابر والے گھر میں ہی رہتا ہے۔ میں نے سوچا تھا مکان کا جائزہ لے کر میں واپس جاتے ہوئے ان سے بھی مل لوں گا۔''

''لیکن بھائی مالک مکان کے برابر تو......'' نعمان نے ان کی بات کاٹی۔

''مجھے پورا واقعہ سنانے دو پھر بتانا۔'' انہوں نے گہری سانس لی اور پھر کہنا شروع کیا۔

''میں اس مکان کے دروازے پر پہنچا تو وہاں ایک مضبوط تالا لگا ہوا تھا۔ جیسے ہی میں نے تالا کھولا تو مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اندر داخل ہوا وہاں اتنا گہرا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ٹارچ جلائی اور اس کی روشنی میں اطراف کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ در و دیوار اور فرش مٹی سے اٹے ہوئے تھے جگہ جگہ مکڑیوں نے جالے تانے ہوئے تھے۔ میں جس کمرے میں اس وقت کھڑا تھا وہاں دیوار کے ساتھ دائیں طرف کرنے میں سیاہ لکڑی کی بنی ہوئی الماری رکھی تھی۔ اس الماری پر کچھ نقش و نگار بھی بنے ہوئے تھے جو ایک عرصہ گزرنے کی وجہ سے پھیکے پڑ گئے تھے۔ الماری کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں کپڑے رکھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ میں حیران تھا میری اطلاع کے مطابق یہ مکان بالکل خالی تھا لیکن سامان کی موجودگی یہاں کسی کے رہنے کا پتا دے رہی تھی۔ میں بے حد حیران ہوا۔ بظاہر یوں لگتا تھا جیسے اس کمرے میں برسوں سے کوئی نہیں آیا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ذرا گھمائی تو ایک سمت میں لکڑی کا دروازہ نظر آیا جو شاید دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ ہر شے پر مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ میں اس کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں بھی ایک کونے میں ویسی ہی لکڑی کی الماری اور کمرے کے وسط میں بھاری میز رکھی ہوئی تھی جس کے گرد کچھ کرسیاں بھی رکھی تھیں۔

میں نے ٹارچ کی روشنی ذرا اوپر گھمائی تو بری طرح اچھل پڑا۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ کرسی پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ چند لمحوں تک میں ساکت ہو کر رہ گیا تھا اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ میں نے قریب جا کر ٹارچ کی روشنی میں بغور کرسیوں کا جائزہ لیا تو وہ خالی پڑی تھیں اور ان پر مٹی جمی ہوئی تھی جیسے برسوں سے انہیں کسی نے ہاتھ بھی نہ لگایا ہو۔ میں نے اس انسانی ہیولے کو اپنا وہم سمجھا۔ اس کمرے کا ماحول چکرا دینے والا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو چیخیں مارتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا۔ یہاں کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ کمرے کی حالت بتا رہی تھی کہ برسوں سے یہاں کسی نے قدم نہیں رکھا ہے۔ مکان کا مالک اسے بیچنا چاہتا تھا۔ خریدار اسے آکر دیکھتے ہوں گے۔ کیا اتنے عرصے میں مکان کا مالک بھی یہاں نہیں آیا۔ اس قسم کے بہت سے سوال میرے ذہن میں آرہے تھے مگر میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ حالات جو بھی تھے میری سمجھ سے بالاتر تھے۔

میرے دل میں تجسس پیدا ہو گیا تھا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اس گھر کو پورا دیکھوں گا۔ کم از کم اتنا تو پتا چل جاتا کہ مکان خالی ہے یا اس میں کوئی رہ رہا ہے اور یہ سامان کس کا ہے۔ میں دبے قدموں اندر کی جانب بڑھا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یہ جگہ آسیب زدہ ہے اور یہاں آکر میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤں گا تو میں یہاں کبھی قدم بھی نہیں رکھتا۔ لیکن ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ آئندہ کیا پیش آنے والا ہے۔

اندر کا دروازہ بند نہیں تھا۔ میں نے کھولنے کے لیے جیسے ہی اس پر ہاتھ رکھا وہ بھاری دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ جیسے میرے ہاتھ لگانے کا ہی منتظر ہو۔ جیسے ہی دروازہ خود بخود کھلنے لگا میں گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ خوف کی سرد لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی لیکن چند ہی منٹ

میں میں نے اپنے خوف پر قابو پالیا۔ اندر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ دروازہ ایک راہداری میں کھلتا تھا۔ میں وہ مختصر راہداری عبور کرنے لگا۔ راہداری ختم ہوئی تو میں نے خود کو برآمدے میں کھڑا پایا۔ برآمدے میں دائیں ہاتھ پر لکڑی کا ایک زینہ اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ زینے کے ساتھ ایک کمرا تھا۔

راہداری اور کمروں میں حشرات الارض نے رہائش اختیار کی ہوئی تھی۔ میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ چند لمحے میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ میرے دماغ پر خوف طاری تھا۔ اس میں اب اور اضافہ ہو گیا تھا۔ جوں جوں میں آگے بڑھ رہا تھا خوف کی لہریں میرے رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھیں۔ عجیب ویران عمارت تھی۔ اس کے در و دیوار سے خوف و دہشت کی لہریں نکل رہی تھیں۔ میں حیران تھا دادی اور نعمان نے اس گھر میں کیا دیکھا تھا جو وہ اس قدر تعریفیں کر رہے تھے۔

''بھائی جان! ہم نے جو مکان دیکھا تھا وہ ہرگز ایسا نہیں تھا۔'' نعمان جھٹ بولا۔

''سفیان بھائی! آپ آگے سنائیں، پھر کیا ہوا۔'' میں نے تجسس بھرے لہجے میں انہیں ٹوکا۔ انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

زینے کے قریب جو کمرا بنا تھا اس کا دروازہ بند تھا۔ ایک بار تو دل چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس پراسرار مکان سے دور بھاگ جاؤں لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سنبھالا اور تسلی دی کہ تم ایک بہادر اور دلیر انسان ہو۔ تم نے حالات سے کبھی ڈرنا اور بھاگنا نہیں سیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سوچ نے میرے دل کو بہت ڈھارس بندھائی اور مجھ میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔ میں نے سوچ لیا کہ اب پورے مکان کا جائزہ لے کر میں یہاں سے جاؤں گا۔

یہ سوچ کر میں ایک نئے حوصلے سے آگے بڑھا۔ میں اب تک یہ نہیں سمجھا تھا کہ یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔ دراصل میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں۔ میں دروازے کے سامنے کھڑا تھا اچانک مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے پشت کی طرف سے مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ میں ایک لمحے کے لیے بدحواس ہو گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن وہاں ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں یہ یقین سا ہو گیا کہ کوئی ایسی نادیدہ ہستی یہاں تھی جو میرا جائزہ لے رہی تھی۔ میری چھٹی حس کسی نادیدہ خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا۔ پوری عمارت پر اعصاب شکن سناٹا چھایا ہوا تھا کہ اچانک ایک ہولناک چیخ مکان میں گونجی۔ میں بری طرح اچھل پڑا۔ چیخ کی آواز اوپر کسی کمرے سے بلند ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ آواز سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔ یہ آواز کسی عورت کی تھی۔

ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز مجھے اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ مجھے فوراً یہاں سے دور بھاگ جانا چاہیے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں مڑا ہی تھا کہ ایک خیال میرے ذہن میں کوندا کہ ہو سکتا ہے مکان خالی دیکھ کر کوئی شیطان فطرت انسان اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے یہاں آیا ہو۔ میں حیران تھا کہ چیخ کی آواز خاصی بلند تھی۔ آس پاس کے رہنے والوں کو وہ چیخ سنائی کیوں نہیں دی تھی۔ رات کے سناٹے میں تو اس کی آواز دور دور تک پہنچ گئی ہوگی۔ پھر آخر کوئی یہاں کیوں نہیں آیا؟

بہرحال سبب کچھ بھی ہو، میں اتنا بزدل اور کمزور بھی نہیں تھا کہ ایک مظلوم لڑکی کی مدد بھی نہ کر سکوں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چیخ کی آواز دوبارہ گونجی۔ میں آگے بڑھنے لگا۔ میرا رخ زینے کی جانب تھا جہاں سے سسکیوں کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ میں نہایت چوکنا انداز میں سیڑھیاں طے کر رہا تھا۔ مجھے ہر پل یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں میری موجودگی سے وہ شخص واقف نہ ہو جائے۔

سیڑھیاں طے کر کے جیسے ہی میں آگے بڑھا تو وہ آوازیں یک بیک بند ہو گئیں۔ اوپر ایک کمرا تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ میں ٹارچ روشن کیے کمرے کی

طرف بڑھا۔
اس وقت میں نے خود کو ہر طرح کے حالات کے لیے تیار کرلیا تھا۔ میں نے بند دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ میں نے دروازے سے اندر جھانکا تو حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ وہ کمرا بالکل خالی تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں مسہری رکھی تھی اور مسہری کے پاس ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ یہ بھی حیران کن بات تھی کہ اس عمارت میں اب تک جتنی بھی چیزیں نظر آئیں وہ سب کی سب بے حد قدیم تھیں۔

میں کمرے میں داخل ہوا اور ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لینے لگا۔ اس بات نے مجھے حیرت زدہ کر دیا کہ کمرے میں صدیوں کی گرد جمع تھی۔ فرش پر بھی مٹی کی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اوپر نیچے در و دیوار پر مکڑیوں نے جالے تان دیے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کمرے میں صدیوں سے کسی نے قدم نہ رکھا ہو۔ میز پر ایک پیتل کا چھوٹا سا دیا بھی رکھا تھا اور اس پر بھی مٹی جمی ہوئی تھی۔ چیخ اور سسکیوں کی آواز مجھے اسی سمت سے آئی تھی۔ میں حیران تھا اگر کوئی یہاں آیا تھا تو اس کے قدموں کے نشان تو ہونے چاہیے تھے۔ حیرت سے میرے قدم زمین میں گڑ گئے اور میرا ذہن بے شمار خیالات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اگر کوئی یہاں نہیں آیا تو پھر چیخوں کی وہ آوازیں کہاں سے آئی تھیں۔ میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ میرے اعصاب جواب دے گئے تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی پیچھے سے مجھے گھور رہا ہے۔ میں ایک دم پیچھے گھوما لیکن کمرے میں ہولناک ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے جونہی دروازے کی سمت دیکھا تو اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لکڑی کا وہ بھاری دروازہ چرچراہٹ کی بھیانک آواز کے ساتھ آپ ہی آپ بند ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت میرے جسم کا خون جیسے خشک ہو گیا تھا۔ جب دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا تو مجھے اچانک جیسے ہوش آ گیا۔ میں بھاگتا ہوا دروازے تک پہنچا اور اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا مگر بے سود۔ یوں لگتا تھا جیسے دروازہ کسی نے باہر سے بند کر دیا ہو۔ لیکن میں دروازے کو خود بخود بند ہوتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اب تو میں بری طرح گھبرا گیا۔ اب شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ مکان آسیب زدہ ہے۔ آسیب کا خیال آتے ہی میری پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ بچپن میں سنی ہوئی جن بھوتوں اور بدروحوں کی بیسیوں کہانیاں مجھے یاد آگئیں اور بے اختیار میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

اب مجھے اپنی غلطی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ مجھے تنہا یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مجھے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی تھی لیکن کس طرح؟ میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی، سامنے دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو اس عمارت کے عقب میں کھلتی تھی۔ میں بے اختیار کھڑکی کے پاس پہنچا۔ میں باہر سے کسی کو مدد کے لیے بلانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کھولا، باہر کچھ لوگ گلی میں ادھر سے ادھر جاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں نے چیخ چیخ کر انہیں مدد کے لیے پکارا مگر کسی نے میری آواز پر توجہ نہیں دی۔ چیختے چیختے میرا گلا سوکھ گیا تھا اور حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ مجھے اس وقت شدید پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔

کھڑکی کا فاصلہ نیچے سے کوئی تیس فٹ تھا۔ یہاں سے نیچے بغیر کسی مدد کے اترنا ناممکن تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ لوگوں کو نہ میں دکھائی دے رہا ہوں اور نہ ہی انہیں میری آواز سنائی دے رہی ہے۔ میں وہاں بے بس کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ معاً میری نظریں فرش پر پڑیں اور میں چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ منظر تھا ہی اتنا انوکھا اور حیرت انگیز۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر فرش کی مٹی پر پراسرار انسانی قدموں کے نشان بنتے چلے جا رہے تھے۔ یوں جیسے کوئی نادیدہ ہستی فرش پر چل رہی ہو۔ مجھے وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا، کمرا بالکل خالی تھا۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نشان دروازے تک پہنچے۔ اچانک دروازہ کھلا جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے کھولا ہو اور وہ نشانات باہر نکلتے چلے گئے۔ میرے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ میں تیزی سے بھاگتا ہوا دروازے

کے قریب پہنچا تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہو گیا اور میں اپنے ہی زور سے دروازے سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔

پہلے جب لوگ آسیب یا بدروحوں کی باتیں کیا کرتے تھے تو میں ان پر ہنسا کرتا تھا لیکن اب جب کہ خود میرا ان سے رابطہ پڑا تو پتا چلا کہ آسیب کیا چیز ہوتے ہیں۔ آج کی رات جو مجھ پر گزر رہی تھی اس کا ایک ایک لمحہ میرے لیے ناقابل بیان تھا۔ اس بھاگ دوڑ نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ بھوک، پیاس اور خوف و دہشت نے میرے جسم سے ساری طاقت نچوڑ لی تھی۔

مجھے حیرت تھی کہ اتنے آباد علاقے میں یہ جادوگری موجود تھی لیکن آس پاس کے رہنے والے اس سے ناواقف تھے۔ اچانک دروازے کی چرچراہٹ سے میں چونکا۔ دروازہ خود بخود کھل گیا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ باہر کی سمت دوڑ لگا دی۔ میں بے اختیار بھاگتا ہوا زینے تک پہنچا تو جیسے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہوش و حواس ایک لمحے کے لیے مختل ہو گئے۔ زینے کی درمیانی سیڑھیوں پر ایک خونخوار سیاہ بلا کھڑا میری طرف خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے۔

اچانک اس بلے کے چہرے پر مجھے مسکراہٹ نظر آئی۔ میں نے ہزاروں بار انسانوں کو مسکراتے تو دیکھا تھا مگر کسی خونخوار بلے کو مسکراتے میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یقین جانو اس بلے کی مسکراہٹ اتنی حیرت انگیز اور خوفناک تھی کہ میری سانسیں رکنے لگیں۔ میں پتھر کا بت بنا اسے گھورے جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں کھڑے ہوئے مجھے صدیاں گزر گئی ہوں۔

اچانک بلا خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا تو جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ میں واپس اسی کمرے کی طرف بھاگا۔ خونخوار بلے کا پنجہ میری ٹانگ پر پڑا تھا اور میری پینٹ کا پائنچہ لے اڑا تھا۔ میں نے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر دیا۔ میں دونوں ہاتھ دروازے پر رکھے ہانپ رہا تھا۔ وہ بند دروازے پر پنجے مار رہا تھا اور میں اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ میری قوت مدافعت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ اس وقت موت نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ میں اس وحشت ناک صورت حال کا مقابلہ زیادہ دیر نہیں کر سکتا تھا۔ پنجے مارنے کی آواز اب بند ہو گئی تھی اور مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں تیزی سے میز کی طرف گیا اور چینل کا وہ دیا اٹھا لیا کہ اب بلے سے سامنا ہوا تو اس کے سر پر دے ماروں گا۔ میں دوبارہ کھڑکی تک گیا اور ہذیانی انداز میں مدد کے لیے چیخنے لگا۔ ''بچاؤ، بچاؤ، ارے کوئی ہے۔ بچاؤ۔''

یہاں تک پہنچ کر سفیان بھائی رک گئے۔ جذبات سے ان کی آواز لرز رہی تھی۔ میں اور نعمان حیرت زدہ ان کی آپ بیتی سن رہے تھے۔ سفیان بھائی کی آنکھیں سرخ تھیں اور ان کے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ انہوں نے پانی مانگا۔ نعمان پانی کی بوتل اور گلاس لے کر آیا تو وہ تین گلاس پانی پی کر ان کی حالت کچھ اعتدال پر آئی۔ چند لمحے خاموش رہ کر انہوں نے پھر کہنا شروع کیا۔

''میں انسانوں سے تو مقابلہ کر سکتا تھا مگر مافوق الفطرت ہستیوں سے مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اس آسیب زدہ مکان میں میرا ایک ایک پل مجھے صدی جیسا لگ رہا تھا۔ مصیبت کے ایسے لمحات میں ہر انسان کو خدا ہی یاد آتا ہے۔ خود غرض انسان کو جب کوئی فکر اور پریشانی نہیں ہوتی تو وہ بھول کر بھی خدا کو یاد نہیں کرتا مگر جب برا وقت آتا ہے تو وہ خدا کو یاد کرتا ہے۔ یہی اس وقت میرا بھی حال تھا۔ میں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ سے دعا مانگنے لگا اور قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ اس سے میری وحشت میں نمایاں کمی آئی اور دل کو ڈھارس ہوئی۔

اسی وقت ایک تیس پینتیس سالہ شخص کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر بے اختیار اچھل پڑا۔

''ارے ڈرو نہیں، میں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں، تم کافی دیر سے آوازیں دے رہے تھے۔'' اس نے اندر آتے ہی مجھے تسلی دی۔

''خدا کے لیے مجھے یہاں سے باہر نکالیں۔ میں یہاں آکر پھنس گیا ہوں۔ یہاں عجیب و غریب حالات ہیں۔ میں نہ جانے کتنے گھنٹوں سے یہاں بھٹک رہا ہوں۔''

''آپ اطمینان سے بیٹھیں، یہ پانی پئیں۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس مجھے تھمایا اور کہا۔ ''اپنی حالت دیکھیں، خوف سے آپ کا کیا حال ہو گیا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا بیرونی دروازہ کھلا دیکھ کر اور آپ کی آوازیں سن کر میں اندر آ گیا۔ میں یہاں نزدیک ہی رہتا ہوں۔'' ہم اسی مسہری پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''آپ کو کس نے یہاں آنے کا مشورہ دیا تھا؟'' اس

''ہمارا یہ مکان خریدنے کا ارادہ تھا۔''

''یہ جگہ کیسے بیچی جا سکتی ہے۔ یہ تو ایک آسیبی آماجگاہ ہے۔''

''آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟'' میرا خوف اب کافی حد تک دور ہو گیا تھا۔

''میں بہت عرصے سے یہاں رہ رہا ہوں اور اس جگہ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔''

''کیا جانتے ہیں؟'' میری تجسس کی حس پھر بیدار ہو گئی تھی۔

''اس جگہ بدروحوں کا قبضہ ہے۔ ہوا یوں کہ اس مکان میں ایک پولیس انسپکٹر اپنی بیوی اور چار سالہ بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ اس علاقے میں اس کی نئی نئی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ اس نے یہ مکان بڑے ارمانوں سے خریدا تھا مگر اسے یہاں رہنا اور بسنا نصیب نہیں ہوا۔ اس کی بیوی کو سامنے واقع قبرستان سے بڑا خوف آتا تھا۔ شوہر تو دن میں ڈیوٹی پر چلا جاتا تھا اور وہ اور اس کا چار سالہ بیٹا پورا دن تنہا رہتے تھے۔ اسے یہ مکان شروع سے ہی پسند نہیں آیا تھا۔ وہ بضد تھی کہ اسے بیچ کر کہیں اور شفٹ ہوا جائے۔ انسپکٹر اسے بارہا سمجھا چکا تھا کہ مکان بیچنا اور دوسرا مکان خریدنا اتنی جلدی ناممکن ہے مگر وہ بڑی جذباتی اور ضدی عورت تھی۔

آئے دن ان میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ ایک دن صبح صبح ان دونوں میں تکرار شروع ہو گئی۔ تکرار نے کچھ ہی دیر میں جھگڑے کی صورت اختیار کر لی۔ انسپکٹر ریاض کو اچانک غصہ آ گیا اور اس نے ایک ہاتھ اپنی بیوی کو جڑ دیا اور خود ڈیوٹی پر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر تک تو روتی رہی پھر جذبات اور غصے میں اندھی ہو گئی۔ اس نے اپنے چار سالہ معصوم بیٹے کو گلا دبا کر مار ڈالا اور خود کو اسی کمرے میں جہاں ہم بیٹھے ہوئے ہیں، چھت کے پنکھے سے لٹکر خودکشی کر لی۔

ادھر انسپکٹر ریاض کا کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے کلی اور بے چینی اس پر سوار تھی۔ وہ صبح اپنی بیوی سے لڑ جھگڑ کر نکل تو آیا تھا مگر وہ اپنی بیوی کی حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت سے ڈرتا تھا۔ اس نے جلدی چھٹی لی اور گھر آ گیا۔ گھر کا بیرونی دروازہ کھلا دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ گھر میں داخل ہو کر اس نے اپنی بیوی اور بچے کو آوازیں دیں اور انہیں تلاش کرنے لگا۔ وہاں کوئی زندہ ہوتا تو جواب دیتا۔ اس نے سیڑھیوں پر پڑی ہوئی اپنے بچے کی لاش اور اسی کمرے میں پنکھے سے لٹکی ہوئی اپنی بیوی کی لاش دیکھی تو تڑپ کر رہ گیا۔ یہ سب دیکھنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ نیچے اترا، کمرے میں گیا اور اپنی سرکاری پستول سے خود کو ختم کر لیا۔ یوں بیک وقت اس دن یہاں سے تین جنازے اٹھے۔

کہتے ہیں جو لوگ اس طرح غیر طبعی انداز میں مرتے ہیں ان کی روحیں اس دنیا میں بھٹکتی رہتی ہیں اور وہ ایک عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔'' یہ واقعات سنا کر وہ شخص خاموش ہو گیا۔

''لیکن یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں پیش آیا حالانکہ یہ ایک آباد علاقہ ہے۔''

''ہو سکتا ہے ان روحوں نے دوسروں کو بھی یہ سب بتانے کی کوشش کی ہو اور وہ خوف زدہ ہو گئے ہوں یا انہوں نے سنا ہی نہ ہو۔ آپ ایک نڈر اور دلیر انسان ہیں، حافظ قرآن ہیں۔ آپ ان روحوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔''

جیسے ہی اس شخص نے یہ جملے ادا کیے، میں بری طرح چونک گیا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ میں حافظِ قرآن ہوں۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اچانک وہ کھڑا ہو گیا اور کہا۔

''آیئے میں آپ کو باہر تک چھوڑ دوں۔ میں جیسے کسی ٹرانس میں آیا ہوا اس کے پیچھے پیچھے زینے اترنے لگا۔ چپٹل کا دیا ابھی تک میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ برآمدے میں پہنچ کر وہ رک گیا۔ مکان کا بیرونی دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے لمحے بھر کے لیے پلٹ کر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔

یہ دیکھتے ہی میرے منہ سے ہذیانی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں رکے بغیر مسلسل بھاگ رہا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے جسم سے آگ سی نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بدروحیں میرے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔

مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر بھاگتا رہا اور کن راستوں سے گزر کر گھر پہنچا۔ اس وقت میری حالت بہت ابتر تھی۔ میرے حواس گم تھے۔ میں نے دروازہ زور سے بجایا تو نعمان نے دروازہ کھولا۔ نعمان میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا اور اسے دیکھ کر میری جان میں جان آگئی تھی لیکن میری ہمت اب جواب دے گئی تھی۔ میرا ذہن جیسے تاریکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھا جہاں تمام وقت ڈاکٹر مجھے یہ یقین دلاتے رہے کہ وہ سب میرا وہم تھا اور انسانی ذہن کی کارستانی تھی۔ میں نے بھی اسے اپنا وہم سمجھ کر بھلانے کی بہت کوشش کی۔ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ اسپتال سے چھٹی کے بعد میں گھر پہنچا تو دوسرے دن امی نے میری وہ پینٹ جو میں نے اس واقعے کے روز پہنی ہوئی تھی دکھاتے ہوئے پوچھا تھا کہ اس کا پائنچہ کیسے پھٹا تھا اور پینٹ کی جیب سے یہ چپٹل کا دیا بھی ملا ہے۔ یہ ایسے ٹھوس ثبوت تھے جو یہ ظاہر کر رہے تھے کہ میرے ساتھ پیش آنے والے وہ واقعات حقیقت تھے، کوئی واہمہ یا ذہنی اختراع نہیں تھے۔''

''لیکن سفیان بھائی مالک مکان کے گھر کے برابر میں تو ایک خالی پلاٹ ہے، پلاٹ کے ساتھ جو مکان ہے ہم اسے خریدنا چاہتے تھے۔'' نعمان بے چینی سے بولا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہاں کوئی خالی قطعہ اراضی نہیں ہے۔ مالک مکان کے گھر کے برابر میں ہی وہ قدیم مکان موجود تھا۔ اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو کل صبح ہم تینوں وہاں چلیں گے۔ میں ایک بار پھر اس جگہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' سفیان بھائی نے پرسوچ انداز میں کہا۔

☆......☆

دوسرے دن صبح سویرے ہم وہاں پہنچے تو مالک مکان کے گھر سے ملحق خالی قطعہ اراضی ہمارا منہ چڑا رہا تھا جہاں بقول سفیان بھائی کے وہ پراسرار مکان اس رات انہوں نے دیکھا تھا۔

بعد میں وہاں رہنے والے بزرگوں کے ذریعے ہمیں پتا چلا تھا کہ اس قطعہ اراضی پر کسی زمانے میں ایک مکان ہوا کرتا تھا جو آسیب زدہ مشہور تھا۔ اس مکان کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ وہ مکان کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا تھا بعد میں آس پاس کے رہنے والے اینٹیں وغیرہ بھی اٹھا کر لے گئے۔ اب وہ قطعہ اراضی خالی پڑا تھا۔

کچھ عرصے بعد میں بھی کراچی کو خیرباد کہہ کر اپنے گاؤں واپس آ گیا تھا۔ سفیان بھائی بیرون ملک چلے گئے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنے بھائی اور امی کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا۔ کافی عرصہ میرا ان سے رابطہ رہا پھر رفتہ رفتہ ہم اپنی مصروف زندگی میں کھوتے چلے گئے اور رابطہ برقرار نہ رہ سکا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ سفیان بھائی جب بھی یہ کہانی پڑھیں گے اس کی تصدیق ضرور کریں گے کیونکہ اس کہانی کا ایک ایک لفظ سچ ہے اور اس کا ثبوت وہ چپٹل کا دیا ہے جو سفیان بھائی کے پاس اب بھی محفوظ ہے۔

☆☆☆



بے چین روح

فرح انیس

اُس گورکن کی دل خراش داستان' جسے ایک بے چین ماں کی روح کو آزاد کرانا پڑ گیا تھا



''موحد یار کوئی پلان بناؤ ہمیں گھومنے کا۔ اب تو تمہارے دادا کی طبیعت بھی ٹھیک ہوگئی ہے۔'' سجاد اپنے دوست موحد سے بولا۔ وہ دونوں اس وقت ایک ہوٹل میں بیٹھے لنچ کر رہے تھے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



''ہاں یار میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہیں چلنا چاہیے۔ دادا کی خراب طبیعت کی وجہ سے ہر وقت دماغ دادا کی طرف لگا رہتا تھا۔ اب ان کی طبیعت جب سے بہتر ہوئی ہے تو سکون ہوا ہے۔'' موحد مسکرا کر سجاد کو دیکھتے ہوئے بولا۔ سیل فون کی بپ پر موحد سیل کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس کی امی کی کال آ رہی تھی۔

''ہیلو جی امی!''

''بیٹا تمہارے دادا کا انتقال ہو گیا۔'' دوسری جانب موحد کی امی روتے ہوئے بولیں۔ اس خبر نے موحد کے حواس معطل کر دیے۔

☆......☆

''قبرستان میں دادا کو دفنانے کے بعد موحد اور اس کا تایا زاد سعد افسردہ سے کھڑے تھے۔ دونوں ہی اپنے دادا سے بہت قریب تھے۔

''بیٹا موحد بات سنو۔''

''جی تایا!'' وہ تایا کے بلانے پر ان کے پاس چلا آیا۔

''بیٹا میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ اشرف مکینک کے پاس گیا ہے گاڑی لے کر۔ بول رہا ہے ٹائم لگے گا۔'' وہ ڈرائیور کا نام لیتے ہوئے بولے۔

''تم اور سعد اس کے ساتھ گھر آ جانا گاڑی ٹھیک کروا کر۔ میری ایسی طبیعت نہیں کہ میں زیادہ دیر یہاں رکوں۔'' تایا نڈھال لہجے میں بولے۔

''نہیں تایا آپ گھر جائیں بالکل بے فکری سے، ہمیں دیر بھی ہو گئی تو کوئی بات نہیں۔'' موحد کے تایا دل کے مریض تھے اور باپ کی موت نے ان کو نڈھال کر دیا تھا۔ وہ اپنے تایا کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''او کے بیٹا جی! تم دونوں اپنا خیال رکھنا۔'' وہ سعد اور موحد کو دیکھتے ہوئے بولے جو وہیں چلا آیا تھا۔

☆......☆

''یار سعد تو اس وقت گھر پر تھا جب دادا کا انتقال ہوا تھا۔ کیا ہوا تھا یار اتنا اچانک یہ سب...... دادا تو ٹھیک تھے۔'' موحد افسردگی سے سعد سے پوچھنے لگا۔

''پتا نہیں یار بس اچانک ہی دادا کی طبیعت خراب ہوئی۔ سعد دکھ سے بولا۔

''یار مغرب ہونے کو ہے یہ اشرف ابھی تک نہیں آیا۔'' سعد قبرستان میں بڑھتے اندھیرے کو دیکھ کر پریشان ہونے لگا۔

''رکو میں کال کرتا ہوں۔'' موحد کال پر اشرف سے پوچھنے لگا۔

''کیا ہوا کیا کہہ رہا ہے اشرف۔''

''یار کہہ رہا ہے گاڑی میں کوئی بڑا فالٹ ہے ٹائم لگے گا۔'' سعد کے پوچھنے پر موحد بتانے لگا۔

''یار موحد اتنی دیر ہم یہاں کیا کریں گے۔ دیکھ تو یار کوئی بھی ہمیں دور تک دکھائی نہیں دے رہا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔'' سعد نے اپنے اطراف میں خوفزدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا تم گھبراؤ نہیں میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔'' موحد سعد کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ سعد فطرتاً ڈرپوک بھی بہت تھا۔

''یار پیاس سے حلق خشک ہو رہا ہے میرا موحد۔''

''یار پیاس تو مجھے بھی لگ رہی ہے کیا کریں۔'' موحد کی سوچتی نگاہیں قبرستان کے چاروں طرف دوڑ رہی تھی۔

''سعد دیکھو وہاں مجھے لگتا ہے کوئی رہتا ہے۔'' ہاتھ کے اشارے سے وہ اس کو کسی رہائش کے آثار دکھانے لگا۔ دور سے نظر آتی کوٹھری میں جلتی مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔

''چلو وہیں چلتے ہیں۔'' دونوں اس کوٹھری کی جانب بڑھ گئے۔ بوسیدہ سا دروازہ بجانے پر اندر سے بوڑھے کی کھانستی آواز سنائی دی۔

''کون ہے باہر۔''

''دروازہ کھولیں ہمیں پانی پینا ہے۔'' موحد کے کہنے پر اس شخص نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے

ہی ایک بوڑھا کھڑا تھا جو مشکوک نگاہوں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"ہماری گاڑی خراب ہوگئی ہے کیا ہم یہاں تھوڑی دیر بیٹھ سکتے ہیں۔"

"آ جاؤ اندر۔" موحد کے بتانے پر وہ بوڑھا ان دونوں کو اندر آنے کے لیے جگہ دیتا ہوا ایک طرف ہوگیا۔ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ جہاں پرانی سی چارپائی، ایک چھوٹا سا صندوق اور مٹکا رکھا تھا۔ وہ دونوں اس چارپائی پر بیٹھ گئے۔ وہ بوڑھا دروازہ بند کر کے دروازے کی کنڈی پر کافی سارے دھاگے تیزی سے لپیٹ رہا تھا۔ موحد اور سعد بوڑھے کی اس حرکت پر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگے۔

"کرنا پڑتا ہے یہ سب بیٹا! اگر یہ دھاگے نہ لپیٹوں تو روحیں پوری رات مجھے تنگ کیے رکھتی ہیں۔" بوڑھا ان کی طرف آتا ہوا بولا۔ بوڑھے کی اس بات پر دونوں خوفزدہ سے ہوکر بوڑھے کو دیکھنے لگے۔

☆......☆

"پیشے کے لحاظ سے میں ایک گورکن ہوں پچھلے تیس سال سے میں اس قبرستان میں کام کر رہا ہوں۔ مُردوں میں رہ کر میرا ڈر خوف بالکل ختم ہو چکا ہے۔ میں عرصہ دراز سے اس کوٹھری میں مقیم ہوں۔ مجھے مُردوں سے زیادہ باہر کی دنیا کے انسانوں سے خوف آتا ہے۔ میرے نزدیک مردہ بے ضرر ہوتا ہے۔ جب کے انسان خطرناک ہے۔

"دسمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ سردیاں اپنے عروج پر تھیں۔ سردیوں میں ویسے بھی رات جلدی ہو جایا کرتی ہے۔ یہ واقعہ تو برس قبل ماہ دسمبر کا ہے۔ میں شام کو اپنے کام سے فارغ ہوکر اپنی کوٹھری میں آگیا۔ کوئی رات کے دس بجے ہوں گے میں اپنی چارپائی پر لیٹا تھا کہ دروازہ زور زور سے کوئی بجانے لگا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے دو آدمی کھڑے تھے۔

"ہمارے ساتھ چلو ہمیں تم سے ضروری کام ہے۔" ان کے کہنے پر میں ان کے ساتھ چل دیا۔ قبرستان سے تھوڑے ہی فاصلے پر گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی دیکھ کر میرے قدم رک گئے۔ میرے ذہن میں خدشات آنے لگے کہ کہیں مجھے اغوا نہ کرنا ہو یا میرا یہ لوگ قتل نہ کردیں۔

"بے فکر رہو تم کو ہم کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" ان میں سے ایک مرد میرے رکنے پر بولا شاید اس نے میرے چہرے پر خدشات کے سائے دیکھ لیے تھے۔ ان کے کہنے پر میں گاڑی تک آگیا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر ڈگی کھولی میں آگے بڑھ کر دیکھنے لگا تو ایک دم گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک عورت کی لاش تھی جس کے منہ کو چادر سے صحیح سے ڈھکا ہوا نہیں تھا۔

"اس لاش کو دفنانا ہے۔ کہیں بھی ٹھکانے لگادو۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتا۔" میں غصے سے کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

"پانچ لاکھ دیں گے ہم تمہیں۔" پیچھے سے آواز پر لمحہ بھر کو میرے قدم رکے پھر تیز تیز چلتا ہوا اپنی کوٹھری میں آگیا۔ مجھے بار بار اپنی بھتیجی کا خیال آرہا تھا۔ جس کی شادی ہونے والی تھی اور بڑے بھائی کو پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔

"افضل دولت خود چل کر تیرے در پر آئی ہے ناشکری نہ کر۔" میں اپنی ہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ دروازہ پھر سے بجنا شروع ہوگیا دروازہ کھولا تو وہی دو آدمی سامنے کھڑے تھے۔

"لے آؤ لاش۔" میرے کہنے پر دونوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جلدی جلدی کر کے میں نے لاش کو اس چادر سمیت دفنایا اور پانچ لاکھ لے کر کوٹھری میں آگیا۔ وہ سارا دن کام میں مصروف ہی گزرا، رات ہوئی تو میں سوچنے لگا یہ پیسے لے کر کل ہی گاؤں کے لیے نکل جاتا ہوں۔ بھائی کو پیسے بھی دے دوں گا۔ اور شادی میں بھی شریک ہو جاؤں گا۔ یہ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

دروازہ زور زور سے دھڑدھڑانے کی آواز پر چونک کر میری آنکھ کھلی۔ میرے ذہن میں وہی دو مرد آ گئے۔ کیا پتا ان کے دل میں بے ایمانی آ گئی ہو اور وہ مجھ سے پیسے چھین کر مجھے مار کر بھاگ جائیں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کے دروازہ پیٹنے کی رفتار میں شدت آ گئی تھی۔

''کون ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''دروازہ کھولو۔'' نسوانی آواز پر میں اچھل گیا رات دو بجے کسی عورت کا قبرستان میں کیا کام۔ کیا پتا اس بے چاری پر کوئی افتاد آ گئی ہو اور مجھ سے مدد طلب کرنے آئی ہو۔ میں اپنی ہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔

دروازہ کھولو مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' اس عورت کی آواز پر میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی ایک عورت چادر اوڑھے کھڑی تھی۔ جو چیز اس کے چہرے پر چونکا دینے والی تھی وہ تھیں اس کی بے حد ویران آنکھیں۔ میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کے اس چہرے کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ یہ وہ عورت تھی جس کو میں نے کل ہی دفنایا تھا۔ خوفزدہ ہو کر میں نے تیزی سے دروازہ بند کیا۔ پوری رات وہ عورت دروازہ بجاتی رہی اور میں خوف سے لحاف میں دبکا کانپتا رہا۔

☆......☆

''مجھے اپنے کمرے میں مقید ہوئے تین دن ہو گئے تھے۔ اس عورت کے خوف و ڈر کی وجہ سے میں باہر بھی نا نکلا تھا۔ پتا نہیں وہ عورت مجھ سے کیا چاہتی ہے میں اپنی سوچوں میں غلطاں تھا کہ دروازہ بجنا شروع ہو گیا۔ میں ڈر کر دروازے کو دیکھنے لگا۔ آج دروازہ بجانے میں اتنی شدت تھی کہ لگتا تھا وہ عورت دروازہ توڑ کر اندر آ جائے گی۔

''مجھے انتقام لینا ہے۔ میری بے چین روح کو سکون چاہیے۔'' اس روح کی کھڑکھڑاتی آواز میرے کانوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ پوری رات اس کی یہی آواز آتی رہی۔ میں کانوں میں انگلیاں ٹھونسے صبح ہونے کی دعا کرتا رہا۔ فجر ہوتے ہی وہ دستک اور اس کی آوازیں آنا بند ہو گئی۔ صبح تک مجھے تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ شام میں پیاس کی شدت سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ مٹکے میں پانی ختم ہو گیا تھا مجبوراً مجھے اٹھ کر پانی لینے باہر جانا پڑا۔ پانی لے کر جونہی میں کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے پلٹا تو خوف سے میری رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ وہ عورت میری چارپائی پر بیٹھی تھی۔

''رک کیوں گئے! آؤ۔'' اس کی سرد آواز سے میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میری اس وقت کیا کیفیت تھی یہ بیان سے باہر ہے۔ ایک مردہ آپ کے کمرے میں بیٹھا ہو تو انسان کے خوف سے اوسان ہی خطا ہوں گے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب اس کی سنے بغیر چارہ نہیں۔

☆......☆

''میرا نام شہلا ہے۔ میرے شوہر کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ میرے دو چھوٹے چھوٹے بیٹے تھے۔ میرے شوہر کافی مالدار تھے۔ ان کی موت کے بعد سب کچھ میرا ہی تھا کیونکہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ میرے ساس، سسر کا بھی انتقال بہت پہلے ہو گیا تھا۔ میکے میں بس ایک بہن تھی وہ بھی دوسرے شہر میں اپنے شوہر کے ساتھ مقیم تھی۔ اس کے مالی حالات شروع سے اچھے نہ تھے۔ میں اس کی ہر طرح سے مالی مدد کرتی تھی۔ وہ مجھے منع کرتی رہ جاتی پر مجھے اپنی بہن سے بہت محبت تھی اور میں چاہتی تھی کے وہ خوشحال رہے۔ میرے شوہر کے دو چچا زاد بھائیوں کا ہمارے گھر کافی آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ شروع میں، میں کافی ڈر گئی تھی۔ وہ میرے بچوں کو کہیں باہر لے جانا بھی چاہتے تو میں ان کو جانے نہیں دیتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ان دونوں نے مجھ پر اپنا اعتبار قائم کیا۔ اب میرے دونوں بیٹے ان کی آمد پر بہت خوش ہوتے تھے۔ میں بھی مطمئن تھی کہ میرے بچے

ہوئی کوئی چیز نظر آئی۔ اس وقت بجلی دوبارہ چمکی اور انہوں نے جھک کر اسے اٹھالیا۔ وہ کچھ مٹی میں دبی تھی کچھ بارش سے باہر آگئی۔

انہوں نے کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔ گھر آئے بچے سو رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ ''دیکھو یہ کیا چیز ملی ہے۔'' میں نے لالٹین کی لو اونچی کی۔ ''یہ تو بڑی خوب صورت سرمے دانی ہے۔''

ہم میاں بیوی باورچی خانے میں آگئے اور اچھی طرح اسے دیکھنے لگے۔ بالشت بھر سے کچھ کم تھی۔



''چاندی کی معلوم ہوتی ہے۔'' میں بولی۔

''یہ چاندی ہی کی ہے۔'' وہ بولے۔ ''تم لے لو سنبھال کے رکھ لو استعمال کرلینا۔''

''ہمارے بڑوں نے زمین پر پڑی چیز اٹھانے سے منع کیا ہے۔ عالم کہتے ہیں کہ اس طرح چیز کو مالک تک پہنچانا واجب ہو جاتا ہے۔'' دادی اماں نے شریعت بتائی۔

''ارے بہن صاحبہ! میں تو کسی مولوی ملا کی بیٹی تھی نہیں لیکن پتا نہیں کیوں یہ بات مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھی خیر انہیں کھانا دیا ہم کمرے میں آگئے۔ سنگھار کے لیے ایک میز تھی۔ اسی میں آئینہ لگا تھا۔ وہیں اسے رکھ دیا اور ہم سو گئے۔ رات بھر میں خواب میں دیکھتی رہی کہ یہ رقص کر رہی ہے۔ صبح اٹھ کر ناشتے پانی میں دماغ سے نکل گیا۔ دوپہر جب صفائی کر رہی تھی تو یہ اپنی جگہ سے کافی دور تھی کسی بچے نے دیکھی ہوگی مجھے کچھ ڈر سا لگا۔

کمرہ ایک ہی تھا لیکن کافی بڑا تھا۔ تین بیٹے ایک بیٹی تھی۔ آپ کو تو معلوم ہے بیٹی کی شادی کردی تھی چھوٹی عمر میں۔ وہ اپنے گھر میں تھی۔ ہم لڑکے سب اسی کمرے میں سوتے تھے۔ رات جب سب سونے کے لیے لیٹ گئے میں اسی کو دیکھ رہی تھی، نیند پتا نہیں آئی کہ نہیں مجھے لگا وہ اپنی جگہ سے ہل رہی ہے۔ پھر لگا کہ وہ ناچ رہی ہے۔ سب کی طرف دیکھا وہ بے خبر سو رہے تھے۔ میرا ڈر کے مارے برا حال۔ اتنے میں کمرے کا وہ دروازہ جو باہر کھلتا تھا چر کر کے کھلا اور ایک آدمی دھوتی پہنے اوپر سے ننگا تمام سر منڈا ہوا اور یہ موٹی چوٹی ہمارے کمرے میں گھس آیا۔''

''اُف میرے خدا!'' میری نڈر دادی حضور بھی سہم گئیں۔ ان کی نواسی ان کی گود میں آگھسی۔ باہر کے بچے



محورقص سرے دانی

سیدہ تبسم زہرہ رضوی

تقسیم کے وقت کی پُراسرار کتھا، پُراسرار سرے دانی صاحب کو کیا ملی کہ

اک جاہی تے زندگی ہی اجیرن کر ڈالی

یہ میرے بچپن کی بات ہے۔ آسمان پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ملک تقسیم ہو رہا تھا اور پھر بنگلہ دیش بن گیا۔ ہمارے پڑوس میں ایک بزرگ خاتون رہتی تھیں۔ وہ میری دادی حضور کی سہیلی تھیں۔ اکثر شام کو اپنے گھر سے فارغ ہو کر ہمارے گھر آ جاتیں۔ دادی حضور کے پاس بیٹھ جاتیں اور قصے کہانیاں شروع ہو جاتے۔ ان کی نواسی میری سہیلی تھی۔ ہم اپنی گڑیاں کھیل رہے ہوتے اور بچے بھی آ جاتے۔

میرے کان نانی اماں کی طرف ہی لگے رہتے تھے اور دوسرے بچوں کو پتا بھی نہیں چلتا۔ میں بظاہر ان کے ساتھ کھیل رہی ہوتی لیکن میرے کان ان کی کہانی سن رہے ہوتے۔ موضوع زیادہ تر تقسیم ہی ہوتا پھر بہتیں۔

''اے بہن یہاں بھی وہی حالات ہوتے جا رہے ہیں۔'' لیکن یہ موضوع نیا تھا۔ اس لیے توجہ بھی زیادہ ہوئی۔

''آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ پاکستان کیسے آ گئیں؟''

''ارے بہن ہماری کہانی سب سے الگ ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''ہم کانپور کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے لکھنو کے قریب۔''

''ہاں ہاں جانتی ہوں بلکہ دیکھا ہے۔ اناؤ میں ہماری زمینیں تھیں۔ (اب بھی ہیں)''

''خیر بہن صاحب یہ بات بتاتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

''پھر تو میں ضرور سنوں گی۔'' دادی اماں نے جواب دیا۔ اب میری بھی تمام حسیات بیدار ہو گئیں۔

''ارے بھائی کیا بتائیں۔ کوئی سر نہ پیر اب تو خود؟ یہاں کسی کو نہ بتایئے گا۔''

''بے فکر رہیں۔''

''ان کے والد تھے حکیم کے باپ۔ ان کے بیٹے نے عبدالحکیم کا نام لیا۔'' اور لہجے میں پُراسراریت پیدا کی۔

''ہاں ڈیوٹی سے آ رہے تھے۔ راستے میں ایک مکان گرا پڑا تھا۔ گرا کے کی سروں تھی۔ بارش بھی صبح سے ہوئے چلی جا رہی تھی پھر؟ بچی جتنی انہیں مٹی میں دبی

"صبح انشاء اللہ اس لیے کہ ابھی رات ہے گھر جا کر آنا مشکل ہے۔ کل میں انہیں کپڑے میں لپیٹ کر لے آؤں گا۔ گھر آ گئے سب سو گئے۔ کچھ ہی دیر گزری ہو گی کہ یہ حکیم ایسی چیخ مار کر اٹھا کہ ہم لوگ دہل گئے۔

ابا یہ سرمے دانی میں سے مورتی نکلی۔ یہ میرا گلا گھونٹ رہی تھی۔ اتنی بڑی ہو گئی تھی میں نے گھبرا کے پلٹ کر جو دیکھا، بہن صاحبہ واقعی وہ مورتی اتنی بڑی کہ اس کا سر چھت سے لگ رہا تھا۔ میرا گلا گھونٹ رہی تھی۔ مارے خوف کے میرا پیشاب خطا ہو گیا اور یہ حکیم بے ہوش۔ کسی لحاظ کے بغیر میں ان سے لپٹ گئی۔ پھر شاید ہم سب بے ہوش تھے۔ آواز آئی خبردار ہمیں کسی کے حوالے نہ کرنا۔ وہ جعلی پنڈت ہے۔ وہ ہمارا چاندی کا گھر اور ہمارا سونے کا وجود بیچ ڈالے گا۔

صبح آنکھ کھلی۔ گھر کے ہر فرد کو سب یاد تھا ان کے باپ بڑے نڈر تھے۔ ان کا بھی منہ اترا ہوا تھا۔ کیا کریں حالات اتنے خراب کہ کرفیو لگا ہوا تھا۔ ورنہ کسی مولانا کے پاس جاتے۔ رات کو سب ڈر کے مارے دلان میں سوئے۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ بستر چار پائیوں پر دونوں بھائی ایک میرے پاس ایک چارپائی پر۔ دعائیں دم کر کے سو رہے۔ رات کو ان کے باپ نے دیکھا کہ اس طرح سرمے دانی رقص کر رہی ہے جیسے پہلے دیکھا۔ وہی آدمی سڑک کی طرف سے آیا جو پوجا پاٹ کیا کرتا تھا۔ وہی ہے اس نے سرمے دانی کو کھولا بھگوان برآمد ہوئے پھر اس نے ان کے آگے ہاتھ باندھے اور کچھ ان کو دیا یہ ایک لباس تھا جو انہوں نے پہنا۔ آج سیوک کے ہاتھ میں مسند نہیں تھی۔ ان کے ابا نے بتایا تھا کہ ڈر پوری زندگی میں اس طرح کبھی نہ لگا تھا۔

"پھر کیا ہوا۔" اب تو دادی حضور اپنا پان تمباکو تک بھول چکی تھیں۔

"سیوک ہاتھ باندھے ساتھ تھا۔"

وہ لوگ والان میں آ گئے۔ سیوک نے ان کے ابا کے پلنگ کے پاس کرسی لا کر رکھی اور مورتی اس پر بیٹھ گئی۔ اب یہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

"ہم تم سے ایک سودا کرنے آئے ہیں۔" خوف سے گھگی بندھی ہوئی تھی۔ اشارے سے پوچھا۔ "کیا؟"

"تمہارے پاس دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارا سیوک بن جا، اپنے خاندان کے ساتھ۔"

یہ کوئی مذہبی نہ تھے پھر بھی ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"اچھا ہے کہ تو ہماری بات مان لے ہم تجھے مالا مال کر دیں گے۔"

اب ڈر کچھ کم ہو گیا تھا۔ لہٰذا سختی سے منع کر دیا۔

"اچھا پھر اس مکان کو ہمارے حوالے کر دے۔ یہ ہمارے پرکھوں کی جاگیر ہے۔ ہم تجھے اس کی قیمت دے دیں گے۔"

اس پر یہ خاموش ہو گئے۔ صبح مجھے بتایا۔ "بولو کیا کریں۔ سب محلے والے رشتے دار پاکستان جا رہے ہیں ویسے بھی ہم اکیلے رہ جائیں گے۔"

وہ یوں ہی کھوئے کھوئے اٹھے جا کر مورتی کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ "بھگوان جی! ہم مکان چھوڑنے پر تیار ہیں۔"

پھر میرے پاس دالان میں آ گئے اور اسی وقت گلی والے دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ باہر گئے ایک آدمی تھا اس نے رومال میں بندھی رقم ان کے ہاتھ پر رکھ دی۔ "یہ مکان کی قیمت ہے مگر حقدار کا حق ضرور دینا۔" یہ کہہ کر وہ آدمی چلا گیا۔

بچے گلی میں چلے گئے تھے۔ ہم میاں بیوی نے رقم گنی۔ پورے دس ہزار تھے۔ مکان خوب بڑا ڈبل منزل پختہ و مضبوط بنا ہوا تھا ہمارے ساس سسر کے زمانے کا۔ ان کے تین بھائی اور بھی تھے ایک بہن بھی تھی۔ ہماری نند لڑاکا تھی۔ خیر انہوں نے سب کو حصہ دیا۔ ایک قافلہ پاکستان جا رہا تھا۔ ہم بھی اس کے ساتھ آ گئے۔ اچھا میں چلوں کیا بج گیا گیارہ۔" دادی حضور نے کہا۔

"یہ بتائیں وہ پھر کبھی نظر آئے۔"

"نہیں خدا کا شکر۔" ساری رات ہم دادی پوتی خواب میں مجو رقص سرمے دانی دیکھتے رہے۔

☆☆☆

اپنے گھروں کو؟ اور میں خود بھی اپنی دادی حضور کی بغل میں بیٹھ گئی۔

''پھر نانی اماں۔''

''اس کے ہاتھ میں مندسی تھی۔ اس نے اسے زمین پر بچھالیا۔ پھر سرے دانی کو اٹھا کر چوما پھر درمیان سے کھولا۔ درمیان میں پیچ تھے۔ ارے بہن صاحبہ اس میں اتنی خوب صورت مورتی تھی کہ کیا بتاؤں۔ اس آدمی نے مندز مین پر بچھائی اور ایک چمکیلا سا کپڑا ہماری تپائی پر بچھا کر مورتی رکھ کر زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پوجا پاٹ کرنے لگا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ میں بے ہوش ہوگئی یا سوگئی۔ صبح اٹھی تو سب کچھ اسی طرح تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اسے وہیں چھوڑ آئیں جہاں سے لائے تھے۔ کہنے لگے۔ ''کیوں؟'' میں نے سب بتادیا۔ انہوں نے خوب مذاق اڑایا۔ ''تمہارا پیٹ خراب ہوگیا ہے برے خواب نظر آرہے ہیں۔''

ہمارے گھر کے ساتھ ایک احاطہ تھا۔ وہ ہماری ملکیت تھا۔ اس میں ہمارے مویشی تھے۔ وہاں سے اس وقت لڑکا آیا۔

''چاچا آپ کی دودھ دینے والی بکری مرگئی۔''

دو دن بعد بھینس مرگئی اور نقصان پر نقصان ہونے لگے۔ ''آپ اسے پھینک کیوں نہیں آتے؟''

''میں جمعے کے خطبے میں گیا تھا مولوی کہہ رہے تھے دوسرے کے مذہب کا احترام کرنا چاہیے۔ یہ ہمارے حضور کا فرمان ہے۔ پتا نہیں وہاں کن ہاتھوں میں پڑے۔ میں چھٹی کے دن کسی پنڈت سے مل کر یہ اس کے حوالے کردوں گا۔''

پاکستان بن چکا تھا۔ ہم لوگوں کا ارادہ وہیں رہنے کا تھا۔ وہاں ہمارا گھر بار تھا۔

لیکن اس رات جب سب بے خبر سو رہے تھے بہت سے بلوائی گھس آئے جئے بجرنگ بلی کے نعرے سے آنکھ کھلی۔ پھر لگا کہ کوئی دروازہ توڑ رہا ہے۔ ہم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ دروازہ بہت مضبوط تھا۔

''دروازہ کھول دو جان سے نہیں ماریں گے۔ سامان لوٹ کر چلے جائیں گے۔''

تینوں جوان بیٹے اور ہم۔ ان کے باپ نے اندر سے کہا۔ ''اپنی بات سے پھر گئے تو نہیں۔''

اور انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ پانچ سات بلوائی اندر گھس آئے۔

''آپ کو یقین نہیں آئے گا؟''

''کیسے نہیں آئے گا۔ آپ کہیے۔''

''ارے بہن! وہ سرے دانی ہلی اور اس میں سے دھوئیں کی لکیر نکلی اور سیدھی ان کی آنکھوں میں؟''

''ہائیں!'' حیرت سے دادی حضور کا منہ کھل گیا۔ وہ بہت غصے والی خاتون تھیں اور بہت لیے دیئے رہتی تھیں۔ انہیں حیرت زدہ دیکھ کر میری بھی سمجھ میں یہی آیا کہ بہت حیرت کی بات ہے۔ شاہدہ یعنی ان کی نواسی خوفزدہ ہوکر ان کی گود میں سو چکی تھی۔ میں دادی حضور سے چپکی بیٹھی کہانی ختم ہونے کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

''پھر کیا ہوا؟'' دادی کے ساتھ میں بھی بول پڑی۔

''بھئی ان کی آنکھیں دھوئیں سے لگتا تھا مرچیں مل ہیں چندھیا گئیں۔

جب یہ دیکھ کر دھواں سرے دانی سے نکل رہا ہے تو ایسا بھاگے کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ پھر وہ جو کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے ہمیں بھی نیند آگئی۔ رات ان کے باپ نے بھی وہی منظر دیکھا جو میں نے دیکھا تھا۔ اس میں اضافہ یہ ہوا کہ مورتی نے ان کا نام لے کر کہا کہ ہم نے تمہاری مدد اس لیے کی ہے کہ تم ہمیں بارش سے بچا کر لائے تھے۔

صبح انہوں نے مجھے بتایا۔ ''میں آج ہر حال میں پنڈت ڈھونڈتا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ بلوے ہو رہے ہیں۔ میں اس تک کیسے پہنچوں کہیں کوئی مار نہ دے۔''

دن میں چہل پہل ہوگئی۔ ایک دوست تھے رام چندر۔ ان سے ملے پھر پنڈت جی تک پہنچے۔ انہوں نے کہا کہ آپ شوق سے ہمارے بھگوان ہمارے حوالے کردیں۔''

گیا کبھی لوٹ کر واپس نہیں آیا۔"

"کیا راستہ بتا سکتے ہو؟" حیدر نے دوبارہ اپنے سوال پر زور دیتے ہوئے کہا تو ویٹر نے انہیں راستہ سمجھا دیا۔

بل ادا کر کے تینوں دوست ہوٹل سے باہر نکلے۔ علی اور حیدر جانتے تھے کہ عثمان بہت کچھ ان سے کہنا چاہتا ہے لیکن باوجود سعی کے وہ چپ ہے۔

"زندگی کتنی خوشگوار ہو جائے گی اگر ہم لوگ کامیاب لوٹے تو؟" حیدر نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اگر لوٹے تو؟" عثمان بالآخر بول پڑا اور اس کی بات سن کر دونوں نے اسے کھا جانے والے انداز سے گھورا۔

"یار کیا منہ لٹکا یا ہوا ہے؟" علی پیچ و تاب کھا کر بولا۔ "اس سے تو بہتر ہے تم نہ ہی ہمارا ساتھ دو۔ بجائے ہماری ڈھارس بندھانے کے ہمیں الٹا ڈرانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو۔"

جواباً عثمان نے چپ سادھ لی۔ جلد ہی وہ ایک گھنے جنگل کے سامنے پہنچ گئے۔ جنگل دور سے ہی بڑا عجیب دکھائی دے رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر خوف کی ایک سرد لہر تینوں کے جسموں میں سرایت کر گئی۔ لیکن تینوں نے اپنی کنڈیشن ایک دوسرے پر واضح نہ ہونے دی۔ جنگل کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔ حالانکہ سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سورج کی کرنیں جنگل کے اندر داخل نہیں ہو پا رہیں۔ تینوں کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔

"ہماری منزل ہم سے کچھ فاصلے پر ہے۔" عثمان گویا ہوا تو دونوں نے حیرت سے اسے گھورا۔ "یہاں کھڑے ہو کر سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

دونوں دوستوں نے اس کی بات کی تائید کی اور تینوں جنگل کے اندر داخل ہو گئے۔ دیو قامت اور گھنے درختوں نے جنگل کے اندر گھپ اندھیرا پیدا کیا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ





خونی خزانہ



ملک این اے کاوش

اک پُراسرار خزانے کی وہ داستان جس نے خزانہ حاصل کرنے والے تینوں دوستوں کو کھا گیا

تینوں دوست نقشہ سامنے میز پر رکھے سر جوڑے مضطرب براجمان تھے۔ علی اور حیدر بضد تھے کہ نقشہ کی تلاش میں نکلنا چاہیے جبکہ عثمان متواتر انہیں سمجھا رہا تھا کہ نقشے تک پہنچنے سے قبل ہی اجل اچک لے جائے گی لیکن دونوں دوستوں کی ضد اپنی جگہ برقرار تھی۔

''میں نے خود پتہ لگوایا ہے۔ یہ خزانہ جس غار کے اندر ہے اس سے پہلے ایک گھنے جنگل سے گزرنا پڑتا ہے۔'' عثمان نے انہیں بتایا۔ ''اس جنگل کی طرف جو بھی گیا ہے آج تک واپس نہیں آیا۔''

''لیکن اس بار ایسا نہیں ہوگا۔'' حیدر بولا۔ ''ہم ثابت کردیں گے کہ ہم کامیاب لوٹے ہیں۔ اس دنیا میں سب سے طاقتور انسان ہے۔ چاہے تو ہر چیز کو اپنا بندی بنالے۔''

''وہ لوگ اور ہیں۔'' عثمان بے چارگی سے بولا۔ ''ہم لوگ اپنی قسمت نہیں بدل پار ہے ہر چیز کو اپنا بندی کیسے بنائیں گے؟''

''قسمت بدلنے کا وقت اب آچکا ہے میرے بھائی۔'' علی نے لقمہ دیا۔ ''اگر اس موقع سے ہم نے فائدہ نہ اٹھایا تو ممکن ہے کوئی اور ہی مستفید ہو جائے اور ہم دیکھتے رہ جائیں۔''

عثمان نے مجبوراً حامی تو بھر لی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کا دل بری طرح سے گھبرا رہا تھا۔ اس کے من میں خوف کی گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں لیکن دوستوں کے سامنے انکار کر کے وہ خود کو بزدل نہیں کہلوانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ ضرور اپنے دوستوں کے ساتھ جائے گا۔

☆......☆......☆

تین گھنٹے مسلسل سفر میں رہنے کی وجہ سے وہ کافی تھک چکے تھے۔ گاڑی سے اترتے ساتھ ہی انہوں نے پہلے ایک ہوٹل سے جاکر ڈٹ کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد انہوں نے ویٹر سے چوک محل کا راستہ پوچھا تو اس نے حیرت سے انہیں گھورا۔

''وہاں کیا کرنے جارہے ہو تم لوگ؟'' ویٹر نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا راستہ بتا سکتے ہو؟'' حیدر نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔'' ویٹر بولا۔ ''لیکن مشورہ دوں گا یہیں سے واپس لوٹ جاؤ۔ جو بھی اس طرف

اگلا منظر دیکھ کر اس کی حیرت ہویدا ہو گئی۔ وہ اس غار کے دہانے کے سامنے بیٹھا تھا۔ جس کے اندر نقشے کے مطابق خزانہ تھا۔ جہاں اسے دوستوں کے بچھڑ جانے کا ملال تھا۔ وہیں اسے خزانہ ملنے کی خوشی بھی تھی۔

عثمان سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھا اور غار کی اور بڑھا۔ غار کے اندر سورج کی کرنیں جانے کی وجہ سے کافی اجالا تھا۔ عثمان آگے بڑھ رہا تھا۔ تبھی اس کی نظر ایک طرف بڑے بڑے لکڑی کے صندوقوں پر پڑی۔ عثمان خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ تبھی عثمان کی نگاہ ایک صندوق پر براجمان ایک ناگ پر پڑی۔ جس نے اپنا پھن پھیلایا ہوا تھا۔ عثمان کو اپنے جسم میں دوڑتا لہو منجمد ہوتا ہوا محسوس ہوا لیکن اس کی خوشی کا اس وقت کوئی ٹھکانا نہ تھا جب اس نے سانپ کو باہر کی طرف نکلتے ہوئے دیکھا۔ جب ناگ غار سے باہر نکل گیا تو عثمان جلدی سے ان صندوقوں کی طرف بڑھا جیسے جیسے وہ صندوقوں کے ڈھکنے اتار کے دیکھ رہا تھا ویسے ویسے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ سارے صندوق لبالب ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے تھے۔ عثمان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سارے صندوق لے کر چلا جائے۔

اس نے ایک صندوق کا آخر انتخاب کیا۔ اس کے اندر ہیرے جواہرات کا انبار لگا ہوا تھا۔ عثمان جانتا تھا کہ وہ اتنا خزانہ تھا کہ اس کی درجنوں نسلیں پاؤں پہ پاؤں دھر کر بیٹھ کر کھا سکتی تھیں۔ بڑی ہی مشکل سے عثمان نے اس صندوق کو اٹھا کر سر پر لادا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ عثمان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ خوابوں کے اندر وہ خود کو ایک شہزادے کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ عثمان صندوق اٹھائے جیسے ہی غار سے باہر نکلا اگلا منظر دیکھ کر اس کے سارے سپنے کرچیاں کرچیاں ہو کر رہ گئے تھے۔

عثمان نے ایک ٹھنڈا مگر لمبا سانس خارج کیا اور سر پر لادا ہوا صندوق بڑی مشکل سے اتار کر زمین

شہابِ ثاقب زمین پر کیوں گرتے ہیں؟

رات کے وقت آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ اچانک آسمان سے ایک تارا ٹوٹا اور روشنی کی ایک سفید لکیر بناتا ہوا زمین کے نزدیک آ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ درحقیقت یہ آسمان سے ٹوٹا ہوا کوئی ستارہ نہیں ہوتا بلکہ شہابِ ثاقب ہوتا ہے۔ ستارے بہت عظیم اجسام ہوتے ہیں۔ ان کا اس طرح ٹوٹتے رہنا ممکن نہیں۔ پھر ستاروں کا زمین سے فاصلہ بھی کروڑوں اربوں کلومیٹر ہوتا ہے۔ چونکہ کائنات میں شکست و ریخت کا عمل بھی جاری ہے۔ اس لیے جب زمین اپنی کششِ ثقل کے تحت خلاء میں آوارہ گھومتے ہوئے اجسام کو اپنے مرکز کی طرف کھینچتی ہے تو وہ آوارہ اجسام زمین کے کرۂ ہوائی میں داخل ہو جاتے ہیں اور ان کی رفتار بھی انتہائی بڑھ جاتی ہے۔ یہ چند سیکنڈ میں کئی کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیتے ہیں۔ جب یہ زمین کی حدود سے دور ہوتے ہیں تو بجھے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کا درجہ حرارت بھی کم ہوتا ہے لیکن کرۂ ہوائی میں داخل ہونے کے چند لمحوں ہی میں یہ ہوا اور فضائی ذرات کی رگڑ سے جل جاتے ہیں اور زمین تک پہنچتے پہنچتے راکھ بن جاتے ہیں۔

حسنِ انتخاب: رقیہ یوسف۔ سیالکوٹ

پر رکھا۔ اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے سامنے منظر ہی اتنا بھیانک تھا کہ اسے اپنی بھیانک موت مترشح دکھائی دے رہی تھی۔ سینکڑوں کی تعداد میں سانپ پھن پھیلائے اس کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ سانپ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔

عثمان نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں اتھرو آ گئے۔

''رکو میرے دوستوں مجھے بھی ساتھ لیتے جانا۔'' آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے عثمان بولا اور پھر وہ خود کو موت کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

☆☆☆

پڑتا تھا۔تھوڑی دیر تک تینوں دوست کھڑے رہے لیکن جلد ہی اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئے تو تینوں آگے بڑھے۔

ابھی انہوں نے بمشکل تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ یکدم انہیں یوں لگا جیسے ان کے پیچھے کوئی چیز گری ہو۔تینوں نے سرعت سے مڑ کر پیچھے دیکھا لیکن اگلا منظر دیکھ کر تینوں کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ان کے سامنے ایک عجیب وغریب شکل کا جانور کھڑا انہیں گھور رہا تھا۔اس جانور کا منہ کتے کی مانند تھا لیکن جسامت کسی گدھے کے برابر تھی۔سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اس کی صرف ایک آنکھ تھی وہ بھی اس کے ماتھے کے اوپر۔اس کی آنکھ عام جانوروں کی آنکھ سے دوگنا بڑی تھی۔

اس کی زبان کتے کی مانند منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی اور اس سے رال ٹپک رہی تھی۔وہ جانور کھا جانے والی آنکھوں سے انہیں گھور رہا تھا۔تینوں دوستوں کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی تھی۔بدحواسی کے عالم میں تینوں نے پیچھے کی طرف ہٹنا شروع کر دیا۔علی اور حیدر کو پہلی بار اپنی ضد پر افسوس ہو رہا تھا۔عثمان نے ٹھیک ہی کہا تھا لیکن انہوں نے ضد کر کے اپنی جان مصیبت میں ڈال دی تھی۔

''بھاگو۔'' یکدم عثمان چلایا۔ ہر جس کا منہ جس طرف لگا اس نے سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔

اس عفریت نے کھا جانے والی آنکھوں سے تینوں کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس نے علی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔علی اس بات سے انجان دوڑے جا رہا تھا کہ یکدم اسے رکنا پڑ گیا۔ کیونکہ جس طرف وہ دوڑ رہا تھا۔سامنے ہی وہ عفریت تھی۔علی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔عفریت نے لپک کر علی کو پکڑا اور ہوا میں اچھالا ایک سماعت شکن چیخ علی کے حلق سے برآمد ہوئی اور جنگل کے سکوت زدہ ماحول کا سینہ چیرتی چلی گئی۔علی جیسے ہی ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے آیا۔اس عفریت نے اسے دونوں پیروں سے پکڑ کر الٹا لٹکا لیا دوسرے ہی لمحے اس عفریت نے علی کے دونوں پیروں کو پکڑ کر اسے دو حصوں میں منقسم کر دیا۔علی کے حلق سے آخری سماعت شکن درد میں ڈوبی ہوئی چیخ نکلی۔اس عفریت نے اس کے جسم کے دونوں حصوں کو دائیں بائیں اچھال دیا اور ایک بار پھر ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا۔

دوسری طرف عثمان مسلسل دوڑ رہا تھا کہ یکدم کسی سے ٹکرا کر زمین پر جا گرا۔گرتے ہوئے مدھم سی چیخ اس کے حلق سے نکلی۔گرتے ساتھ ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا لیکن اگلا منظر دیکھ کر اس کے سانس میں کچھ سانس آئی۔اس سے ٹکرانے والا کوئی اور نہیں بلکہ حیدر تھا۔قبل اس کے کہ دونوں آپس میں کوئی بات کرتے علی کی چیخوں سے جنگل گونج اٹھا۔

''بھاگو۔'' عثمان نے حیدر کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف دوڑتے ہوئے کہا۔

''علی۔'' حیدر نے بھاگتے ہوئے روتے ہوئے کہا۔

''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔'' عثمان دوڑتے ہوئے بولا۔

دونوں دوست ایک دوسرے کے آگے پیچھے سرعت سے دوڑ رہے تھے۔کافی دیر دوڑنے کے بعد جب عثمان نے مڑ کر دیکھا تو اس کے حواس باختہ رہ گئے کیونکہ حیدر اس کے ساتھ نہیں تھا۔اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے نیچے جا گرے۔ایک بار پھر اس نے رہی سہی ہمت یکجا کر کے دوڑنا شروع کر دیا۔اس کی خوش قسمتی کہ جلد ہی اسے روشنی دکھائی دینے لگ گئی۔حتیٰ کہ اس خونی جنگل سے وہ باہر نکل آیا اور ایک چٹان پر بیٹھ کر تیز تیز سانس لینے لگا۔

اس کا سانس پھول چکا تھا۔کافی دیر چٹان پر بیٹھ کر اس نے سانس بحال کیا اور جب کچھ سانس لینے میں بہتری آئی تو اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن



ناول

ایم اے راحت

زرد لومڑی

قسط: 08

انتقام کی ایک نئی داستان، جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا۔

برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم سے ایک نیا معرکۃ الآرا سلسلہ

''آؤ۔'' اس نے بڑی شرافت سے کہا۔ ابھی میں اس کی شرافت پر غور کر رہی تھی کہ اس نے بڑی لمبی چھلانگ لگائی۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ میں اس پر گولی چلا سکتی تھی لیکن پھر مجھے اسٹیئر تک کون



''وہ ضرور ہو جائے گا۔''
''اتنے بھروسے سے کہہ رہی ہو۔''
''ہاں۔''
''وجہ؟''
''یہ تم اس سے پوچھتے لیکن تم نے مجھ سے سچ نہیں بولا۔''
''کس بارے میں۔''
''یہی کہ ڈاکٹر آس پاس کسی اسٹیمر میں موجود ہے۔''
''نہیں، میں نے سچ بولا ہے۔ وہ مدھم روشنی دیکھ رہی ہو، وہ اسٹیمر ہے نا۔''
''ہاں۔''
''ڈاکٹر اس پر ہے۔''
''میں کیسے یقین کرلوں؟''
''میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔ ڈاکٹر کے بیوی بچے کو بھی۔'' اور پھر وہ مسکرانے لگا اور میں نے اپنے بدن کی کچھ جنبشوں سے اس کی دیوانگی میں اور اضافہ کیا۔
''تو پھر ہو واسطے؟''
''ہاں۔''
''او کے۔'' اس نے کہا اور پھر تو ٹی کشتیوں کے انبار کی طرف اشارہ کر کے آواز لگائی۔ ''اونیو۔'' اور کوئی وہاں سے باہر نکل آیا۔ اس نام کو سن کر میں چونکی تھی لیکن جب وہ سامنے آیا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہی منحوس شکل خرگوش کی اولاد تھا جس کے دو دانت نچلے ہونٹ پر رکھے ہوئے تھے۔
میں نے نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھا تو وانگ نے کہا۔ ''یہ میرا بہترین وفادار اونیو ہے۔ درحقیقت اس وقت اس نے پانسہ پلٹا ہے۔ ورنہ تم نے تو چالاک لومڑی میرا کام ہی تمام کر دیا تھا۔ اونیو نے مجھے سہارا دیا ہے۔ تھینک یو اونیو، کیا تمہیں وہ کشتی مل گئی؟''
''یس سر! میں اسی سے آیا ہوں۔ وہ جیٹی پر کھڑی ہے۔''
''ہماری قابل احترام دوست۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا اور ایک آنکھ دبا دی۔
''اوہ سمجھ گیا۔'' اونیو بھی اوباشی سے مسکرا دیا۔
''یہ تمہارا کتا کہاں سے آگیا اس وقت؟''
''وفادار کتا ہے۔'' وانگ ہنس پڑا۔
''تم ڈاکٹر لیونسکی سے ملنا چاہتی ہو میڈم۔'' منحوس شکل اونیو چہکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے پھر کہا۔ ''ہم تمہیں اس سے ملنے کے لیے لے جا رہے ہیں اور یہ ڈاکٹر کی بیوی اور بچے، یہ بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔''
''اونیو تم؟'' وانگ نے کہا تو اونیو نے ہاتھ اٹھا دیا۔
''یہ ضروری ہے سر۔''
''او کے او کے۔ جو کرنا ہے جلدی کرو۔''
''چلیے سر۔'' اونیو بولا۔ پھر جلدی سے کہا۔ ''یہ ریوالور اس کے ہاتھ سے لے لیجیے سر۔'' اس نے میری

لے جاتا۔ مجھے وہ زندہ درکار تھا۔
اس وقت میں واقعی بے بس ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کمبخت وانگ صاف نکل گیا تھا۔ یہ مایوس لمحے میرے لیے بڑے افسوسناک تھے۔ فی الحال میں فیل ہو گئی تھی۔
''آؤ۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور ڈاکٹر کی بیوی بچے کو لے کر خود ہی ساحل کی طرف چل پڑی۔
سمندر میں مدوجزر تھا۔ لہریں اچھل اچھل کر ساحل کی طرف آ رہی تھیں۔ جان بچانے والے فوجی اب بالکل غائب ہو گئے تھے اور ایک طرح کا سناٹا چھا گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں آس پاس وہ چھوٹی کشتیاں بھی نہیں تھیں جو میں نے پہلے دیکھی تھیں۔ ہاں کچھ ٹوٹی کشتیوں کے ڈھانچے کچھ فاصلے پر انبار نظر آ رہے تھے۔
معاً میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ممکن ہے ان میں کوئی ٹوٹی کشتی اس حد تک سالم نکل آئے کہ میں ان دونوں کو لے کر اس جزیرے سے دور نکل جاؤں۔ ڈاکٹر ہیمر تک جانے کا خیال تو اب ترک کرنا پڑا تھا۔ اس کے لیے نئے سرے سے کام کرنا ہو گا۔ ساری محنت اکارت چلی گئی تھی جس کا مجھے دلی افسوس تھا۔
ٹوٹی کشتیوں کے ڈھیر کے پاس پہنچ کر میں رکی اور نظریں دوڑانے لگی کہ کوئی ایسی سالم کشتی نظر آ جائے جو میرے کام آ سکے۔
اچانک ڈاکٹر ہیمر کے لڑکے کے حلق سے ایک خوف بھری چیخ نکلی۔ اور میں اچھل پڑی۔ میں نے وحشت زدہ نظروں سے دیکھا اور سناٹے میں رہ گئی۔ وہ وانگ تھا جس نے ڈاکٹر کے لڑکے کو دبوچ لیا تھا اور اب ایک جی فائیو پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگا رکھی تھی۔ وہ کمینہ شاید ٹوٹی کشتیوں کے ڈھیر میں چھپا ہوا تھا۔
''چھوڑ دو اسے، چھوڑ دو۔ ڈاکٹر کی بیوی روتی ہوئی اس پر جھپٹی اور اس نے اپنے بیٹے کو اس کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی لیکن وانگ نے وزنی پستول اس کے سر پر مارا اور وہ ایک دردناک چیخ کے ساتھ دور جا گری، میں بے بسی سے ہاتھ مل رہی تھی۔
''کیا خیال ہے میڈم، تمہاری ساری چالاکی ختم ہو گئی۔ اب کیا کہتی ہو۔''
میرے منہ سے آواز نہیں نکل سکی تو وہ دوبارہ بولا۔
''باقی اور جو کچھ بھی ہے۔ میں جن کاموں میں مصروف تھا لیکن جب بھی میری نگاہ تم پر پڑی۔ ایک حسرت ضرور میرے دل میں بیدار ہو گئی۔ تمہارے حصول کی حسرت۔ بعض چہرے اور بدن اس قدر حسین ہوتے ہیں کہ انسان بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بے اختیار کر دینے والوں میں سے ہو۔''
میرے ذہن نے فوراً قلابازی کھائی اور میں نے اپنے چہرے کے تاثرات بدل لیے۔ میں نے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ''چلو پھر ہم سودا کر لیں۔''
''کیسا سودا؟''
''ڈاکٹر کو میرے حوالے کر دو یا پھر میرے لیے یہاں بندوبست کر دو۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس چھوڑ دو۔ میں پوری وفاداری سے کام کروں گی اور...... خود کو پوری طرح تمہارے حوالے کر دوں گی۔''
اس کی آنکھوں میں ہوس ناچ اٹھی۔ اس نے کہا۔ ''میں کیسے یقین کر لوں۔''
''جیسے چاہو۔'' میں نے ایک ادا سے کہا۔
''اور اگر ڈاکٹر تمہیں ساتھ رکھنے پر راضی نہ ہوا؟''

میں نے پوری مہارت سے اس پر چھلانگ لگائی اور اس کا خطرناک ریوالور پھر میرے ہاتھ میں آ گیا۔
ڈاکٹر کا بیٹا بھاگ کر باپ سے لپٹ گیا لیکن وانگ کو اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر کی طرف لپکا نتیجے میں مجھے گولی چلانی پڑی۔ اب یہ وانگ کی بدقسمتی تھی کہ گولی سیدھی اس کی پیشانی میں جا گھسی اور اس کے دونوں ہاتھ پھیل گئے لیکن مجھے اس سے زیادہ خطرہ اس منحوس چالاک اونیو سے تھا جو وانگ سے زیادہ خطرناک تھا۔ حالانکہ بے مقصد خونریزی مجھے پسند نہیں تھی لیکن ایک تو مجھے اس شخص کی صورت سے نفرت تھی۔
دوسرے میں جانتی تھی کہ اگر وہ زندہ رہا تو شاید میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکوں۔ چنانچہ میں نے لگاتار دو فائر اس پر جھونک دیئے۔ میری زندگی بھر کا ریکارڈ تھا کہ میرا نشانہ کبھی خالی نہیں گیا تھا۔ یہ دونوں فائر میں نے اس کی پیشانی اور دل کا نشانہ لے کر کیے تھے۔ اس نے دوبارہ ہلکی سی جنبش کی تھی اور دونوں گولیوں نے جہاز کی دیواروں میں سوراخ کر دیئے تھے۔ وہ جلدی سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور اس جگہ جا کر کھڑا ہوا جہاں پیچھے کسی کے نشانہ بننے کا خطرہ نہیں تھا۔
دوسری طرف مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرا نشانہ خالی گیا ہے۔ میں نے دوبارہ اس کا نشانہ لیا اور فائر جھونک مارا۔ پھر رکے بغیر گولیاں چلاتی رہی۔ لیکن ایک بھی گولی نشانے پر نہیں لگی۔ وہ پینترے بدل بدل کر میرا ہر فائر خالی کر رہا تھا۔
یہ جادوگری تھی جو کبھی دیکھی نہیں۔ حالانکہ صرف بارہ فٹ کے فاصلے سے صحیح نشانے لے کر گولیاں چلائی جا رہی تھیں لیکن اس کے بدن کی پھرتی سے کام لے کر سارے نشانے خالی ہونے لگے۔ ریوالور سے نکلی گولی پر نگاہ جمانا، اس کے راستے کا تعین کرنا اور نشانے کی جگہ کو خالی کر دینا انسانی عمل نہیں تھا جب کہ ریوالور سے سیکنڈوں کے حساب سے فائر ہوتے ہیں۔ مجھے خیال نہ رہا کہ میں نے کتنے فائر کیے یہاں تک کہ ریوالور خالی ہو گیا۔
مجھے یقین آ گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے میرے سامنے کوئی انسان نہیں بدروح ہے۔ یہ کام کسی انسان کا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کے دیکھا۔ وہ مجھے بھول کر پہلے وانگ پھر ڈاکٹر بیمر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
''آپ ٹھیک ہیں ڈاکٹر۔''
''ہاں یہ...... یہ مر گیا۔'' ڈاکٹر بیمر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔
''ہاں اسے مرنا ہی چاہیے تھا۔ آپ میرے ساتھ انجن روم تک آنا پسند کریں گے۔''
''ضرور۔'' بیمر لیوسکی نے کہا۔ پھر بولا۔ ''ادھر سے کوئی نہیں آیا؟''
''میں نے منع کر دیا ہے۔ آیئے اور میڈم آپ ان دونوں کے ساتھ رہیں۔ یہ دوسرا پستول رکھ لیں۔''
اس نے ایک اور خطرناک پستول اپنے لباس سے نکال کر میری طرف اچھال دیا۔ جسے میں نے کیچ کر لیا۔ وہ لاپروائی سے ایک طرف مڑ گیا۔ لیوسکی نے کہا۔
''تم ایلسی کے ساتھ رہو۔ ہم ابھی دوبارہ تم سے ملیں گے۔'' اور پھر وہ بھی اونیو کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔
میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اونیو اور ڈاکٹر بیمر کے درمیان کافی انڈراسٹینڈنگ معلوم ہو رہی تھی۔ جب کہ اونیو مقامی آدمی تھا اور بہت سے موقعوں پر وہ ان لوگوں کے ساتھ کام کرتا نظر آیا تھا۔ اس وقت وہ بھرپور طریقے سے وانگ کا ساتھی تھا اور اب......

طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اوہ ہاں۔تھینک یو اوینو۔''

میرا بس نہیں چلا تھا ورنہ ریوالور جو میں نے وانگ کے ہولسٹر سے نکالا تھا پورے کا پورا اوینو پر خالی کر دیتی۔وانگ اس قدر چالاک نہیں تھا جتنا یہ کمینہ اوینو تھا۔

''ٹھیک ہے اوینو، تیرے بدن میں درجن بھر خون اگلتے سوراخ نہ بنائے تو میرا نام بھی ایلی پارک نہیں۔میں سمجھ گئی تھی کہ اوینو کی نیت ڈاکٹر کی بیوی پر خراب ہوگئی ہے جو بہرحال جوان ہی تھی۔اسی لیے وہ اسے اسٹیمر پر لے جانے کی جلدی کر رہا تھا لیکن یہ بڑی دردناک بات تھی جو میں زندگی کی قیمت سے بھی نہیں ہونے دے سکتی تھی۔یہ شخص۔

میں نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا اور وہ اپنے خرگوش نما دانتوں کو نکال کر مسکرا دیا جیسے میرے دل کی بات سمجھ گیا ہو۔

ریوالور وانگ کے ہاتھ میں پہنچ گیا اور اس نے اس سے اشارہ کر کے ہمیں آگے چلنے کے لیے کہا اور میں چل پڑی۔ڈاکٹر ہیمر کی بیوی اور بیٹا ساتھ تھے۔میں اس وقت خطرناک ترین لمحات سے گزر رہی تھی۔وانگ جیسے گدھے سے مجھے اور تو کوئی خطرہ نہیں تھا بس میں سوچ رہی تھی کہ ڈاکٹر کو ان کے چنگل سے نکال کر میں کہاں لے جاؤں گی۔

جیٹی پر ایک چھوٹی موٹر بوٹ کھڑی تھی جس میں ہم تینوں کو اتارا گیا۔وانگ بھی میرے پاس آ کھڑا ہوا اور اوینو نے بوٹ کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔بوٹ اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔

''صرف یہی نہیں ڈاکٹر اگر تمہیں قبول نہیں کرتا تو میں تمہیں اپنے محکمے میں ایڈجسٹ کرلوں گا۔عیش کرو گی۔''وانگ مجھے طرح طرح کے لالچ دے رہا تھا۔میری نظریں اس بڑے کونسل پر جمی ہوئی تھیں جو سمندر میں لنگر انداز تھا۔ایک چھوٹا انگریزی کونسل، جو دور سے دیکھنے پر ہی خوب صورت نظر آرہا تھا۔ان کے کہنے کے مطابق ڈاکٹر اس پر موجود تھا۔

تھوڑی دیر میں موٹر بوٹ کونسل کے پاس پہنچ گئی۔اوینو بندر کی طرح پھرتیلا تھا۔وہ چھلانگ لگا کر لنگر کی زنجیر پر چڑھ گیا اور برق رفتاری سے اوپر پہنچ گیا اور پھر اپنی کارروائی میں مصروف ہوگیا۔جوانی کی بات تھی کہ کونسل شپ پر کوئی اور موجود نہیں تھا کیونکہ اوینو نے ہی سیڑھی نیچے گرائی تھی۔''وانگ کے اشارے پر پہلے ڈاکٹر کی بیوی اوپر چڑھی اس نے اپنے آگے اپنے بیٹے کو رکھا تھا پھر میں اور آخر میں وانگ اوپر آگیا۔

وانگ کی آنکھوں میں نفسانی خواہش کا خمار اترا ہوا تھا۔اس نے کہا۔

''آؤ میں تمہیں اپنا خوب صورت کیبن دکھاؤں۔''

''دماغ خراب ہوا ہے تمہارا۔''میں نے غصے سے کہا۔

''ارے کیوں۔''وانگ حیرت سے بولا۔

''ڈاکٹر کہاں ہے۔''میں غرائی۔

''اوہ غصہ مت کرو، ٹھیک ہے ڈاکٹر کی بیوی اور بیٹے کو اس کے کیبن میں بھیج دیتے ہیں۔''ابھی اس نے یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ سامنے والے کیبن کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر ہیمر لیونسکی وہاں سے نمودار ہوا۔وہ تو ایک لمحے اپنی بیوی اور بیٹے کو نہیں پہچانا تھا لیکن اس کے بیٹے نے ایک چیخ ماری۔

''پاپا!''اور اس چیخ نے میرا کام بنا دیا۔یہ چیخ سن کر فطری طور پر وانگ بھی اس طرف متوجہ ہوا تھا۔

ایک شب ہمیں لے کر شائریکا چل پڑے گا۔ راستے میں آپ کو مکمل تفصیل بتا دی جائے گی۔''
''لیکن کچھ باتوں کی وضاحت تو کر دیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔
''ہاں ضرور۔''
''ابھی آپ نے کچھ نام لیے۔''
''جی کون سے؟''
''ایمی پارک، زرد لومڑی۔'' اور اشارہ میری سیکریٹری ایلسی کی طرف کیا۔
''اوہ جی۔ یہ مس ایلسی نہیں ہیں۔''
''ایں..... پھر.....!'' ڈاکٹر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔
''مس ایمی پارک، مسٹر کارمیل ساترے کی کارکن۔'' افسر نے کہا۔ اسی وقت ایک اور شخص نے آ کر اطلاع دی کہ سارا کام مکمل ہے۔''
یہ میٹنگ ختم ہو گئی۔ ہمیں اسٹیمر پر منتقل کر دیا گیا۔ میں سب کچھ دیکھ رہی تھی، بن رہی تھی دوسروں کے لیے میری شخصیت حیران کن تھی لیکن میرے لیے یہ بدروح، جس کے دو دانت اس کی شخصیت کو مکروہ بنائے ہوئے تھے ورنہ وہ......
بڑا اسٹیمر ہمیں لے کر چل پڑا۔ اونیوان افسروں کے ساتھ تھا جب کہ ڈاکٹر ہیرا، اس کی بیوی اور بچہ اسٹیمر میں میرے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر نے اسٹیمر کے سفر کے دوران بھی پوچھا تھا۔
''تم واقعی ایلسی نہیں ہو۔''
''نہیں ڈاکٹر۔''
''جو تمہارے چہرے پر اس کا میک اپ پایا تم قدرتی طور پر اس کی ہم شکل ہو۔''
''میک اپ ہے سر۔''
''اوہ کمال ہے۔ اس رات بھی تم ہی مجھ سے ملی تھیں جب میں ان کا قیدی تھا۔''
''جی ڈاکٹر۔'' میں نے کہا اور ڈاکٹر گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔
اسٹیمر کا سفر کھلے سمندر میں کھڑے بہت بڑے شپ پر ہوا تھا جو ایک بیڑے میں شامل تھا لیکن یہی جہاز ہمیں شائریکا لے جانے والا تھا۔ ہمیں کیبنوں میں منتقل کر دیا گیا اور جہاز نے لنگر اٹھا دیے۔ اونیو اس کے بعد میرے پاس نہیں آیا تھا۔
آخر دوران سفر میں نے اسی افسر اعلیٰ سے پوچھ لیا۔
''اونیو اسی جہاز سے سفر کر رہا ہے؟''
''نہیں میڈم! اونیو تو وہیں رک گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ آپ کے حکم کے مطابق وہیں کچھ کام کرے گا۔
تاکہ آپ اس مہم کی رپورٹ تیار کر سکیں۔''
''کیا؟'' میری حیرت بھری چیخ نکل گئی۔ ''تو کیا؟''
''جی بتایئے۔''
''وہ حکومت شائریکا کا ایجنٹ نہیں تھا۔''
''بالکل نہیں۔''
''اوہ تو لائی چن حکومت نے......''

لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں تھی اس عمل کے سامنے جب وہ میرے فائر ناکام بنا رہا تھا۔ میں نے پورے ہوش وحواس اور پوری مہارت سے اس پر گولیاں چلائی تھیں۔ پورا پستول اس پر خالی کر دیا تھا لیکن ایک بھی گولی اسے نہیں لگی تھی۔ وہ اچھل اچھل کر میرے نشانے خالی کر رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ پھر دوسری بات ڈاکٹرز کے مشکوک جملے۔ ''ادھر سے کوئی نہیں آیا؟'' یہ جملہ ناقابل فہم تھا۔ ''کدھر سے؟''

تھوڑی دیر کے بعد اس چھوٹے سے کونسل میں جنبش ہوئی۔ انجن ردم سے مشینی عمل کر کے جہاز کے لنگر اٹھائے جا رہے تھے اور وہ جنبش کر رہا تھا۔

میں تو ایک طرح سے مختل ہوگئی تھی۔ اس وقت حقیقی معنوں میں ساری کمان اونیو کے ہاتھ میں تھی۔ اونیو، ایک ماورائی انسان، اف میرے خدا، میں تو خود کو دنیا کا سب سے بڑا اور ماہر نشانہ باز سمجھتی تھی لیکن میں نے اس پر تاک تاک کر نشانے لگائے تھے اور اس نے رقص کر کے ہر نشانہ ناکام بنا دیا تھا۔

کونسل اب باقاعدگی سے آگے بڑھ رہا تھا اور میں نہیں جانتی تھی وہ کہاں جا رہا ہے۔ میں پریسلا اور اس کے بیٹے کے ساتھ تھی اور بڑی شرمندگی محسوس کر رہی تھی کہ اگر پریسلا مجھ سے اور سوالات کر بیٹھے اس بارے میں تو میں کیا جواب دوں گی۔

لیکن شکر ہے اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

چھوٹے کونسل کا سفر کوئی پینتالیس منٹ جاری رہا۔ پھر اس کی رفتار سست پڑ گئی اور آخر میں وہ رک گیا۔ اس کے انجن بند ہو گئے۔ خاموشی چھا گئی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور آگے کیا ہونے والا ہے۔ کچھ ہی دیر کے بعد باہر سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہمارے پاس آنے والے کئی افراد تھے۔ جن میں دو لائی چن کے باشندے صاف نظر آتے تھے۔ دو شارئیکن تھے ایک اونیو تھا اور دوسرا ڈاکٹر ہیمر۔ جواب پوری طرح چاق وچوبند نظر آ رہا تھا۔

دونوں شارئیکن بڑے تپاک سے ڈاکٹر ہیمر سے ملے اور انہوں نے اپنا تعارف شارئیکا کے محکمہ خاص کے افسران کی حیثیت سے کرایا۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

''حکومت شارئیکا کی طرف سے ہم آپ کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں مس اینی پارک کہ آپ نے ہمارے ایک قیمتی سرمائے کو ہمیں واپس کیا۔ درحقیقت آپ نے کوئی معمولی کام نہیں کیا۔ دنیا بھر میں ایسی بے شمار تنظیمیں کام کر رہی ہیں جو سازشی عناصر کے سرمائے پر انحصار کر کے ساری دنیا کے امن کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ ایسی ہی ایک تنظیم نے شارئیکا سے ڈاکٹر ہیمر کو اغواء کر کے یہ تاثر دیا کہ انہیں لائی چن نے اغوا کیا ہے جب کہ حکومت لائی چن اس سے بالکل بے خبر تھی۔ الغرض شارئیکا نے زرد لومڑی طلب کی اور زرد لومڑی نے ہمارا سرمایہ ہمیں واپس کر دیا۔ افسر نے متحیر لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر ہیمر حیرانی سے یہ سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''کیا کہا آپ نے مسٹر وان ہوپ ''زرد لومڑی''۔

''ہاں دنیا کے لیے ایک عظیم سرمایہ، دنیا کا سب سے حیرت انگیز ادارہ جس کا سربراہ کارل ڈی سا ترے ہے جس نے دنیا کے امن کو خطرے سے بچانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔''

''میں نہیں سمجھا۔'' ہیمر نے کہا۔

''ابھی ہم لوگ ایک بڑی اسٹیمر سے چلیں گے کھلے سمندر میں شارئیکا کا بحری بیڑہ کھڑا ہوا ہے جس کا

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حنا ءڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

''نہیں میڈم! آپ شاید مذاق کر رہی ہیں۔''
''کیوں؟''
''اس کا کہنا تھا کہ وہ آپ کا اسسٹنٹ ہے۔'' افسر نے کہا اور میرے بدن میں سناٹا دوڑ گیا۔ میں نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن میرا ذہن بری طرح الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ افسر نے کہا۔ ''اور ہاں۔ وہ ایک پیکٹ آپ کے لیے دے گئے تھے۔''
''پیکٹ!''
''جی، میں ابھی بھجواتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک خوب صورت پیکٹ میرے پاس پہنچا دیا گیا اور پھر میں نے بے چینی سے اسے کھول کر دیکھا۔ پھر میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس نامعلوم میٹریل کی میک اپ ماسک تھی جو میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ میرے ذہن میں فوراً ایک نام گونجا۔
''الہ دین۔'' وہ ایشیائی چھلاوہ جس نے میری زندگی بھر کی محنت کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ میں جو خود کو ناقابل تسخیر سمجھتی تھی۔ میں جو خود کو دنیا کی سب سے ذہین، سب سے چالاک ایجنٹ سمجھتی تھی لیکن اس شخص نے مجھے نچا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے اپنے ہر مشن میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے ایسے ایسے خطرناک مواقع پر میری مدد کی تھی جب میں بے بسی کا شکار ہو گئی تھی۔
اس مہم میں بھی یہی ہوا تھا۔ جونہی میں نے ہانگ کانگ میں قدم رکھا تھا وہ ایک مکروہ شکل میں میرے سامنے آیا تھا۔ اوہ مائی گاڈ: یوں لگتا تھا جیسے وہ میرا سایہ ہے۔ میرا ہمزاد ہو۔ اب بھی اگر غور کرتی تو میری اس کامیابی میں اس کا بہت بڑا ہاتھ تھا اور پھر اس کا گولیوں سے بچنے کا فن۔ الہ دین...... الہ دین۔ کس قدر ستم ظریف ہے کمینہ۔ میں نے اس کے اس منحوس میک اپ سے کس قدر نفرت کی تھی اور اس کے یہ دو خرگوش جیسے دانت مجھے زہر لگتے تھے لیکن یہ سب کچھ نقلی تھا۔ اس کا اصل چہرہ کچھ اور تھا۔ نہ جانے کیسا ہوگا۔
غرض یہ کہ ادینو، الہ دین یا وہ جو کوئی بھی ہے برسوں کی گہرائیوں کا سفر کر رہا تھا۔ وہ میرے دل میں ایک خواہش بن چکا تھا۔ کاش میں اس کا اصل چہرہ دیکھ سکوں۔ کیسا ہوگا۔ اس کا جسم بے حد خوب صورت ورزشی اور سڈول تھا۔ میری پسند کے عین مطابق۔
شاریکا تک کے سفر کے دوران وہ میرے خیالوں میں بسا رہا۔ میرا ذہن چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ الہ دین ہی تھا اور الہ دین بھی بس ایک سامنے آ جانے والا نام تھا۔ نہ جانے کون ہے۔ اصل نام کیا ہے لیکن کمال کی شخصیت تھی۔ اوہ مائی گاڈ۔ اتنا پھرتیلا تو کوئی جانور بھی نہیں ہوتا۔

☆......☆

شاریکا کے دارالحکومت میں ہمارا بہترین استقبال کیا گیا تھا۔ ایک شاندار فوجی میٹنگ میں جس میں اہم ترین سویلین حکام بھی شامل ہوئے تھے۔ ڈاکٹر میمر کے ساتھ مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا اور مجھے بڑا اعزاز دیا گیا تھا۔
میں اس میٹنگ میں اپنی اصلی شکل میں شریک ہوئی تھی اور مجھے وہ کردار بھی ملے تھے جو کورڈیل کیس میں مجھ سے متعلق رہے تھے۔
''یوں لگتا ہے جیسے مسز سارترے نے ایک روبوٹ لڑکی بنائی ہو جو دنیا بھر کے کام کر سکتی ہے۔''
ایک اعلیٰ شخصیت نے کہا۔
''مسز سارترے کو اس کی سخت حفاظت کی ضرورت ہے کیونکہ یہ نہ جانے کس کس کے لیے خطرہ ہے اور

''ایں!'' ہم دونوں چونک کر انکل کو دیکھنے لگے۔

''تم نے گولیوں سے بچنے کے آرٹ کے بارے میں پوچھا تھا کہ کیا ایسا ممکن ہے؟''

''ہاں تو پھر؟''

''اسی کا جواب دے رہا ہوں۔''

''کیا؟''

''تم نے سرکس میں کام کرنے والے جمناسٹروں کی جادوگری نہیں دیکھی۔''

''بہت سے سرکس دیکھے ہیں لیکن یہ فن کبھی نہیں دیکھا۔ نشانہ بازوں کے کمالات تو دیکھے ہیں لیکن نشانہ بازی سے بچنے کا یہ فن کبھی نہیں دیکھا۔''

''بے بی کیا وہ شخص کافی دراز قامت ہے۔ میرا مطلب ہے ضرورت سے زیادہ لمبا اور دبلا پتلا؟''

''نہیں انکل۔ وہ خوب صورت ورزشی بدن کا مالک ہے۔''

''کیا اس کے لہجے میں کوئی تبدیلی ہے؟''

''وہ اردو بھی بولتا ہے سو فیصدی ایشیائیوں کے انداز میں۔''

''تب وہ عمران ہے۔''

''کون عمران؟''

''ایک ایشیائی ملک کا باشندہ، انتہائی حیرت انگیز شخصیت کا مالک۔ میں نے رات بھر اس کی تلاش میں محنت کی ہے۔''

''انکل تفصیل بتایئے پلیز۔'' میرے سارے چہرے کا خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ اس کے بارے میں انکشاف میرے لیے انتہائی پرکشش تھا۔

''وہ ایشیائی حیرت انگیز صفات کا مالک ہے۔ فی الحال اس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ میں صرف عمران کے بارے میں بتاتا ہوں۔''

''جی انکل۔''

''محکمہ سراغرسانی کے ڈائریکٹر جنرل علی رحمٰن کا بیٹا ہے۔ آکسفورڈ سے ڈائریکٹریٹ کی ہے پھر اپنے ملک واپس آ گیا۔ اس کے بارے میں خفیہ رپورٹ ہے کہ اس نے براہ راست محکمہ داخلہ کی وساطت سے ہوم سیکرٹ سروس کے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ حاصل کیا ہے اور ایک دوسری حیثیت سے اسے سنبھالے ہوئے ہے۔''

''دوسری حیثیت؟''

''ہاں، سیکرٹ سروس کے چیف کی حیثیت سے۔ جس کا اسپیشل کوڈ ''ایکس ٹو'' ہے۔ دنیا بھر کی خفیہ ایجنسیاں اسے ایکس ٹو کے نام سے جانتی ہیں لیکن کہیں بھی حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکا کہ عمران ہی ایکس ٹو ہے۔''

''ارے کیوں؟''

''اس نے ایسا ہی جال پھیلا رکھا ہے۔ اس کی خصوصی نشانی یہ ہے کہ وہ خود کو کبھی ذہین اور اس عہدے کا حامل نہیں ظاہر کرتا۔ اس کی فطرت میں خودنمائی نہیں ہے۔ اس کے شناسا یا اس سے شناسائی کے خواہش مند آخر میں یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ تو کسی دفتر میں معمولی کلرک کے قابل بھی نہیں ہے۔''

''لیکن کیوں انکل؟'' میرے دل و دماغ میں عمران اتر رہا تھا۔ عمران، الہ دین اور نہ جانے کیا کیا۔

کون اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔''
''وہ اپنا تحفظ کرنا جانتی ہے۔''
میرے بارے میں طرح طرح کے کمنٹس ہوتے رہے۔ اس میٹنگ میں میری بات پاپا سے کروائی گئی۔
''ہیلو پاپا۔'' میں نے کہا۔
''اس بار پورے کیس کے درمیان تم سے بات نہیں ہوئی۔''
''ضرورت ہی نہیں پیش آئی پاپا۔''
''او کے! واپس آؤ۔ میں تم سے ملنے کے لیے بے چین ہوں۔''
میری واپسی کے انتظامات ہو گئے۔ خاص طور سے ڈاکٹر ہیمر نے کہا۔'' پیاری بچی، مجھے نئی زندگی دینے والی تم ہو، کبھی میری ضرورت پیش آئے تو مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو۔''

☆......☆

بہت سی ستائش اور دل میں خلش لے کر میں اپنے وطن واپس پہنچ گئی۔ جہاں پاپا میرے منتظر تھے۔ میرے پاپا، میرے سب کچھ۔ انکل وانچی بھی میرے لیے باپ سے کم نہیں تھے۔ میں دونوں کی محبت سے سرشار تھی۔ مجھے آرام کی چنداں ضرورت نہیں تھی لیکن مجھے چوبیس گھنٹے آرام کی ہدایت کی گئی اور میں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ پھر مجھے ریکارڈ ہال میں طلب کر لیا گیا جہاں اس کیس میں میری یادداشتوں کو محفوظ کیا جانا تھا۔
اور میں نے شروع سے لے کر آخر تک تفصیل بتا دی۔ میں نے خصوصی طور پر اوینو کی انٹری کی تفصیل بتائی اور پھر اس کی دی ہوئی سوغات نکال کر سامنے رکھ دی۔
''یہ کیا ہے؟ ارے یہ تو میک اپ ماسک ہے اوہو بالکل پہلے جیسا جس کا کوئی کیمیاوی تجزیہ نہیں ہو سکا کہ اس کی تیاری میں کیا میٹریل استعمال کیا گیا ہے مگر ترموداوانچی نے ان بارے میں کچھ ذاتی معلومات کا اظہار کیا ہے۔''
''کیا انکل؟''
''میں نے کافی کاوش کی ہے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس ماسک کی تیاری میں کیا کیمیکل استعمال کیا گیا ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ معمولی سی کوشش سے اس کے خدوخال تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔''
''اوہ انکل! مجھے اس کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔
''کسی طرح اس شخص کے بارے میں کچھ اور معلوم ہو سکے۔'' وانچی نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔
''اب میں ایک ایسی بات بتانا چاہتی ہوں جو آپ کو حیران کر دے گی۔''
''اوہو۔ اور بھی کوئی حیران کن بات ہے؟''
''جی انکل۔'' اور پھر میں نے انہیں ان لمحوں کی کہانی سنائی جب صرف بارہ فٹ کے فاصلے سے ہونے والی گولیوں کی برسات کو ایک پھرتیلے شخص نے پٹاخوں کا کھیل بنا دیا تھا۔ پاپا نے بھی بڑی حیرانی سے اس بارے میں سنا تھا لیکن نہ جانے کیوں انکل ترموداوانچی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔
''کمال ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے۔'' پاپا نے حیرانی سے کہا۔ لیکن انکل نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ البتہ دوسرے دن ناشتے کی میز پر انہوں نے کہا۔
''ہاں ممکن ہے۔''

سے بچ گیا۔ میں نے ابھی تم سے کہا تھا نا کہ خود کو سراہے جانے کی خواہش ہر دل میں ہوتی ہے۔ سنگ بھی اس کا شکار ہو گیا اور اس نے نوجوان سے کہا کہ وہ اس پر دوبارہ فائر کرے۔ نوجوان اسے چڑھاتا رہا اور سنگ نے کئی بار اپنے اس فن کا مظاہرہ کیا۔ جانتی ہو اس کے بعد کیا ہوا؟'' ترمووا وانچی نے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''نوجوان نے لاپروائی سے کہا کہ یہ تو معمولی سا کھیل ہے جو کوئی بھی کھیل سکتا ہے۔ سنگ کو اپنے اس آرٹ پر ناز تھا۔ وہ اس کی توہین برداشت نہیں کر سکا اور اس نے غصے کے عالم میں پستول نکال کر سارا پستول عمران پر خالی کر دیا۔ عمران نے اسی کے انداز میں اچھل کود کر کے سارے نشانے خالی کر دیے۔ سنگ نے بھی پوری مہارت سے اس پر کئی بار فائر کیے لیکن عمران اس سے بھی زیادہ شاندار پرفارمنس کا مظاہرہ کرتا رہا۔

سنگ نے ایک مضمون میں اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ نہیں کہہ سکتا کہ کون چچا ہے کون بھتیجا۔ مجھے اس طرح سنگ اور عمران یاد آ گئے۔''

میں دنگ رہ گئی۔

مجھ جیسی لڑکی جس کے ذہن میں خود سے برتر کوئی نہیں تھا جس نے اب تک بڑی بے دردی سے انسانی گھاس کاٹی تھی، جس کے دل میں عشق و محبت کا گداز نام کو نہیں تھا عمران کے خوابوں میں کھو گئی۔

☆......☆

آرام کے دن میرے مزاج سے میل نہیں کھاتے تھے۔ میں تو متحرک رہنے ہی کو زندگی قرار دیتی تھی۔ دل پھینک نوجوانوں کی تڑپ دیکھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ میرا خوب صورت بدن اور خوب صورت چہرہ بہت سے ہنگاموں کا محرک تھا اور کبھی کبھی میں یہ کھیل بھی کھیلی نہیں تھی۔ نوجوان مجھ پر ریجھ کر اپنی جیسی کوششیں کرتے اور میں انہیں کسی ویرانے میں لے جا کر ان کی سکائی کر دیتی تھی اس طرح ہاتھ پیروں کی تھوڑی سی ورزش بھی ہو جاتی تھی۔

لیکن ان دنوں میری راتیں بے خواب ہو گئی تھیں۔ مجھ پر ایک آسیب کا سایہ ہو گیا تھا جس کا نام عمران تھا۔ جس کا نام اور بھی بہت کچھ تھا لیکن میں اسے دوسرے انداز میں سوچتی تھی۔ نہ جانے کیا کیا۔ تین دن کے بعد انکل وانچی نے کچھ اور انکشافات کیے۔

انکل وانچی بھی کمال کی شخصیت ہیں جس چیز کے پیچھے پڑ جائیں کر کے چھوڑتے ہیں انہوں نے بڑے خوشگوار موڈ میں کہا۔

''کورڈیل کی کالی بھیڑوں کی صفائی کے دوران وہ گارڈ جس نے تمہاری مدد کی تھی......''

انکل وانچی کے اس آغاز پر میں چونکی۔ میرے کسی سوال سے پہلے انکل نے میرے الگ کیس کا حوالہ دیا۔ پھر بولے۔ ''اور آخر میں نہیں بلکہ تازہ ترین میر لیونسکی سازش کیس میں او نیو میں خصوصاً او نیو کا نام لے رہا ہوں کیونکہ اس وقت ہماری الجھن وہی ہے۔''

میری پوری توجہ انکل کی طرف تھی وہ بولے۔ ''وہ شخص ان تینوں کیسز میں تمہارے آس پاس رہا۔ اب میں تمہیں کچھ اور باتیں بتا رہا ہوں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامی تبدیلیوں پر غور کیا گیا اور بہت سے عوامل سامنے آئے لیکن دنیا دوسری جنگ عظیم سے نہ بچ سکی اور دوسری جنگ عظیم بے شمار غم انگیز اور بھیانک یادیں چھوڑ گئی۔ اقوام متحدہ کا وجود بھی فعال نہیں رہا اور بین الاقوامی مسائل میں وہ صرف لکڑی کا گھوڑا ثابت ہوئی۔ دنیا اس لیے گریز نہیں کر سکی اور وہ پوری آب و تاب کے ساتھ قائم

''یہ ایک اہم نکتہ ہے بے بی۔'' تر موداوانجی نے کہا۔

''کیا انکل؟''

''عام طور سے انسان جو نہیں بھی ہوتا وہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خود کو بڑا کہلوانے کے لیے نہ جانے کیا کیا جتن کرتا ہے۔ یہ ایک فطری خواہش ہوتی ہے اور تم یہ کہہ سکتی ہو کہ شاید ہر شخص میں ہوتی ہے۔ یعنی اگر تم نے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے تو تمہاری خواہش ہوتی ہے کہ دنیا اسے جانے۔ اس کو جانتے ہوئے تمہارا احترام کرے۔ تمہیں برتری دے لیکن اگر کہیں تم اپنی اس فطرت کو پچھاڑ دو اپنے آپ کو اپنے منصب سے کم ظاہر کرنے کی کوشش کرو تو سائنسی اصطلاح میں اور سائیکالوجی میں اسے Ency کہا جاتا ہے اور اس طرح کے لوگ دنیا کے خطرناک ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ساری دنیا میں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ ان کی زندگی میں کبھی ان کی یہ صفت ظاہر نہیں ہوسکی بس ان کی موت کے بعد ان کی زندگی کا تجزیہ کیا گیا تب وہ ظاہر ہوئے۔

''او مائی گاڈ۔ لیکن عمران......!''

''ہاں تو اس کے بارے میں کئی بار یہ شبہ کیا گیا کہ وہ سیکرٹ سروس کا پراسرار چیف ایکس ٹو ہے لیکن لاکھ کوشش کے باوجود کوئی یہ ثابت نہیں کرسکا۔''

''کیوں انکل؟''

''بس وہ جینئس ہے، خود کو چھپانا جانتا ہے۔''

''کمال ہے۔ لیکن ایک بات بتائیں۔''

''ہوں۔''

''کل جب میں ان کے گولیوں سے بچنے والے فن کا تذکرہ کررہی تھی تو آپ نے مجھ سے کچھ سوالات کیے تھے۔ آپ نے کہا تھا کہ کیا وہ زیادہ دراز قامت اور دبلے پتلے بدن کا مالک ہے۔ کیا وہ صحیح انداز میں اردو نہیں بولتا۔'' میں نے یاد دلایا۔

''ہاں میں اسی طرف آرہا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے سے یا لمبے فاصلے سے چلائی گئی گولیوں سے بچنے کا فن ''سنگ میں'' سے منسوب ہے۔''

''سنگ میں کون؟''

''چین کے قصبے وانگ ہو کے ایک کسان کا بیٹا۔ وہ بچپن ہی سے غیر معمولی تھا۔ چینی عام طور پر پستہ قامت ہوتے ہیں لیکن سنگ میں کافی دراز قامت تھا اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ دوغلا چینی تھا یعنی اس کی ماں منگول تھی اور باپ چینی۔ سنگ میں، بچپن ہی سے سرکش اور کسی حد تک مجرمانہ فطرت کا مالک تھا۔ وہ باپ کے ساتھ نہ رہ سکا اور بھٹکنے لگا۔ پھر وہ ایک سرکس میں نمودار ہوا جس میں وہ ایک ناقابل یقین فن کا مظاہرہ کرتا تھا۔ دس دس افراد چھریوں سے اس پر نشانہ لگاتے تھے اور وہ ان سے بیک وقت پھینکی جانے والی چھریوں سے بچتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ چھریاں پستول سے چلائی گئی گولیوں میں بدل گئیں اور اس کے اس فن کو ''سنگ آرٹ'' کا نام دیا گیا۔

پھر بہت سے جانبازوں نے اس فن کی مشق کرنے کی کوشش کی اور آرام سے جاں بحق ہوگئے۔ ادھر کچھ بین الاقوامی گروہ، سنگ کے شیدائی ہوگئے یوں سنگ میں ایک خوفناک مجرم بن گیا۔ اس کی ٹکر کا ایک بھی دوسرا شخص سامنے نہ آسکا لیکن پھر ایک بار عمران نامی ایک نوجوان نے اسے گولیوں کا نشانہ بنایا اور سنگ نے اپنے آرٹ کا مظاہرہ کیا۔ نوجوان نے سنگ کو بھڑکایا اور کہا کہ یہ صرف اتفاق ہے کہ سنگ گولیوں

ایک تصویر، ایک کہانی

ہم سا ہو تو سامنے آئے......



سرا قیصو!

ہمیشہ ہم نے یہی سنا ہے کہ ہم بہت جوشیلے اور ہنر تیلے ہیں...... ملک کوئی بھی ہو قانون کوئی بھی ہو مگر ہمارا اپنا ہی قانون ہوتا ہے۔

زیر نظر تصویر دیکھ کر یہ نا سمجھیے گا کہ یہ پاکستان ہے...... اسٹول پر بیٹھا ہوا شخص یقیناً پاکستانی ہے۔

یہ ہمارا پاکستان نہیں ہے...... یہ کوئی بہت مہذب اور جدید ملک ہے...... حضرت انسان تو اپنی نچلا نہ بیٹھنے والی فطرت سے مجبور ہے اور کہیں بھی اپنے جوہر عیاں کر سکتا ہے۔

یہ کوئی امریکن...... جاپانیز...... جرمن...... کورین...... برٹش...... جو اس بہادر آدمی کی طرح یوں آرام اور سکون سے ایسے بیٹھ سکتا ہے۔ اس شخص کو دیکھ کر بس ایک ہی بات ذہن میں آتی ہے۔

ہم سا ہو تو سامنے آئے

ہے لیکن اسے صرف لنگڑا گھوڑا سمجھا جاتا ہے اور کسی بھی ملک کو اس پر اعتماد نہیں ہے۔
اس سلسلے میں سیاستدانوں نے بہت کچھ کیا لیکن پھر بین الاقوامی سرمایہ داروں نے سر جوڑ کر غور کیا اور کورڈیل وجود میں آئی۔ لیکن کورڈیل یہودی لابی کے لیے ناپسندیدہ ثابت ہوئی کیونکہ اس طرح بین الاقوامی تجارت جس میں وہ ایک کے چار نہیں ایک کے دس، بلکہ بیس بنا رہے تھے متاثر ہوئی اور انہیں مہنگائی کو آسمان تک پہنچانے کی کوششوں میں رکاوٹ کا احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے ملکوں کے ذمے دار خرید کر انہیں کورڈیل میں داخل کر دیا اور اس ادارے میں بھی ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں۔
چنانچہ یہ شعبہ بھی کافی حد تک فیل ہوگیا۔ دنیا بھر میں امن کے دشمن جو جنگیں کرا کے اپنے حق میں ہیں بلینوں ڈالر خرچ کر کے بین الاقوامی امن تباہ کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے لاتعداد سازشی ادارے کام کر رہے ہیں اور دنیا کے امن چین، جنگی ہتھیاروں کی تیاری اور مہنگائی کے فروغ کے لیے نت نئے منصوبے تیار کرتے رہتے ہیں۔ ان کی بھرپور کوشش ہے کہ دنیا میں امن نہ ہو اور ان کا کام جاری رہے چاہے دنیا تیسری جنگ کی لپیٹ میں کیوں نہ آ جائے۔
اس صورت حال کو محسوس کر کے دوسرے اہم لوگوں نے اپنے فرض کی ادائیگی کا آغاز کیا۔ یہ بہت بڑے بڑے سائنسدان اور فوجی سربراہ ہیں اور انہوں نے ساری پابندیوں سے ہٹ کر اپنے طور پر ایک ادارہ بنایا جسے انہوں نے ''پی فورس'' کا نام دیا۔ پی فورس کا کام یہ ہے کہ وہ ان سازشوں کو ناکام بنائیں جو بین الاقوامی امن کے لیے تباہ کن ہیں۔
اس بارے میں بڑی چھان بین کے بعد پی فورس کے عہدیداران کا انتخاب کیا گیا اور تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ اس فورس کا سربراہ ایکس ٹو ہے جسے اس کی کارکردگی کی بنا پر اس فورس کا جس میں اس وقت تیرہ ممالک کے نمائندے شامل ہیں، بنایا گیا ہے۔
چنانچہ مائی ڈیئر! اینی پارک وہ شخص جیسا کہ تم نے بتایا کورڈیل کیس میں تمہاری مدد اس کے فرائض میں شامل تھی وہ بھی ان کالی بھیڑوں کو منظر عام پر لا کر ان کی پول کھولنا چاہتا تھا۔ یہی کیفیت ہیرلیونسکی کیس کی ہے۔ جرائم پیشہ تنظیم ہیرلیونسکی کو اغوا کر کے لائی چن لے گئی اور شو کیا کہ ہر کاروائی لائی چن کی ہے تاکہ لائی چن اور شاریکا کے درمیان بدترین چپقلش پیدا ہو جائے۔ انہوں نے اس کے بیوی بچے کو بھی اغواء کر کے ان کی جگہ نقلی بیوی اور بچہ فروکش کر دیا۔
اگر وہ ایکس ٹو ہی ہے جس نے اس کیس میں بھی تمہاری مدد کی ہے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پی فورس نے ہیرلیونسکی کے اغواء کا فوری نوٹس لیا اور وہ تم سے پہلے ہانگ کانگ پہنچ گیا۔''
نہ جانے کیوں میرے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ عمران، گارڈ، اونیو، یا کوئی بھی وہ یہ سب میرے لیے نہیں کرتا تھا بلکہ وہ صرف اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ صرف اپنی ڈیوٹی۔ تاہم میں نے کہا۔
''مجھے اس کے بارے میں مزید تفصیلات درکار ہیں انکل۔ کسی وقت میرا اس سے تصادم بھی ہوسکتا ہے اس لیے مجھے اس کے پورے کوائف معلوم ہونا ضروری ہیں۔''
''ٹھیک ہے۔'' انکل ترمود اوانچی نے کہا۔

(اینی پارک...... جاسوسی کی دنیا میں اب کیا تہلکہ مچائے گی۔
اُس کا اگلا شکار کون ہوگا؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)

کیوں کہ میں نے حلوہ تیار کر کے اندر بھجوانا ہے۔'' وہ مسکراتی ہوئی بولیں۔

''زینب یہ اندر لے جاؤ!'' انہوں نے حلوے کی پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں پلیٹ سے تھوڑا سا حلوہ کھانے لگی تھی کہ اپیا نے گرم گرم چمچ میرے ہاتھ پر مارا۔

''منع کیا ہے بابا جان نے کہ شاگرد سے پہلے اس میں سے کوئی نہ کھایا کرے!'' اپیا نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

''اپیا کیا ہوا اگر ایک لقمہ لے لیتی تو میرے مبارک ہاتھوں سے حلوہ اور بابرکت ہو جاتا، حلوے کو دیکھ کر میرے منہ پانی آ رہا تھا!'' میں نے چڑتے ہوئے جواب دیا۔ میں حلوہ لے کر اندر گئی ایک نظر چپکے سے عبدالرحمٰن پر ڈالی وہ باادب طریقے سے نظر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ بے حد حسین تھا۔ میں حلوہ دے کر آ گئی مگر پردے سے جھانک کر ان کی باتیں سننے لگی، بابا جان نے تلاوت شروع کی۔

''ارے یہ کیا؟'' مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ بابا جان تو ہمیشہ سورۃ مدثر یا مزمل کی تلاوت کرتے تھے مگر آج وہ سورۃ جن کی تلاوت کر رہے تھے۔ تلاوت مکمل ہوئی تو وہ اسے نصیحتیں کرنے لگے۔

''عبدالرحمٰن زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولو گے۔ شیطان کے مکروفریب سے بچو گے اور یاد رکھنا میں کسی قسم کی سرکشی برداشت نہیں کروں گا!'' بابا جان سنجیدگی سے بولے۔

''میں پوری کوشش کروں گا!'' وہ سعادت مندی سے بولا۔ بابا جان نے اس کو اپنے ہاتھ سے حلوہ کھلایا اور پلیٹ اسے تھما دی۔





عشق زادہ

حنا بشریٰ

اس جن کا قصہ جو ایک آدم زادی سے عشق کا مرتکب ہو گیا تھا

آج اپیا بہت عرصے بعد پرسکون نیند سوئی تھیں۔ کتنی تکلیف دہ آزمائش سے ان کو گزرنا پڑا تھا۔ آزمائش تو نظام کائنات کا دستور ہے۔ جو انسان بھی اس دنیا میں آیا ہے اس کو آزمائش کی بھٹی سے گزرنا ہی ہے۔ ویسے بھی قرآن کریم میں واضح انداز میں فرمایا گیا ہے کہ ''میں تمہیں جان، مال، رزق اور خوف سے آزماؤں گا۔'' اور صرف صابرین کو کامیابی کی بشارت دی گئی ہے۔ آج اپیا کی تکلیف کا جہاں انجام ہوا وہاں عبدالرحمٰن کی تکلیف کا آغاز ہو گیا۔

ہمارے بابا جان مولوی جلیل مسجد کے امام تھے۔ بہت سے علوم پر دسترس حاصل تھی۔ لوگ دور دراز سے اپنے بچوں کو تعلیم کیلئے ان کے پاس چھوڑ جایا کرتے تھے۔ کچھ طالبعلم دن رات بابا جان کے پاس ہی رہتے، یہ مسجد ہی ان کا مستقل ٹھکانہ ہوتی۔ حجرے سے کسی نوجوان کی آواز آ رہی تھی، میں نے مکمل رازداری سے پردے سے جھانکا 18 سالہ انتہائی خوش شکل نوجوان بابا جان کے قدموں کے پاس بیٹھا تھا۔

''مولوی صاحب مجھے اپنی شاگردی میں لے لیں۔ میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا!'' وہ انتہائی عاجزی سے بولا۔

''اپنے بڑوں سے اجازت لے کر آئے ہو؟'' بابا جان گہرے پرسوچ انداز میں بولے۔

''جی بالکل ان ہی کی اجازت سے آیا ہوں۔ ان ہی کا حکم ہے کہ آپ سے تعلیم حاصل کروں!'' وہ منت بھرے انداز میں بولا۔

''زینب حلوہ تیار کرواؤ نئے شاگرد کیلئے۔'' بابا جان نے حجرے سے آواز لگائی۔

اپیا حلوہ تیار کر رہی تھیں۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

''اپیا نیا شاگرد اس قدر خوبصورت ہے کہ کیا بتاؤں۔ اس کی آنکھیں اتنی سیاہ اور چمکدار ہیں کہ کوئی شخص زیادہ دیر تک اس کی طرف دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اتنا خوش شکل نوجوان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اپیا آپ اسے دیکھ لیں نا تو بے ہوش ہو کر جائیں!'' میں نے تفصیل سے انہیں ہر بات بتائی۔

''تم تو ہر شاگرد کے بارے میں ایسا ہی کہتی ہو اور میرا ابھی بے ہوش ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے

نہیں آتا تھا۔
''ارے یہاں تو کوئی بھی کام کرتا نظر نہیں آ رہا!'' اپیا نے میرے ساتھ کھڑکی میں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
دیکھا میں کہتی تھی نا کہ عبدالرحمٰن بھائی بہت عجیب و غریب انسان ہیں!'' میں فوراً بولی۔
عبدالرحمٰن کی شخصیت دن بدن عجیب تر ہوتی جا رہی تھی۔
عبدالرحمٰن کی ڈیوٹی بابا جان نے کھانا لانے کی لگائی تھی، دوپہر کو وہ ان کا کھانا لے کر جاتے تھے۔ اپیا ان سے مکمل پردہ کرتی تھیں۔
ایک دن اپیا عبدالرحمٰن کو کھانا پکڑا رہی تھیں کہ اس دوران درمیان میں لگی چق گر گئی اپیا بغیر حجاب کے تھیں عبدالرحمٰن کی ان پر نظر پڑی...... وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ اپیا بے حد حسین تھیں۔ عبدالرحمٰن بھی ان کے حسن بے مثال کی تاب نہ لا سکا۔ اپیا گھبرا کر واپس پلٹی مگر عبدالرحمٰن ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔
''عبدالرحمٰن! کیا ہو گیا ہے۔ بجائے کہ اٹھا کر چق لگاؤ تم بت بنے کھڑے ہو!'' اماں نے اسے جھڑکا۔
اس دن کے بعد عبدالرحمٰن گم صم رہنے لگا تھا۔ نا جانے کون سا غم اس کے دل کو چمٹ گیا تھا۔
☆......☆
آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے۔ میں بھی ضد کر کے اپیا کو ساتھ لیے چھت پر آ گئی ٹھنڈی ہوا دل و دماغ کو سکون دے رہی تھی۔ میری نظر مسجد کی چھت پر پڑی جہاں عبدالرحمٰن لڑکوں کے ساتھ کھڑا کام کروا رہا تھا۔ اس کی نظر بھی اچانک اپیا پر پڑی تو وہ دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو کر دیکھتا جا رہا تھا۔ میں نے چور نگاہوں سے اپیا کو دیکھا، وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھیں۔ میں اپیا سے باتیں کر رہی تھی کی اچانک تیز بگولہ ہماری طرف آیا۔ آنکھوں میں مٹی پڑنے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب طوفان تھما تو ہم دیکھنے کے قابل ہوئے تو عبدالرحمٰن ہمارے قریب کھڑا تھا۔
''ارے عبدالرحمٰن بھائی آپ؟'' میں انہیں اچانک قریب دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اپیا نے دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور رخ موڑ لیا عبدالرحمٰن صرف اپیا کی طرف متوجہ تھا۔
☆......☆
''شہر بانو! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں!'' وہ اپیا کی جانب دیکھتا جا رہا تھا۔ میں اس کی جرأت پر حیران رہ گئی۔
میں اور اپیا چراغ جلا رہے تھے۔ بہت سخت اندھیرا ہو رہا تھا یہ کام عبدالرحمٰن ہی کرتا تھا مگر آج مصروفیت کی بنا پر وہ آ نہ سکا تو میں اپیا کے ساتھ آ گئی اپیا چہرہ حجاب میں چھپائے چراغ روشن کر رہی تھیں۔ نا جانے کیسے وہاں عبدالرحمٰن بھی پہنچ گیا وہ ذرا فاصلے پر تھا جہاں کچھ اندھیرا سا تھا مگر میں باخبر تھی۔ اس کی محویت نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا کہ اپیا کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ اپیا پر سے نظر نہیں ہٹا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گویا ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اسی اثنا میں جانے کب ایک چراغ پر اپیا کا دوپٹہ گرا اور آگ لگ گئی۔ میری تو چیخ نکل گئی اپیا بھی سخت گھبرا گئیں۔ عبدالرحمٰن تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ بجھا دی۔ اپیا روئے جا رہی تھیں۔
''عبدالرحمٰن بھائی! آگ نے تو آپ کے ہاتھوں کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچایا!'' میں حیران ہوئی۔
''ارے آگ، آگ کو کیا نقصان پہنچائے گی!'' وہ یوں ہاتھ جھاڑ رہے تھے جیسے مٹی جھاڑ رہے ہوں۔
ان کی بات پر بابا جان کے چہرے پر شدید ناگواری آ گئی۔ ابھی تو وہ تشکر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اب انہیں گھورنے لگے۔ عبدالرحمٰن نے فوراً بھاگ کر ان کے پیر پکڑ لیے۔
''مولوی صاحب! معاف کر دیں غلطی سے منہ سے نکل گیا تھا!'' عبدالرحمٰن پشیمانی سے بولا۔
''کہا تھا نا کہ ہر دنیا کے اپنے اصول ہوتے ہیں مگر تم بھولتے جا رہے ہو۔ آئندہ غلطی ہوئی تو تمہیں تمہاری دنیا کی طرف روانہ کر دوں گا!'' بابا جان غصے

"پھپھو نہ ہو تو ذرا سا بھی نہیں بچایا!" میں نے امی اپیا کے سامنے بھڑاس نکالی۔

"اوہو کیوں بے چارے کے نوالے گن رہی ہو۔ پتا نہیں کتنی دور سے آیا ہوگا اور کتنا بھوکا ہوگا!" امی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

☆......☆

"بابا جان ایک بات پوچھوں!" بابا جان آئے تو میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"ہاں پوچھو!" بابا جان بیٹھتے ہوئے بولے۔

"بابا جان! جب بھی نیا شاگرد آتا ہے آپ سورۃ مزمل یا سورۃ مدثر کی تلاوت کرتے ہیں مگر آج آپ نے سورۃ جن کی تلاوت کیوں کی؟" میں تجسس سے بولی۔

"بہت بدتمیز ہو تم خبردار آئندہ کبھی یوں اندر جھانکا!" بابا جان اچھے خاصے غصے میں آگئے۔

مگر میں نے ہمیشہ کی طرح ان کے غصے کی کوئی پرواہ نہ کی۔ کیونکہ مجھے اصل بے چینی تو اپنے سوال کی تھی جس کا جواب نہ ملنے پر میں اور بے چین ہو گئی۔

☆......☆

عبدالرحمٰن بہت ہی تابعدار شاگرد تھا۔ ہر کام بہت پھرتی سے کرتا۔ مسجد میں پانی بھرتا، نماز کے لیے صفیں بچھاتا، اکثر جماعت کرواتا، بابا جان کی طبیعت ناساز ہوتی تو صبح سویرے اذان دیتا۔ اس کی آواز بے حد خوبصورت تھی۔ بابا جان کو اپنے ہاتھوں سے جوتے پہناتا۔

ایک مرتبہ بابا جان سخت بیمار ہو گئے، کسی دوا سے افاقہ نہ ہو رہا تھا، اور اس پر یہ مصیبت کہ عبدالرحمٰن بتائے بغیر نا جانے کہاں غائب تھا۔

"اپیا ویسے بہت ہی خود غرض اور مطلبی ہیں عبدالرحمٰن بھائی۔ بابا جان اتنے بیمار ہیں اور وہ غائب ہیں!" میں نے اندر کا زہر اگلا۔

"بھئی بے چارے کو کوئی مجبوری ہوگی!" اپیا نے اس کی حمایت کی۔

پھر اچانک ہی عبدالرحمٰن پھر سے واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں جڑی بوٹیاں تھیں۔

"مولوی صاحب! امی کی ہنڈیا جلے گی!" وہ بولا۔

"زینب بھائی کو ہنڈیا لا کر دو!" بابا جان نقاہت سے بولا۔ میں نے ہنڈیا لا کر دی۔ پھر اس نے ماچس مانگی میں بھاگی بھاگی لے کر آئی مگر توازن قائم نہ رہا اور میں گر پڑی اور ماچس بھی جا کر پانی میں گر گئی۔

"اوہ! اب کیا ہوگا اور تو کوئی ماچس نہیں ہے!" میں گھبراتے ہوئے بولی۔

"اچھا تم جاؤ میں کچھ کرتا ہوں!" عبدالرحمٰن معروف انداز میں بولا۔ میں چلی تو گئی مگر حسب عادت چپکے سے جھانکنے لگی پھر جو منظر میری آنکھوں نے دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ عبدالرحمٰن نے اطمینان سے لکڑیوں پر ہاتھ رکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ چند لمحوں بعد ہی آگ بھڑک اٹھی میرا دل خوف سے کانپ اٹھا عبدالرحمٰن یوں کھڑا تھا جیسے یہ کوئی معمولی بات ہو۔ بابا جان کو دوا تیار کر کے دی گئی وہ یوں تندرست ہو گئے جیسے کبھی بیمار ہی نہ تھے۔

اپیا کو تمام واقعہ بتایا تو وہ فوراً چڑ گئیں۔

"زینب کیا بات ہے تم ہر وقت اسی پر کیوں غور کرتی ہو۔ بابا جان کو خبر ہوئی تو سخت خفا ہوں گے۔" اپیا تو سو گئیں مگر میں عبدالرحمٰن کی عجیب و غریب شخصیت پر غور کرتی رہی۔

☆......☆

اب وہ رفتہ رفتہ بابا جان کے منظور نظر شاگرد بن گئے۔ بابا جان ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ علاقے کے کچھ مالدار لوگ مسجد کے لیے کنواں کھدوانا چاہتے تھے مگر کام نہیں ہو پا رہا تھا۔ بہت سے مزدور لگے تھے مگر نا جانے کیا مسئلہ تھا بابا جان کہتے۔

"اگر عبدالرحمٰن ہوتا تو کبھی اتنی دیر نہ ہوتی!"

"اتنے لوگ مل کر کچھ نہ کر سکے تو دیا سلائی کیا کرے گی!" میں نے عبدالرحمٰن کا مذاق اڑایا۔

کافی دنوں بعد عبدالرحمٰن واپس آیا تو بابا جان نے درپیش مسئلہ بیان کیا۔ عبدالرحمٰن نے فوراً کام شروع کروا دیا۔ مگر کھدائی کے دوران کوئی بھی نظر

گئی۔کون تھا وہ عبدالرحمٰن یا کوئی اور......!

اپیا کمرے میں آئیں، پھول ابھی بھی بالوں میں لگے تھے۔ان کا چہرہ چاند کی طرح روشن تھا۔میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا کہ سب کو اٹھا دوں اور یہ ماجرا کہہ ڈالوں۔

☆......☆

صبح عبدالرحمٰن خلاف معمول بہت خوش تھا۔مجھے اس کی خوشی کھٹک رہی تھی۔

''بھائی بہت خوش ہیں کوئی بڑی خوشی مل گئی ہے؟''میں کڑواپن چھپا کر بولی۔

''ہاں کچھ ایسا ہی ہے!''میں نے اسے کریدنے کیلئے پوچھا۔

''ایک بات پوچھوں!''

''ہاں......ہاں پوچھو!''وہ بولا۔

میں نے رات کا واقعہ گوش گزار کر دیا۔میری نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

''اچھا...... میں نے ایسا کچھ نہیں دیکھا!''وہ گڑبڑا کر بولا۔اس کا لہجہ اس کی بات کی نفی کر رہا تھا۔

''اچھا......تو ٹھیک ہے میں بابا جان سے پوچھ لوں گی!''میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

''نہیں......نہیں مولوی صاحب سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔میں خود سارے معاملے کی نوعیت معلوم کرتا ہوں۔اب نماز کو دیر ہو رہی ہے میں مسجد جا رہا ہوں!''وہ نظریں چرا کر بولتا باہر نکل گیا۔

☆......☆

راتوں کو غائب ہونا اپیا کا معمول بن گیا تھا۔گھر والوں سے لاتعلق سی رہتیں مغرب کے وقت ہی سو جاتیں ہر وقت ہر آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوارتیں اور اکیلے میں مسکراتی رہتیں۔اماں بھی سب دیکھ رہی تھیں۔

اگلی جمعرات کو عبدالرحمٰن نے ایک بچے کے ہاتھ پھول بھجوائے جو اماں کے ہاتھ لگ گئے۔اس رات اپیا بے خبر سوتی رہیں مگر ساری رات دروازے پر دستک ہوتی رہی۔میں اٹھ کر باہر دیکھتی تو کچھ نہ ہوتا۔وقفے وقفے سے دستک جاری رہی، میں چھپ کر کھڑی ہو گئی تاکہ بجانے والے کو فوراً پکڑ لوں مگر وہ بھی کمال کا پھرتیلا تھا، نا جانے کہاں غائب ہو جاتا تھا۔ساری رات یہ آنکھ مچولی جاری رہی۔صبح جاگتے رہنے کی وجہ سے سر درد سے پھٹ رہا تھا۔صبح عبدالرحمٰن کا موڈ بہت خراب تھا۔آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔میری طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر رہا تھا۔ہر بات پر بابا جان سے ڈانٹ کھا رہا تھا۔

''بھائی کیا بات ہے آج مزاج بہت بگڑا ہوا معلوم ہوتا ہے!''میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اشرف المخلوقات کو ہماری خوشی برداشت کہاں ہوتی ہے!''وہ جل بھن کر کہتا باہر نکل گیا۔

''اشرف المخلوقات...... ارے تو یہ خود کیا ہیں؟''میں حیران ہوئی۔

☆......☆

ایک رات کو اپیا پھر غائب تھیں۔میں غصے کے عالم میں فوراً باہر گئی دل چاہ رہا تھا کہ اس انجان شخص کا حشر نشر کر دوں، اپیا سے چھپ چھپ کر ملتا ہے۔میری اپیا کتنی باحیا اور نیک ہیں میں سوچتی وہاں گئی دیکھا تو روشنی کا مضبوط حصار موجود تھا، میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکی۔

''ہاں ہاں......میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم سے ہی شادی کروں گی!''اپیا ہنستے ہوئے وعدہ کر رہی تھیں۔میرا دل دھک سے رہ گیا اپیا کسی انجان شخص سے شادی کا وعدہ کر رہی تھیں۔

بابا جان کو خبر ہوئی تو کس قدر خفا ہوں گے یا اللہ یہ کون شخص تھا جو اس وقت آتا۔اور کسی کو کان و کان خبر نہ ہوتی۔

''اپیا! آپ رات کو کس سے باتیں کر رہی تھیں!''میں انتہائی غصے سے بولی۔

''میں......پاگل......میں تو سو رہی تھی!''اپیا لاپروائی سے ہنستے ہوئے بولیں۔

☆......☆

سے بولے۔
یہ دیکھ کر میرا ذہن الجھ سا گیا تھا۔ مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ کوئی ایسی بات تھی جو ہم سے پوشیدہ تھی مگر بابا جان واقف تھے۔

☆......☆

جمعرات کا دن تھا۔ عبدالرحمٰن کھانا لینے آیا تو مجھے پکارا۔
''زینب میرا ایک کام کردو گی!'' عبدالرحمٰن عاجزی سے بولا۔
''کون سا کام!'' میں بولی۔
''یہ پھول شہربانو کو دے دو!'' انتہائی خوبصورت سفید رنگ کے پھول انہوں نے مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔
ہائے کتنے خوبصورت پھول ہے۔ یہ تو کسی خاص جگہ کے لگ رہے ہیں!'' میں نے کہتے ہوئے سونگھنا چاہا۔
''ٹھہرو! یہ تمہارے لیے نہیں ہیں!'' عبدالرحمٰن کے لہجے میں سختی سی تھی۔
اچھا بابا! اپیا کو ہی دوں گی مگر کیا سونگھنے پر بھی پابندی ہے!'' میں نے مصنوعی خفگی سے پوچھا۔
''بس یہی سمجھ لو!'' وہ بولا۔
میں نے پھول دوپٹے میں چھپائے اور اندر آگئی مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اپیا کی بربادی کا سامان میں ہاتھوں میں اٹھا کر لائی ہوں۔
''اپیا! یہ پھول عبدالرحمٰن بھائی نے بھجوائے ہیں!'' میں نے پھول دیتے ہوئے شوخی سے چھیڑا۔
''لیکن کیوں؟'' اپیا حیرت سے بولی۔
''پتا نہیں مجھے تو انہوں نے کہا کہ خاص جگہ کی سوغات ہے اور خاص لوگوں کے لیے ہے۔'' شرارت سے بولی۔
''کس قدر عمدہ خوشبو ہے!'' اپیا نے کہتے ہوئے ایک لڑی اپنے بالوں میں لگالی۔ پھولوں نے ان کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ میں نے نظر بچا کر ایک پھول بالوں میں لگالیا۔ پھول لگاتے ہی میرا سر بری طرح سے چکرانے لگا میں گھبرا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ دل ڈوبنے لگا شدید غنودگی سی ہونے لگی تھی۔ یوں لگا جیسے کسی نے کندھوں پر پہاڑ جتنا وزن رکھ دیا ہو۔ میں نے گھبرا کر پھول اتار پھینکے تو حالت سنبھلی۔ اپیا کو دیکھا تو وہ گہری نیند سو چکی تھیں۔ مجھے بہت حیرت ہوئی تھی کہ اپیا اچانک کیسے سو گئیں، میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اپیا کو یہ پھول نہیں لگانے چاہیئے تھے۔ مگر اب تو تیر کمان سے نکل کر شکار کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا۔
''ارے یہ لڑکی مغرب کے وقت سو رہی ہے یہ تو اس وقت نہیں سوتی!'' اماں نے حیرت کا اظہار کیا۔
''اور یہ پھول کیوں لگا رکھے ہیں!'' اماں بولیں۔
میں چپ رہی جانتی تھی کہ سخت ڈانٹ پڑے گی۔

☆......☆

رات کے آخری پہر میری آنکھ کھلی تو اپیا اپنے بستر پر نہیں تھیں، شاید پانی پینے گئی ہوں، میں نے اپنے دل کو تسلی دی۔ کافی دیر انتظار کے بعد جب وہ نہ آئیں تو میرے دل کو خوف لاحق ہوا میں باہر نکل آئی، ہر جگہ خاموشی کا راج تھا۔ یکایک باتوں کی آواز پر میرے قدم تھم سے گئے، آوازیں چبوترے کی سیڑھیوں کی طرف سے آ رہی تھیں۔ اسی اثنا میں اپیا کی مدھر ہنسی گونجی خوف سے میرا خون جمنے لگا۔ میں ہمت کر کے سیڑھیوں کے قریب پہنچ گئی۔ وہ کسی شخص سے محو گفتگو تھیں۔
رات کے اس پہر وہ کون تھا؟ اور اپیا یوں کسی اجنبی سے باتیں کیوں کر رہی تھیں؟ میں آگے بڑھی مگر تیز روشنی نے میری آنکھیں چندھیا دیں۔ میں نے گھبرا کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ روشنی کے باعث میں اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی۔
''اچھا اب میں چلتی ہوں!'' اپیا کی خوابیدہ آواز سنائی دی۔
''کل ملنے آؤ گی نا!'' وہ شخص بہت محبت بھرے لہجے میں بولا۔
میں خوف سے بھاگتی ہوئی کمرے میں آ کر لیٹ

امریکہ کی دریافت

شروع میں دنیا میں تھوڑے ہی ملک تھے لوگ خاصے امن چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ پندرھویں صدی میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ اس کے بارے میں دو نظریے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کا قصور نہیں، وہ ہندوستان کو یعنی ہمیں دریافت کرنا چاہتا تھا۔ غلطی سے امریکہ دریافت کر بیٹھا۔ اس نظریے کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ ہم ابھی تک دریافت نہیں ہو پائے۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ نہیں کولمبس نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی یعنی امریکہ دریافت کیا۔ بہرحال اگر یہ غلطی بھی تھی تو بہت سنگین غلطی تھی اس کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں۔

(ابن انشاء کی ''اردو کی پہلی کتاب'' سے راز عدن۔ بحرین کا انتخاب)

''یا اللہ یہ کون سی نئی مصیبت آ گئی ہے!'' میں کوفت سے سوچنے لگی میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ مجھے یہ بات بابا جان اور اماں جان کو بتا دینی چاہیے۔

میں نے ان دونوں سے ذکر کیا تو اماں جان رونے لگیں البتہ بابا جان کے چہرے پر تفکر کے گہرے بادل چھا گئے۔

''ٹھیک ہے آج رات میں خود جاگوں گا اور دیکھوں گا کیا ماجرا ہے!'' بابا جان بولے۔

سرشام ہی بارش ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش طوفانی ہوتی جا رہی تھی۔ طوفان بھی ایسا جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ مگر میرے خیال کے برعکس بلا آج بھی موجود تھا۔ بارش میں بھیگتا ہوا۔ اس کی آواز سن کر اپیا بے قراری سے دروازے کی طرف لپکیں۔

''اچھا تو یہ تیری حرکت ہے۔ اب جنس روپ بھی اختیار کرنے لگا ہے!'' بابا جان بولے۔ بابا جان کی خونخوار نگاہوں کے مقابلے میں بلا بھی اپنی جگہ ڈٹا تھا۔ وہ یوں دیکھ رہا کہ جیسے ہر بات سمجھ رہا ہو بلا بھی شعلہ بار نگاہوں سے انہیں گھور رہا تھا۔ بابا جان نے اسے لاٹھی سے مارنا شروع کر دیا اتنا بے دردی سے کہ میری اور اماں کی چیخیں نکل گئیں۔ کہاں بلی کے ساتھ شفقت کی احادیث سنانے والے بابا جان جو خود اسے اس قدر مار رہے تھے۔ وہ نڈھال سا زمین پر گر گیا بلے کو مار پڑتی دیکھ کر اپیا ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ بابا جان نے نیم مردہ بلے کو اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیا اور تمام گھر کا حصار کرنے لگے۔

ان کی بے خبری میں اپیا نے ان پر چھری سے حملہ کر دیا۔ اسی ہاتھ کو زخمی کیا جس سے بلے کو مارا تھا۔ بابا جان کو گہرا زخم آیا تھا۔ میری اور اماں کی بری حالت تھی فرط جذبات میں آ کر اماں جان نے اپیا کو ایک تھپڑ لگایا تو وہ بے ہوش ہو کر گر گئیں۔

''اس بے چاری کو کیوں مار رہی ہو وہ اپنے بس میں کہاں ہے!'' بابا جان تکلیف سے نڈھال ہو کر بولے۔

صبح میں نے بابا جان سے پوچھا۔

''بابا جان! آپ نے بلے کو اتنی بے رحمی سے کیوں مارا؟'' مجھے بہت دکھ تھا۔

''بیٹا وہ دراصل بلا نہیں ہوائی مخلوق تھی جو بے کے روپ میں تھی!'' بابا جان بولے ان جواب پر میں دنگ رہ گئی۔ ایک بات جو مجھے بے چین کیے جا رہی تھی کہ عبدالرحمن یا وہ اجنبی شخص یا پھر وہ پراسرار بلا تینوں کا اپیا سے کوئی نہ کوئی تعلق تھا۔ نجانے کیا راز تھا؟

☆......☆

کافی دن سکون سے گزر گئے وہ بلا پھر نہ آیا تھا۔ بابا جان باقاعدگی سے گھر کا حصار کرتے تھے شاید مصیبت ٹل گئی تھی۔ اس نادیدہ مخلوق نے اپیا کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ میں سوچتے سوچتے سو گئی۔ خواب میں، میں نے عبدالرحمن کو دیکھا وہ ہمارے دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر رو رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور جسم زخمی تھا۔ گھبراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں چپکے سے

اگلی جمعرات کو عبدالرحمٰن نے پھر پھول بھجوائے۔ جو اتفاقاً بابا جان کے ہاتھ لگ گئے۔ وہ انتہائی جلال کی حالت میں عبدالرحمٰن کو آوازیں دیتے ہوئے حجرے میں چلے گئے۔

میں نے چپکے سے جھانکا..... عبدالرحمٰن بابا جان کے پاؤں پکڑ کر رو رہا تھا۔

''مولوی صاحب! معاف کردیں میں بہت مجبور ہوگیا ہوں۔ محبت کے جذبے سے لڑ نہیں پایا!'' وہ ہاتھ جوڑتے بولا۔

''تو تجھے میرا ہی گھر ملا تھا ڈسنے کے لیے!'' بابا جان گرجے۔

''میں شہر بانو سے شادی کرنا چاہتا ہوں!'' وہ روتے ہوئے بولا۔

''بند کر اپنی بکواس کبھی تُو نے غور کیا ہے کہ یہ شادی ممکن ہے!'' بابا جان غضب ناک انداز میں بولے۔

مولوی صاحب! میرے بڑوں نے بھی ایسی شادیاں کی ہیں!'' وہ منت کر رہا تھا۔

''میرے اندر حوصلہ نہیں کہ میں اپنے جگر کا ٹکڑا تیرے حوالے کردوں!'' بابا جان غصے سے گھورتے باہر نکل گئے۔

عبدالرحمٰن وہیں بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ اوہ! تو عبدالرحمٰن اپیا سے محبت کرنے لگا ہے۔ اور ان کا رشتہ مانگ رہا ہے، بابا جان اگر مان جائیں تو کم از کم اس کمینے انسان سے تو جان چھوٹے گی، جو اپیا کو ورغلا رہا تھا۔ شادی کے وعدے لے رہا تھا۔ نا جانے بابا جان کے انکار کی وجہ کیا ہے!'' میں سوچتی رہی۔

''بی بی صاحبہ! آپ ہی میری مدد کریں۔ میں شہر بانو سے شادی کرنا چاہتا ہوں!'' وہ اماں جان کے قدموں میں بیٹھا تھا۔

''دیکھو عبدالرحمٰن! میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتی!'' اماں نرمی سے بولیں۔ وہ خود حیران تھیں کہ آخر انکار کی کیا وجہ ہے عبدالرحمٰن تو گھر کا بچہ ہے انتہائی فرماں بردار اور شریف۔

یہ خبیث ابھی تک یہاں بیٹھا ہے!'' بابا جان اندر داخل ہوئے تو اسے دیکھ کر بھڑک اٹھے۔

''مولوی صاحب! میں شہر بانو کے بغیر زندہ نہیں رہ پاؤں گا!'' وہ گڑگڑایا۔

''نکل جاؤ ذلیل یہاں سے!'' بابا جان نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

''مولوی صاحب! آپ مجھے سرکشی پر مجبور کررہے ہیں!'' وہ غصے میں آگیا۔

''احسان فراموش، گھٹیا!'' بابا جان نے ایک زوردار تھپڑ اسے دے مارا اور اسی دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔

احسان فراموش!'' وہ اسے صلواتیں سنا رہے تھے۔

''بابا جان! آخر عبدالرحمٰن میں کیا کمی ہے جو آپ ایسا سلوک کررہے ہیں!'' میں اچانک بولی۔

''زینب! تم ان معاملات سے دور رہو۔ انکار کی وجہ نہیں بتا سکتا میں۔ آج کے بعد کوئی عبدالرحمٰن کا نام نہ لے!'' بابا جان نے فیصلہ سنایا۔ میں بابا جان کے جواب پر چپ ہوگئی مگر تجسس ابھی باقی تھا۔

اس واقعے کے بعد اپیا گم صم ہوگئیں کھانا پینا چھوڑ دیا ہر وقت کمرے میں پڑی رہتیں چند دنوں میں برسوں کی بیمار لگنے لگیں سب بہت پریشان تھے۔

☆......☆

ایک رات اپیا بہت بے چین تھیں۔ بار بار ٹہلنے لگتیں جیسے کسی کا انتظار ہو۔ میں آنکھوں پر ہاتھ رکھے سب دیکھ رہی تھی۔ اتنی دیر میں دور کہیں سے بلی کی آواز آئی جو رفتہ رفتہ قریب آتی جارہی تھی پھر وہ آواز بالکل دروازے کے قریب سے آنے لگی اور بلی دروازہ کھرچنے لگی۔ اپیا تو گویا منتظر تھیں۔ تڑپ کر اٹھیں اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک بلا کھڑا تھا اپیا اسے گود میں لے کر پیار کرنے لگیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت مانوس لگ رہے تھے۔

میں چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پائی تھی۔ اذانوں کی آوازیں سنائی دیں تو بلا چلا گیا اور اپیا اطمینان سے سوگئیں اور پھر یہ معمول بن گیا۔

تھی۔ کنوئیں پر بے شمار دیے روشن تھے، اپیا کے لیے اس قدر اہتمام تھا کہ کرنے والے کی محبت ظاہر ہورہی تھی۔ ہم کنوئیں کے قریب پہنچ گئے مگر ہم کچھ خاص دیکھ نہیں پارہے تھے۔ کوئی مضبوط سا حصار تھا جو ہمیں روک رہا تھا۔

میں زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ بابا جان انتہائی طیش کے عالم میں کچھ پڑھنے لگے ابھی کچھ دیر ہوئی تھی کہ ایک مردانہ آواز گونجی اور تمام روشنیاں بجھ گئیں۔ اپیا کنوئیں کے قریب بے ہوش پڑی تھیں۔ میں بھاگتی ہوئی ان کے قریب گئی۔ ان کی حالت پر دل تڑپ رہا تھا، بابا جان کے چہرے پر غم کے آثار نمایاں تھے۔

☆......☆

نماز فجر کے بعد بابا جان نے ضروری سامان لیا اور باہر جانے لگے۔

''کیا ہوا کہیں جارہے ہیں!'' اماں نے پوچھا۔

''ہاں گجرات اپنے پیرو مرشد شاہ عثمانی صاحب کے پاس جارہا ہوں۔ اب اس خبیث کا کچھ کرنا پڑے گا!'' وہ باہر نکل گئے۔ میرے دل کو اطمینان ہوا کہ اب اپیا ضرور ٹھیک ہوجائیں گی وہ پھر پہلے جیسی ہوجائیں گی۔

عشاء کے بعد بابا جان واپس لوٹے۔ ان کے کپڑے کیچڑ میں لت پت تھے۔ جگہ جگہ پر خون کے دھبے بھی تھے۔ وہ بہت نڈھال لگ رہے تھے۔

''بابا جان خیریت کیا ہوا، آپ کے پیرو مرشد نہیں آئے!'' میں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔ بابا جان نے اس کے جواب میں جو قصہ سنایا وہ سن کر میں اور اماں جان خوفزدہ ہوگئے۔

''میں بس کے انتظار میں کھڑا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ اللہ اللہ کر کے بس پہنچی مگر بس نے کوئی سات چکر لگائے مگر ہر بار مجھے ایک ہی سڑک پر اتار جاتی۔ میری سمجھ سے باہر تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اس الجھن میں کھڑا تھا کہ طوفانی بارش شروع ہوگئی حیرت انگیز طور پر بارش کا رنگ سرخ تھا۔ میں گھبرا کر ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ بارش آہستہ آہستہ تھمنے لگی تو میں نے دوبارہ ہمت جمع کی۔ اسی اثنا میں دو تین چھوٹے بچے نظر آئے ان کے کان جانوروں کے کانوں کی طرح لمبے لمبے تھے۔ رنگت سیاہ اور آنکھیں بالکل سرخ۔

''دیکھو ان پر نظر رکھنا یہ گجرات اپنے پیرو مرشد کے پاس نہ جانے پائیں۔'' وہ تینوں سرگوشیاں کرتے ہوئے غائب ہوگئے۔ ان کی باتیں سن کر میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے یہاں سے جلد از جلد نکلنے کا ارادہ باندھا تو کچھ مرد اور عورتیں نظر آئے۔ مرد ڈھول بجارہے تھے۔ عورتوں کے ہاتھوں میں مہندی کے تھال تھے۔ اس ویرانے میں یہ لوگ میری سمجھ سے باہر تھا۔ شاید شادی میں جارہے ہوں، میں نے دل کو تسلی دی۔

''بھائی! آپ لوگ بھی گجرات جارہے ہیں!'' میں نے ایک شخص کو مخاطب کیا اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا، میں سمجھا شاید سماعت سے محروم ہے میں نے ایک لڑکی سے بھی وہی سوال کیا تو وہ ہنسنے لگی۔

''ارے مولوی صاحب! ہم گجرات نہیں ہم تو ''شہر بانو'' کی شادی میں جارہے ہیں۔ آپ کی بیٹی کی شادی ہے اور آپ یہاں ہیں!'' یہ کہہ کر وہ سب قہقہے لگانے لگے اور دیکھتے دیکھتے دھواں بن کر غائب ہوگئے۔

اس ویرانے میں اپنی لاڈلی بیٹی کا نام اجنبی لوگوں کے منہ سے سن کر میرا دل ڈوبنے لگا، سوچا پر لگیں اور اڑ کر چلا جاؤں۔ اپنی شہر بانو کو دیکھ لوں کہ وہ خیریت سے تو ہے۔ بابا جان یہ کہہ کر رونے لگے۔ میری اور اماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''یہ تو مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ میں کسی شیطانی چکر میں پھنس گیا ہوں۔ یہ مجھے ہرگز شاہ عثمانی صاحب سے ملنے نہیں دیں گے!'' بابا جان دوبارہ گویا ہوئے۔ میں تھک ہار کر واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو ایک ستر سالہ شخص آتا دکھائی دیا۔ اس کی کمر جھکی تھی اور ہاتھ میں لاٹھی پکڑے وہ میری طرف آرہا تھا۔ میں اس کو شیطانی مخلوق سمجھ رہا تھا، مگر اس کا

اٹھی اور دروازہ کھول کر دیکھا تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ واقعی عبدالرحمن رو رہا تھا۔

''زینب! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے ایک نظر شہربانو کو دیکھنے دو۔ مولوی صاحب کے سخت حصار کی وجہ سے میں اندر نہیں آسکتا۔ اگر تم اجازت دو گی تو میں اندر آجاؤں گا۔ کتنے دن ہو گئے ہیں میں اس کی جھلک نہیں دیکھ پایا ہوں!'' عبدالرحمن بے حد نڈھال تھا میرا دل اس کی حالت پر بھر آیا۔

''ٹھیک ہے بھائی اندر آجائیں مگر جلدی چلے جائیے گا۔ بابا جان کو خبر ہوئی تو قیامت آجائے گی!'' میں نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔ میری اجازت پر وہ کھل اٹھا۔ اپیا بے خبر سو رہی تھیں۔ عبدالرحمن نے انہیں وارفتہ نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا۔

''بھائی! آپ اتنے زخمی کیوں ہیں!'' میں دردمندی سے بولی۔

''دراصل..... مولوی صاحب نے بہت مارا ہے!'' عبدالرحمن آہستگی سے بولا۔

''بھائی آپ اپیا کو بھول کیوں نہیں جاتے۔ مت اپنی جان گنوائیں!'' میں دکھ سے بولی۔

''یہ میرے اختیار میں کہاں ہے زینب!'' عبدالرحمن کا لہجہ بھیگ گیا۔

''اچھا اب آپ جائیں۔ بابا جان نہ آجائیں!'' میں ایک دم گھبرائی۔

اس نے ایک نظر ڈالی اور میرا شکریہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ میرا دل غم سے بھر گیا تھا۔ میں ان کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔

☆......☆

''رات کو یہاں کوئی آیا تھا؟'' بابا جان نے آنکھیں بند کر کے کچھ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو!'' اماں جان بولیں۔ میری جان نکل گئی مگر میں خاموش رہی تھی۔

''نہیں رات کو نادیدہ مخلوق گھر میں کسی روپ میں داخل ہوئی تھی!'' بابا جان پر یقین لہجے میں بولے۔

''خیر میں حصار مزید سخت کر دیتا ہوں لیکن یاد رکھنا تم دونوں ہوشیار رہنا۔ جب تک تم چاہو گی نہیں کوئی مخلوق بلا اجازت اندر داخل نہیں ہو گی!'' وہ تنبیہ کرتے ہوئے بولے۔

حصار سخت ہوتے ہی بلے کی دل خراش آوازیں دوبارہ آنے لگیں آواز سن کر اپیا کی حالت بے حد جنونی ہو جاتی۔ انہیں دورے پڑنے لگتے آنکھیں سرخ ہو جاتیں بار بار دروازہ کھولنے کی کوشش کرتیں۔ ساری رات ہم پہرہ دیتے بلے کی آواز اس قدر بھیانک ہوتی کہ لگتا کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ وہ نادیدہ مخلوق اب انتقامی کارروائیوں پر اتر آئی تھی کبھی گھر کے کسی حصے میں آگ بھڑک اٹھتی، کبھی مسجد کا کوئی حصہ گر جاتا۔ اذان کے وقت لاؤڈ اسپیکر میں کرنٹ آجاتا۔ بار بار بابا جان اس کی زد میں آتے۔ مغرب کے بعد گھر میں پتھر برسنا شروع ہو جاتے۔ وہ اس قدر بڑے ہوتے کہ بابا جان اکثر زخمی ہو جاتے۔

''فرشتے کو شیطان بننے میں بس پل بھر کی دیر لگتی ہے!'' وہ بڑبڑاتے۔

اپیا ان کی تکلیف پر مسکرا رہی ہوتیں۔ ہم بے حد حیران ہوتے مگر ان انتقامی کارروائیوں سے ہم محفوظ رہے تھے۔ یہ بھی ایک راز تھا۔

ایک شام اپیا بہت اہتمام سے تیار ہو رہی تھیں۔

''اپیا کہیں جانا ہے کیا!'' میں حیرت سے بولی۔

''ہاں!'' وہ مسکرائیں۔ مجھے خطرے کی بو محسوس ہوئی۔ رات کو میں جاگنا چاہتی تھی مگر نیند غالب آگئی تھی۔ رات کو آنکھ کھلی تو اپیا غائب تھیں۔ حصار کی وجہ سے کوئی مخلوق اندر تو داخل نہیں ہو سکتی تھی مگر شاید اس نے اپیا کو باہر بلا لیا تھا مجھے خود پر بے حد غصہ آرہا تھا کہ کیوں سو گئی تھی۔

بابا جان کو خبر کی، سارے گھر میں تلاش کیا مگر اپیا نہ ملیں۔ ہم باہر میدان میں آگئے جہاں کنواں تھا۔ وہاں جو منظر دیکھا میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ رنگ و نور کا سماں تھا۔ تمام فضا خوشبو سے معطر

پیچھے گئی وہ کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ باہر نکلے تو ان کے ہاتھ میں چھری تھی۔ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ وہ اپیا کے کمرے کی طرف چل پڑے میں سمجھی کہ وہ شاید وہ کوئی عمل کر رہے ہیں۔ میں بھی خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑی۔

''یا اللہ! مجھے معاف فرما دینا!'' وہ چھت کی طرف دیکھ کر بولے۔

میں چپ چاپ کھڑی ایک باپ کی بے بسی دیکھ رہی تھی، انہوں نے کندھے پر پڑے رومال سے اپنے آنسو صاف کیے اور اپیا کے قریب پہنچ گئے۔ اپیا بے خبر سو رہی تھیں۔ بابا جان نے ان کی پیشانی چومی اور گردن پر چھری چلانے لگے تھے کہ میں نے بھاگ کر ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''بابا جان یہ آپ کیا کر رہے ہیں!'' میں نے روتے ہوئے ان کے ہاتھ سے چھری چھین لی۔

''پھر کیا کروں؟ میرے لیے بیٹی کو قبر میں اتارنا آسان ہے مگر اس بدبخت کے حوالے کیسے کر دوں!'' وہ کہہ کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ ان کی بے بسی پر میرا دل کٹ رہا تھا۔

اسی اثنا میں اماں جان اندر آئیں۔

''مولوی صاحب مسجد سے بچہ آیا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ پیرو مرشد عثمانی صاحب تشریف لائے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں!'' اماں جان نے گویا تن مردہ میں جان ڈال دی۔ بابا جان مسجد کی طرف دوڑے۔

بابا جان گھر آئے تو شاہ صاحب ان کے ہمراہ تھے۔

''دیکھو جلیل! گھبراؤ نہیں۔ ہر تکلیف کے بعد راحت بھی آتی ہے۔ وہ قادر موجود ہے نا وہی ہماری مدد کرے گا!'' انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ صحن میں بیٹھ کر پڑھائی کرنے لگے۔ اپیا جو بے خبر سو رہی تھیں خونخوار انداز میں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کی حالت جنونی ہو رہی تھی۔ ہم انہیں مشکل سے قابو کر رہے تھے شاہ صاحب مسلسل پڑھائی کر رہے تھے۔ کچھ دیر گزری تو بلے کی آواز سنائی دی۔ یوں لگا جیسے شیر دھاڑ رہا ہو۔ بلے کی آواز پر اپیا کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔ شاہ صاحب پڑھائی کرتے کرتے رک گئے۔ وہ کچھ نڈھال دکھائی دے رہے تھے، تکلیف ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

''کیا ہوا شاہ صاحب؟'' بابا جان گھبرا گئے۔

''جلیل! کوئی رکاوٹ درپیش ہے۔ بات نہیں بن رہی!'' ان کی بات سن کر بابا جان افسردہ ہو گئے۔ ''اچھا میں ایک نظر بچی کو دیکھنا چاہتا ہوں!'' شاہ صاحب سنجیدگی سے بولے ان کا لہجہ پرسوچ تھا۔

بابا جان انہیں اندر لے آئے، شاہ صاحب کی آمد پر اپیا کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔

''اچھا نہیں کر رہے تم!'' اپیا مردانہ آواز میں بولیں۔

''اچھا تو یہ بھی اس خبیث کی چال ہے!'' شاہ صاحب نے کہتے ہوئے اپیا کے گلے کا تعویذ اتارنا چاہا تو اپیا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شاہ صاحب نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو اپیا کی گرفت کمزور پڑی۔ شاہ صاحب نے تعویذ سامنے رکھ کر پڑھائی شروع کی۔ چند لمحوں میں تعویذ کو آگ لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد نا جانے کہاں سے بلا آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ خونخوار نظروں سے شاہ صاحب کو دیکھتا ہوا سامنے آ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں ہے۔

اس کے یہ تیور دیکھ کر شاہ صاحب جلال میں آ گئے۔ پاس پڑی لوہے کی سلاخ پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور اس کی کمر پر دو تین بار اس زور سے ماری کہ وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا اور دردناک آوازیں منہ سے نکالتا ہوا بے دم ہو کر گر گیا۔

''اصلی شکل میں آ مجھے بات کرنی ہے تجھ سے!'' شاہ صاحب نے سلاخ سے اسے مارتے ہوئے کہا۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بلا عبدالرحمن کی شکل اختیار کر گیا۔ خوف سے میری اور امی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''کتنے روپ دھارے گا۔ اصلیت تو نہیں بدل

نورانی چہرہ دل کو تسلی دے رہا تھا۔
''پریشان ہو بیٹی کے لیے؟'' انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔ میں بے حد حیران ہوا کہ وہ بغیر کہے میری دل کی بات جان گئے تھے۔
''اس کے اوپر بہت سخت چیز کا قبضہ ہے۔ اس کو قابو کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے، یہ لو پکڑو۔'' انہوں نے ایک تعویذ میری طرف بڑھا۔
''اس کے گلے میں ڈال دینا بالکل ٹھیک ہو جائے گی!'' وہ بزرگ یہ کہہ کر غائب ہو گئے۔
باباجان اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔
''زینب! یہ شہر بانو کے گلے میں ڈال دو!'' باباجان نڈھال لہجے میں بولے۔
تعویذ پہننے کے بعد دو دن تک اپیا بالکل ٹھیک رہیں۔ ہم سمجھے مصیبت ٹل گئی مگر یہ ہماری غلط فہمی تھی۔ اپیا دوبارہ راتوں کو غائب ہونے لگی تھیں۔ اس نادیدہ مخلوق نے کچھ طرح چکر چلایا تھا کہ اپیا بہت بے چین رہنے لگی تھیں۔ اس تعویذ کا اپیا کو تو کوئی فائدہ نہ ہوا مگر وہ نادیدہ مخلوق خوب فائدے اٹھا رہی تھی۔ یہ بھی ایک اہم بات تھی۔ اب سارے علاقے میں یہ بات پھیل گئی کہ مولوی جلیل کی بیٹی پر ہوائی مخلوق کا قبضہ ہے۔ وہ ہر صبح کنوئیں کے قریب بے ہوش پڑی ملتی ہے۔ باباجان نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ وہ ہر دم روتے رہتے ان کے رونے میں ایک بے بسی سی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو بچا نہیں پا رہے تھے۔ وہ سجدوں میں گڑگڑاتے رہتے اور عبدالرحمن کو خوب کوستے بددعائیں دیتے رہتے۔
''مولوی صاحب! ایک تو ہماری بیٹی مصیبت میں ہے اور آپ اس غریب کو بددعائیں دیتے رہتے ہیں۔ آپ اگر مان جاتے تو آج ہماری بیٹی اپنے گھر میں خوش وخرم ہوتی۔ اچھا بھلا لڑکا تھا عبدالرحمن! مجھے تو لگتا ہے ہمیں اس کی آہ لگ گئی ہے۔ آپ نے کس قدر بے عزت کر کے اسے نکالا تھا!'' اماں جان بیٹی کی تکلیف پر پھٹ پڑیں۔ باباجان جواب میں بالکل خاموش رہے۔ تب مجھے لگا شاید وہ بھی پچھتا رہے ہیں۔

☆......☆

چاند کی آخری تاریخیں چل رہی تھیں۔ اپیا بالکل ہی ہوش سے بیگانہ ہو گئی تھیں۔ ایک صبح میری آنکھ کھلی تو کمرے میں انتہائی دلفریب مہک رچی بسی تھی۔ پورا کمرا مہک رہا تھا۔ کمرے کی مدھم سی روشنی میں مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اپیا گہری نیند سو رہی ہیں۔ میں ان کے قریب گئی خوشبو اپیا کے وجود سے آ رہی تھی۔ میں بھاگ کر ان کے قریب گئی۔ تو دیکھا اپیا کے ہاتھوں پیروں پہ اس قدر خوبصورت مہندی لگی تھی۔ نقش ونگار بے حد دیدہ زیب تھے۔ اس کی خوشبو اور رنگ عام مہندی سے بالکل الگ تھا۔ اپیا کے دودھیا ہاتھوں میں مہندی بے حد جچ رہی تھی۔
''اپیا! یہ مہندی کیوں لگائی ہے؟'' میں نے انہیں جگانے کی کوشش کی مگر بڑی گہری نیند میں تھیں۔ میں اماں کو بلا کر لائی تو گھبرا کر رونے لگیں۔ باباجان بھی گھبراتے ہوئے ہوئے چلے آئے۔
''شہر بانو یہ مہندی کس نے لگائی ہے؟'' وہ بہت محبت سے پوچھ رہے تھے۔ کافی دیر بعد اپیا نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے ہاتھوں پیروں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں۔
''باباجان رات کو کچھ لڑکیاں آئی تھیں۔ انہوں نے مجھے مہندی لگائی اور کہا کہ اس چاند کی پہلی تاریخ کو میری شادی ہے!'' اپیا مدہوشی میں بولیں۔
یہ سن کر ہم دنگ رہ گئے۔ وہ نادیدہ مخلوق کتنے آرام سے ہماری اپیا کو ہم سے دور کر رہی تھی اور ہم بے بس تھے۔
''باباجان! اپیا کو بچالیں!'' میں روتے ہوئے ان کے سینے سے لگ گئی۔
باباجان اس واقعے کے بعد بالکل گم صم ہو گئے تھے۔ راتوں کو بھی جاگتے رہتے بے بسی سے صحن میں کھڑے ہو کر چاند کو تکتے رہتے۔ چاند کے مکمل ہونے میں دو دن رہ گئے تھے۔ باباجان کی بے چینی عروج پر تھی۔ انہوں نے مغرب کی نماز ادا کی اور جلدی گھر آ گئے۔
باورچی خانے میں انہیں دیکھ کر میں بھی ان کے



دوسری ہولناک کہانی



ایک راز......

مجید احمد جائی

اک ایسی جناتی شادی کا ماجرا جس کے بارے میں آج تک کسی کو کچھ بھی علم نہ ہو سکا مگر......

کلاس روم سے نکل کر ہم کینٹین پر جا بیٹھیں۔ سبھی سہیلیاں اپنے اپنے شہزادوں کے قصے چھیڑ کر بیٹھ گئیں۔ مجھے اقصیٰ نے کہنی ماری۔
''سناؤ انعم! تیرا کیا بنا۔ کہاں تک بات پہنچی۔''



سکے گا!'' شاہ صاحب بولے۔ عبدالرحمٰن تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ اس کی کمر سے خون بہہ رہا تھا۔ مگر آنکھوں سے ڈھٹائی جھلک رہی تھی۔ میں حیرت کے عالم میں اسے تکے جا رہی تھی۔

اتنے روپ دھارنے والا عبدالرحمٰن کون تھا؟

''احسان فراموش، شرم نہیں آئی تجھے اپنے استاد کو تکلیف دیتے ہوئے!'' شاہ صاحب غضبناک ہو کر بولے۔

''محبت نے مجھے مجبور کر دیا ہے ورنہ انہیں تکلیف نہ دیتا!'' وہ تکلیف سے بولا۔

''یہ محبت ہے تیری، کیا حال کر دیا ہے اس بچی کا۔ اندازہ ہے تجھے اس کی تکلیف کا۔ یہ محبت تو نہیں ہے خود غرضی ہے، خود غرضی، جس نے تجھے اتنا سرکش بنا دیا ہے!'' وہ بولے۔

''میں بھی تکلیف میں ہوں۔ یہ میری شادی نہیں ہونے دیتے اس سے نہ ملنے دیتے ہیں۔ اب جو مجھے ٹھیک لگا میں نے کیا اور محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے!'' وہ انتہائی سرکشی بولا۔ شاہ صاحب خاموشی سے اسے گھور رہے تھے۔

''انسان ہمیشہ ہم سے پیمان لے کر ہمیں ہماری محبت چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں اس لڑکی نے بھی مجھ سے وعدہ کیا ہے شادی کا اور ہماری قوم اتنی آسانی سے کسی کو وعدے سے پھرنے نہیں دیتی!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم اس لڑکی کو بتا دو کہ تم کون ہو۔ اگر تمہارا اصل جاننے کے بعد بھی وہ راضی ہوتی ہے شادی کرنے پر تو میں سب کی موجودگی میں تمہارا نکاح اس سے پڑھوا دوں گا!'' شاہ صاحب نے کہا۔

''اصل!'' عبدالرحمٰن یہ سن کر سکتے میں آ گیا تھا۔

''لیکن وہ تو محبت میری اسی صورت سے کرتی ہے!'' اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

''گھبرا کیوں رہے ہو۔ اگر تمہاری محبت اتنی مضبوط اور سچی ہے تو دکھاؤ اپنا اصل روپ!'' شاہ صاحب نے جواب دیا۔

''شاہ صاحب! میں شہربانو کی نظروں میں اپنے لئے نفرت نہیں برداشت کر پاؤں گا۔ مجھے محبت کرنے کی اتنی کڑی سزا تو نہ دیں!'' وہ شاہ صاحب کے پاؤں پکڑ کر رونے لگا۔

''نہیں ہم کچھ نہیں سنیں گے۔ اس لڑکی کو اپنا اصلی چہرہ دکھاؤ ورنہ اس کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے دور چلے جاؤ!'' وہ دوٹوک انداز میں بولے۔ سب اسے بے بسی سے آنسو بہاتا ہوا دیکھ رہے تھے، وہ رو رہا تھا تڑپ رہا تھا۔ مجھے لمحے بھر کے لئے اس پر بہت ترس آیا کہ اپیا کو اس کے حوالے کر دوں۔

شاہ صاحب کے حکم پر میں اور اماں جا کر اپیا کو پکڑ کر لے آئے اور عبدالرحمٰن کے سامنے بٹھا دیا۔ عبدالرحمٰن اپیا کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا اپیا کو کھو دینے کی تکلیف اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

''دکھاتے کیوں نہیں اپنا اصل چہرہ۔ بتاؤ اسے کہ تم انسان نہیں ایک جن زادے ہو!'' شاہ صاحب غصے سے دہاڑے۔

''جن زادہ!'' یہ الفاظ اپیا کی سماعت سے ٹکرائے تو وہ بے ہوش ہو گئیں۔ میں نے اور اماں جان نے خوف سے اپنے چہروں پر ہاتھ رکھ لیے۔ عبدالرحمٰن بھائی جو اپیا سے محبت کرتے ہیں وہ انسان نہیں ہے۔

عبدالرحمٰن کی آنکھیں شدت گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے صدمے سے اپیا کے بے ہوش وجود پر نظر ڈالی وہ جس شہربانو سے محبت کرتا تھا وہ تو بے ہوش ہو چکی تھی مگر اصل شہربانو تو ہوش میں آ چکی تھی۔

عبدالرحمٰن محبت کی جنگ ہار چکا تھا۔ اس نے ایک غمزدہ نگاہ اپیا پر ڈالی اور غائب ہو گیا اور اس دن کے بعد سے بابا جان نے کسی کو بھی اپنا شاگرد نہ بنایا تھا۔ سچ ہے آگ واقعی آگ کو نہیں جلا سکتی مگر ''آتش محبت'' نے ایک جن زادے کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ اور ساتھ ہی جو اعتماد کا خون ہوا تھا اس کا کوئی مول نہ تھا۔

☆☆☆

جاتا۔ دروازے پہ ایک پہرے دار کھڑا تھا جو لوگوں کو کنٹرول کر رہا تھا۔ آخر میری باری بھی آ ہی گئی۔

اب ڈر بھی لگ رہا تھا۔ میں اکیلی آئی تھی۔ جوان تھی اور بلا کی خوبصورت بھی۔

عامل بابا کے پاس پہنچی تو اپنا حال بیان کیا۔ بابا جی نے بھاری فیس کا مطالبہ کیا۔ کچھ تو میرے پاس تھی۔ جو میری کل جمع پونجی تھی۔ میں نے جمع کروادی اور باقی چند دِنوں میں دینے کا وعدہ کیا۔

باباجی نے دو تعویذ دیئے۔ ایک اپنی حفاظت کے لئے بازو یا کمر پر باندھنا تھا اور دوسرا بڑے قبرستان میں کسی پرانی قبر میں دفن کرنا تھا۔ اور یہ سارا عمل رات کے وقت کرنا تھا۔ کام مشکل تھا اور میں ٹھہری عورت ذات۔ مگر کہتے ہیں کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ میرے جذبے جوان تھے۔ اور میں ہر حال میں محبوب کو پانا چاہتی تھی۔۔ اُس کے بغیر زندگی بے کار سمجھتی تھی۔ میں نے دونوں تعویذ لئے اور دوسرے دروازے سے باہر نکل آئی۔

اب مجھے قبرستان میں جا کر پرانی قبر ڈھونڈنی تھی۔ دو دِن اسی کام میں لگ گئے اور پھر شہر کے بڑے قبرستان میں پرانی قبر کا سراغ مل گیا۔ خوش قسمتی سے میری خالہ شہر میں رہتی تھی اور قبرستان اُن کے گھر کے بالکل قریب پڑتا تھا۔ میں بہانے سے اپنی خالہ زاد صباء کو لے کر قبرستان چلی گئی۔ میری نظریں پرانی قبر کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آخر مجھے ایک پرانی قبر مل گئی۔ جس کے اردگرد جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ یہ کچی قبر تھی۔ اُس کی حالت بتاتی تھی کہ کبھی کسی شخص نے اِس طرف رُخ نہیں کیا۔ قبر پہ خشک گھاس پڑی تھی اور مٹی میں جگہ جگہ مکوڑوں نے گھر بنا رکھے تھے۔ قبر کے اردگرد جھاڑیاں میرے لئے حفاظت کا کام دے سکتی تھیں۔

میں نے اردگرد کی نشانیاں نوٹ کر لی اور پھر ایک گھنٹہ قبرستان میں بتانے کے بعد واپس خالہ کے گھر آ گئیں۔ اب سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ پلان کو کیسے پایہ انجام تک پہنچایا جائے۔ سوچوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ نظروں کے سامنے محبوب کا چہرہ تھا اور پست پردہ موت ہی موت تھی۔ محبوب کو حاصل کرنے کے لئے موت سے لڑ رہا تھا۔ مقابلہ سخت تھا اور میں بھی جذبوں سے سرشار تھی۔

☆......☆

پلان کے مطابق رات بارہ بجے مجھے قبرستان کی طرف نکلنا تھا۔ ڈر بھی تھا اور کام بھی ضروری تھا۔ کسی کو شریک راز بھی نہیں بنا سکتی تھی۔ مہینے کے شروع کے دن تھے اور چاند جلدی نکلتا تھا۔ شروع کے دن بھی ہوتے ہیں۔ اِن دِنوں میں محبوب کو پانے کے عملیات کامیاب ہوتے ہیں۔ میں نے مطلوبہ سامان تیار کر رکھا تھا۔ بس پلان کو پایہ تکمیل تک پہنچانا باقی تھا۔

جیسے ہی رات کے بارہ بجے میں چارپائی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں خالہ سمیت اُن کے خاندان کو نہایت چالاکی سے دودھ میں نیند آور گولیاں ملا کر پلا چکی تھی۔ تاکہ میرے گھر سے نکلنے کی کسی کو خبر تک نہ ہو۔ سبھی بے فکری کی نیند سو رہے تھے۔ میں چارپائی سے اُٹھی۔ ایک چھوٹا سا کسولہ (چھوٹا بیلچہ) اور ایک چھری ساتھ لی اور دبے پاؤں گھر کی دہلیز پار کر گئی۔

باہر گلی میں ہو کا عالم تھا۔ اپنے قدموں کی آواز بھی ایسے سنائی دیتی تھی جیسے دور کسی کی شادی میں ڈھول پیٹا جا رہا ہو۔

چلتے چلتے گلی میں گرتے پڑتے آخر میں قبرستان کے اندرونی دروازے تک پہنچ گئی اور نشانیوں کو دیکھتے دیکھتے مطلوبہ قبر تک بھی پہنچ گئی۔ ہلکی سی ہوا چلتی تو جھاڑیاں خوف ناک ارتعاش پیدا کرتی تھیں اور میں سہم جاتی۔ ایسے لگتا تھا جیسے ابھی کوئی جھاڑیوں سے نکل کر مجھے دبوچ لے گا۔ ڈر سے میرا بُرا حال تھا۔ سارا قبرستان مُردوں سے بھرا پڑا تھا اور میں زندہ جان کے ساتھ اکیلی تن تنہا رات کی تاریکی میں وہاں موجود تھی، جہاں دن کو بھی لوگ جاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ اور میں میرے اعصاب مضبوط تھے۔ میں منزل پانے کی لگن میں پُر امید تھی۔

میں نے تمام تر توجہ اپنے پلان کی طرف مرکوز کی اور کسولہ لے کر قبر کھودنے لگی۔ مجھے کم از کم دو فٹ نیچے تعویذ دفن کرنا تھا۔ میں اردگرد سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھی۔ ابھی ایک فٹ کی کھدائی کی ہو

اقصیٰ میری ہم راز تھی۔ میرا عشق اُسی کا مرہون منت تھا۔ صمد، اقصیٰ کے بھائی کامران کے ساتھ پڑھتا تھا اور وہ اکثر اکٹھے دیکھے جاتے۔ صمد کا اقصیٰ کے گھر آنا جانا تھا۔ میری پہلی ملاقات صمد سے اقصیٰ کے گھر ہی ہوئی تھی۔۔

اُس دن اقصیٰ کی سالگرہ تھی اور اقصیٰ نے شاندار تقریب سجائی تھی۔ تمام سہیلیوں اور برادری کو مدعو کیا تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب کیک کٹ چکا تھا۔ موج مستی میں، کولڈرنک کا گلاس ہاتھ میں پکڑے، میں ہجوم سے باہر نکلنے کے لئے پیچھے ہٹی تو صمد سے ٹکرا گئی۔ پھر کیا تھا۔ وقت تھم سا گیا۔ وہی اک پل تھا۔ نظریں چار ہوئیں۔ دِل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں۔ نظریں کیا ملیں، دِل بھی مل گئے۔ شاید ہم ایک دوسرے کے لئے بنے تھے۔ پہلی ملاقات، پیار کی پہلی سیڑھی ثابت ہوئی۔ میرا جینا مرنا صمد کے لئے ہو گیا۔ ہر وقت اُسی کے خیالوں میں گم رہتی۔۔ پڑھنا کم ہو گیا۔ سوچنا زیادہ ہو گیا۔ میں نے پیار کے سبجیکٹ جو رکھ لیے تھے۔ آگ دونوں طرف برابر لگی تھی۔ صمد کا دِل بھی میرے لیے دھڑکتا تھا۔

ہماری لو اسٹوری کو کئی سال گزر گئے۔ ہم ایک ہونا چاہتے تھے مگر وہی پرانی باتیں۔ ظالم سماج دیوار بن گیا۔ میرے گھر والے تو مان گئے لیکن، صمد کے والدین نہیں مان رہے تھے۔۔ اُن کا اور ہمارا جوڑ نہیں تھا۔ ہم غریب لوگ تھے اور وہ کھاتے پیتے کروڑ پتی لوگ۔

کورٹ میرج کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں گھر سے فرار ہو سکتی تھی نہ صمد یہ قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ دونوں پریمی اپنی اپنی جگہ پریشان تھے اور سوچوں کی وادی میں غوطہ زن تھے۔ ابھی پچھلے ہفتے بھی یہی موضوع زیر بحث رہا تھا۔ اب بھی اقصیٰ نے زخموں پہ نمک پاشی کی تھی۔ میرا موڈ آف ہو گیا اور ہوں، ہاں کرتے کینٹین سے یہ کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''اقصیٰ! تم چائے کے مزے لو میں کلاس روم سے ہو کر آتی ہوں۔'' کلاس روم کیا جانا تھا۔ کالج کا گیٹ ہی کراس کر آئی۔ چھٹی کو دیر تھی۔ گاڑی بھی نہیں آئی تھی۔ میں خیالوں کی دُنیا میں مست سڑک کنارے چلتی چلی جا رہی تھی۔ محبوب کو حاصل کرنے کے پلان ترتیب دیے رہی تھی۔ کئی پلان بنتے، کئی ٹوٹتے، میں چلی جا رہی تھی۔

کہتے ہیں! انسان جن سوچوں میں مگن ہو راستے بھی وہی دِکھتے ہیں۔ بے دھیانی میں مجھے ٹھوکر لگی اور میرے ہاتھوں سے کتابیں چھوٹ گئیں۔ کتابیں سڑک پہ بکھری پڑی تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں گھمائی اور جلدی جلدی کتابیں اُٹھانے لگی۔ کتابیں اُٹھائی تو ایک اشتہار نما پیپر بھی میرے ہاتھ لگ گیا۔ جو شاید سڑک کنارے اُڑتے اُڑتے یہاں تک پہنچا تھا۔

میری نظریں اُس کاغذ پہ جم گئیں۔ کاغذ کیا تھا میری منزل تھی۔ خود کو محبوب کی بانہوں میں جھولتا دیکھنے لگی۔ اُس پیپر پہ تحریر ہی کچھ ایسی تھی۔ کسی عامل نے اپنے عمل کے دعوے کیے تھے۔ من پسند شادی محبوب قدموں میں، شوہر غلام بنا دوں گا۔ ناراضگیاں ختم، راستے کی رکاوٹیں ریت کی دیوار ثابت ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔

مجھے کسی اور بات میں دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو من پسند محبوب چاہتی تھی۔ جس کو چاہا تھا اُسے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ میں پاگل ہو گئی تھی۔ اک نشہ سا سوار ہو گیا تھا۔

اشتہار پہ عامل بابا کا نمبر درج تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عامل بابا کا نمبر ملا دیا۔ تیسری گھنٹی پہ کال ریسیو ہو گئی۔ رُعب دار بھاری آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ عامل بابا نے تسلی دیتے ہوئے آستانے پہ بلایا۔ میری آنکھوں میں نشے کی خماری تھی۔ میں اگلے روز کالج جانے کی بجائے عامل بابا کے پاس پہنچ گئی۔

☆......☆

لوگوں کا کثیر ہجوم تھا۔ مرد و زن اپنی اپنی مرادیں مانگ رہے تھے۔ میں لوگوں کا اتنا رش دیکھ کر اُس کی گرویدہ ہو گئی۔ عامل بابا حجرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ لوگوں کے ہجوم سے ایک فریادی اندر جاتا اور دوسرے راستے سے نکل جاتا تو پھر اور فریادی

اپنے ساتھ تین لڑکیاں گروپ میں شامل کیں اور باقی کو بیرک میں رہنے کا کہہ دیا۔
شام کو کھانے کا وقت ہوا۔ سبھی کو کھانا دیا گیا۔ کھانے کے وقت بیرک کا گیٹ کھلا تھا۔ دربانوں کے اندر داخل ہوتے ہیں ہم نے بھرپور حملہ کر دیا۔ دربان اس حملے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ہم انہیں ختم تو نہیں کر سکتی تھیں لیکن مار مار کر ادھ موا ضرور کر دیا تھا۔ اس حملے کے دوران ہم چاروں لڑکیاں وہاں سے نکل گئیں اور باقی لڑکیوں کو اُن کے ساتھ مقابلہ کرتے رہنے کا حکم دیا تھا۔
تہہ خانے تک پہنچنے تک بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری اور ڈٹ کر مقابلہ کرتی گئیں۔ آخر ہم تہہ خانے تک پہنچ گئیں۔ بہت سی مورتیاں سجی ہوئی رکھی تھیں۔ اُن میں ایک مورتی سب سے بڑی تھی اور اُسے خوب سجایا گیا تھا۔ میں بڑی مورتی کی طرف بڑھی اور باقی تینوں سہلیاں چھوٹی مورتیوں کے ساتھ انصاف کرنے لگیں۔
چھوٹی مورتیوں میں دربانوں، اُس کے غلام کی جانیں قید تھیں اور جونہی تینوں نے مورتیاں توڑنی شروع کیں۔ عجیب سا شور برپا ہوا۔ اتنے میں، میں بڑی مورتی تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے پتھر اُس کی طرف مارنا چاہا تھا کہ ایک بہت بڑا سانپ نمودار ہوا۔ وہ وحشیانہ انداز میں میری طرف بڑھا۔ مجھے ڈسنا چاہتا تھا لیکن کوئی چیز اُس کے درمیان حائل تھی جو اُسے روکتی تھی۔ تب تب مجھے خیال آیا کہ میرے پاس تو دو تعویذ تھے، ایک قبر میں دفن کرنا تھا دوسرا اپنے پاس رکھنا تھا۔ وہ حفاظت کے لئے تھا اور خوش قسمتی سے میں نے قبرستان میں آنے سے پہلے اُسے اپنے دائیں بازو پہ باندھ لیا تھا۔ شاید اُسی کی وجہ سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ ورنہ ایسے حالات میں تو کئی جان سے چلے جاتے ہیں۔
یونہی مجھے یقین ہو گیا کہ میری حفاظت اُسی تعویذ کی وجہ سے ہو رہی ہے اور کوئی نادیدہ ہستی میری حفاظت کر رہی ہے۔ میرے اعصاب اور مضبوط ہو گئے اور دوسرے ہی لمحے میں نے پتھر مورتی پہ دے مارا۔ پے در پے تین چار وار کیے تو مورتی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ مورتی کے ٹکڑے ہوتے ہی بھونچال آ گیا۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں۔ تڑتڑاہٹ جلنے کی بدبو اور پتھروں کے ٹوٹنے کی آوازیں پھر زوردار طوفان آیا۔ چھوٹی مورتیاں سب ٹوٹ چکی تھیں اور بیرک والی لڑکیاں ہمارے پاس پہنچ گئی تھیں۔ سارے دربان دھواں دھواں ہو گئے تھے۔ نہ اُن کی بقایاجات ملی، نہ کچھ۔ وہ تو جنات میں سے تھے اور جنات کی بقایاجات کہاں سے آئیں۔ ابھی وہ لڑکیاں خوش خبری سنا رہی تھیں کہ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔
جب آنکھ کھلی تو میں نے خود کو بیڈ پہ پایا اور خالہ اور امی میرے سرہانے بیٹھی سر کو دبا رہی تھیں۔ میرے ہوش میں آتے ہی رب تعالیٰ کا شکرانہ ادا کرنے لگیں اور میرا ماتھا چومنے لگیں۔
''تمہیں کیا ہوا تھا بیٹا؟'' امی نے مجھے ہوش میں پا کر تجسس سے سوال کیا۔
''مجھے کیا ہوا تھا؟'' میں نے امی کا سوال دہرا دیا۔
''پچھلی رات تم کو قبرستان سے بے ہوش حالت میں گھر لائے ہیں۔ یہ تو بھلا ہو اُس گورکن کا جس نے ہمیں آ کر بتایا۔ تم جھاڑیوں کے قریب قبر پہ اوندھے منہ بے ہوش پڑی تھیں۔
''اگر تمہیں کچھ ہو جاتا ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہتے۔'' ماں کے لہجے میں مایوسی عود کرنے لگی۔
''کیا۔ کیا کہہ رہی ہیں امی؟ مجھے تو کچھ پتا نہیں۔''
وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں اور میں ساری حقیقت سے واقف تھی۔
آج میں صمد کے گھر میں خوشگوار زندگی گزار رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے تین بیٹوں اور ایک بیٹی سے نواز رکھا ہے۔ میں کیا کرنے چلی تھی اور میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ یہ صرف بکھری یادیں ہیں۔ میرے علاوہ کسی کو کچھ پتا نہیں ہے۔ میری شادی صمد کے ساتھ کیسے ہوئی۔ یہ ایک راز ہے اور راز ہر کسی پہ آشکار نہیں ہوتے۔

☆☆......☆☆

گی کہ کسی کے مضبوط ہاتھوں نے میری گردن دبوچ لی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے تپتا ہوا انگارا میری گردن پہ رکھ دیا ہو۔ میں نے سر اوپر کر کے گردن دبوچنے والے کو دیکھنا چاہا۔ جونہی میں نے اوپر دیکھا، میرے اعصاب کمزور پڑ گئے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے اور رواں رواں کانپنے لگا۔ میرے پیچھے قوی ہیکل دیو کھڑا تھا۔ موٹے بھینسے جیسی جسامت، ہاتھ پاؤں بھاری اور کالے بالوں سے اٹے ہوئے۔ اُس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اُس نے مجھے پھولوں کی طرح ہاتھوں سے اُٹھا لیا۔ میرا جسم بے جان سا ہو گیا۔ میرے رگ و پے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ میری زبان گنگ ہوئی اور آنکھیں باہر کو اُبلنے لگی تھیں۔ میں مصیبت میں پھنس چکی تھی۔ میں بے آب مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی اور اچانک رات کی تاریکی روشنیوں میں بدل گئی۔ ہر طرف سینکڑوں دیو قطاریں بنائے کھڑے تھے۔ ایسے جیسے کسی دربار میں غلام سر جھکائے کھڑے ہوں۔ وہ مسکرا رہے تھے جس کی وجہ سے اُن کے سفید دانت نظر آ رہے تھے۔ وہاں جشن کا سماں تھا۔ کئی دیو ناچنے کے انداز میں جھوم رہے تھے۔ کئی مستی میں سر دھن رہے تھے۔ کئی خوشی و مسرت کے انداز میں ایک دوسرے کے گلے مل رہے تھے۔ آپس میں کچھ کہتے جا رہے تھے جو میں سمجھنے سے قاصر تھی۔

کوئی خاص پارٹی تھی جس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دیو نے مجھے قید خانے میں قید کروا دیا اور دربان کو حکم دیا کہ وہ خاص ہے۔ اچھی طرح خیال رکھنا اور میں کل جب واپس لوٹوں گا تو بڑی دھوم دھام سے شادی کروں گا۔ یہ لڑکی مجھے بہت پسند ہے۔ میں اس پہ مرمٹا ہوں۔ یہ دوسری لڑکیوں سے ہٹ کر ہے۔ یہ میری ہم سفر بنے گی۔ اس لئے تمھیں اس کا خاص خیال رکھنا ہو گا اور ہاں جو کام ذمہ لگایا ہے وہ میرے آنے سے پہلے ہو جانا چاہیے۔''

حکم صادر کرتے ہی وہ دیو وہاں سے غائب ہو گیا اور دربان میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ میری طرح اور بھی کئی لڑکیاں وہاں قید تھیں۔ اور ایک سے بڑھ کر ایک حسین تھیں۔ اُن کی کہانیاں بھی مجھ سے ملتی جلتی تھیں۔ کالا دیو ہر کسی لڑکی سے شادی کا خواہش مند تھا لیکن سبھی نے انکار کر دیا تھا۔ اِس لئے سبھی قید کی صعوبتیں برداشت کر رہی تھیں۔

دیو کا کہنا تھا جس لڑکی نے مجھ سے شادی کی حامی بھر لی وہ زندہ سلامت رہے گی باقی تمام لڑکیوں کو شادی والے دن موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔ سبھی زندگی سے مایوس ہو چکی تھیں اور موت کو سرہانے دیکھتی تھیں۔ قید کی صعوبتیں جھیلتے جھیلتے حوصلے چھوڑ چکی تھیں اور کبوتر کی طرح موت کا انتظار کر رہی تھیں۔ کبوتر بھی بلی کو دیکھ کر آنکھیں موند لیتا ہے۔

دربان مجھے خاص مہمان سمجھ کر خدمت کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ دربان میرے والی بیرک پہ پہرا دیتا تھا۔ جس کے ذمے دیو کام سونپ گیا تھا۔ کام کیا تھا مجھے پتا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں چند اور دربان اُس کے پاس اکٹھے ہوئے اور گفتگو کرنے لگے۔ وہ گیٹ کے پاس کھڑے تھے اور اُن کی الفاظ میں با آسانی سن سکتی تھی۔ ایک کہہ رہا تھا۔

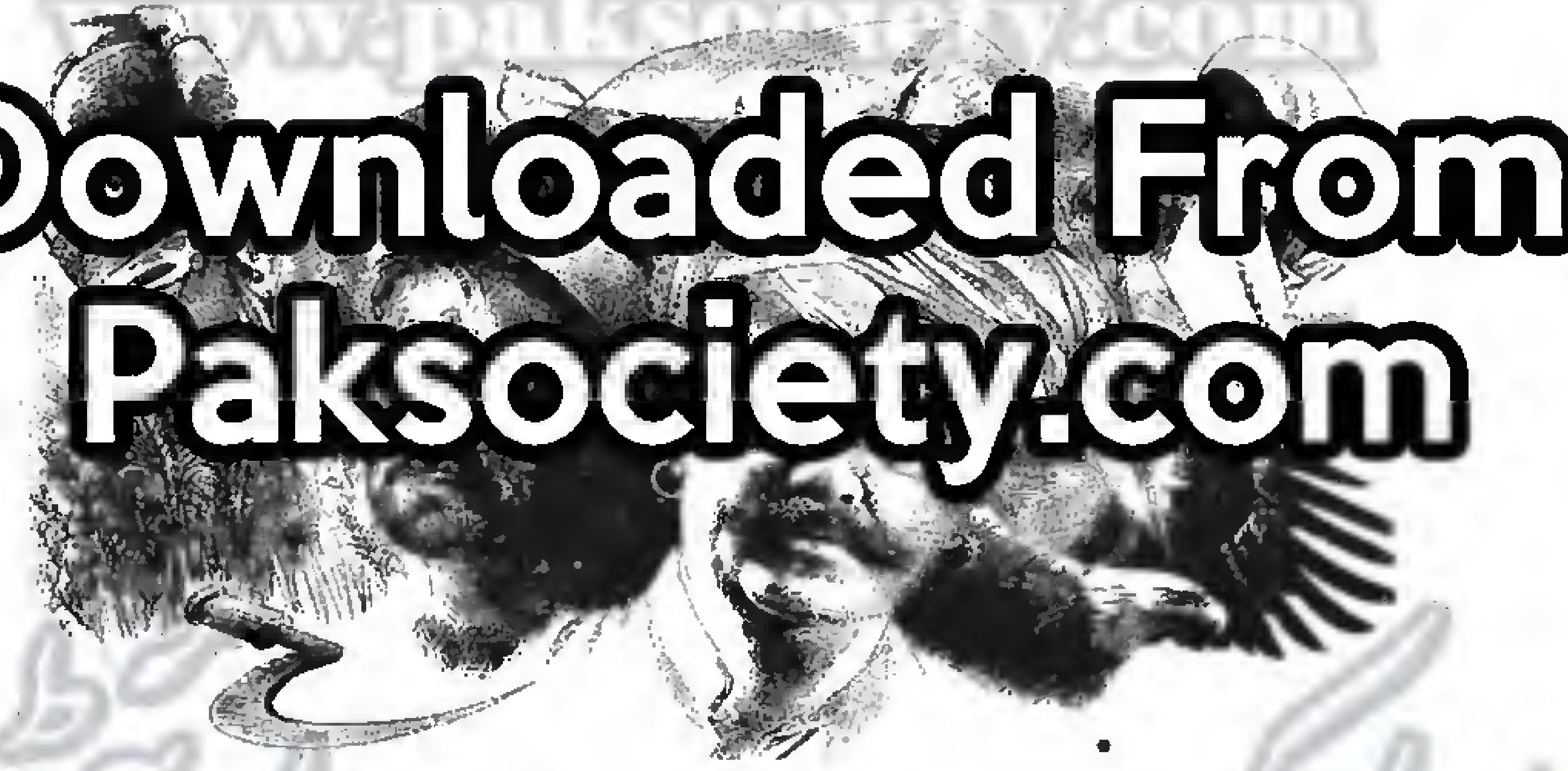
''شگوف! تہہ خانے والی مورتیوں کو غسل دینا ہے۔ سردار کا حکم ہے۔ اور اُن کی شادی کے بعد وہ مورتیاں دیکھیں گے۔''

''کون سی مورتیاں۔ شورے!''

''یار وہ جو تہہ خانے میں سب سے آخری کمرے میں ہیں۔ اُن میں جو سب سے بڑی مورتی ہے۔ اُسی میں سردار کی جان ہے۔ مورتیوں کو پچاس سال ہونے کو ہیں۔ پچاس سال بعد ہی اِن کو غسل دیا جاتا ہے۔ صبح سردار لڑکی سے شادی کر کے اُس مورتی کو دیکھے گا اور پھر جشن منایا جائے گا۔''

''اچھا؟ اچھا چلیں کرتے ہیں صفائی ستھرائی۔''

میں اُن کی ساری گفتگو توجہ سے سن چکی تھی۔ اب مجھے اُس مورتی تک پہنچنا تھا جس میں اُس کالے دیو کی جان تھی۔ خود بھی آزاد ہوتی اور دوسری قیدی لڑکیوں کو بھی آزاد کروا سکتی تھی۔ میں نے سبھی لڑکیوں کو اپنے پلان میں شریک کر لیا۔ اُمید کی کرن پا کر سبھی کے چہرے پہ خوشی کے تاثرات چھا گئے۔ میں نے



اور......اور......یہ سب کچھ۔

''ایک طرف سمیرا کے بارے میں یہ سن کر دل بہت دکھی ہو رہا تھا تو دوسری طرف میں سنجیدہ کو لے کر پریشان تھا۔ جہاں تک میرے علم میں تھا میرے بابا نے میری چاچی ''غفور چاچا کی بیوی'' پر غلط نظر رکھی تھی جس پر بابا اور چاچا کو جھگڑا ہوا اور دونوں میں دشمنی ہوئی۔ غفور چاچا ہم لوگوں کا گاؤں چھوڑ کر پاس والے گاؤں میں چلا گیا اور کچھ عرصے بعد سنا کے چاچی نے اپنی ایک سالہ بیٹی کو چھوڑ کر خودکشی کر لی مگر اس وقت بھی بابا اور اماں غفور چاچا سے نہیں ملے اور اتنے عرصے بعد آج غفور چاچا کی بیٹی سے میری شادی ہونے جا رہی تھی۔ یہ تو گھر جا کر پتا چلنا تھا کہ بابا اور غفور چاچا کیسے ملے؟

☆......☆

''دسمبر کی وہ سرد ترین ٹھٹھرتی ہوئی رات تھی جس رات میں نے گاؤں کے لیے رخت سفر باندھا۔ حالانکہ میرے دوستوں نے مجھے منع بھی کیا تھا کہ گاؤں کا راستہ خطرناک ہے۔ رات کا سفر مشکل ثابت ہوگا۔ مگر نہ جانے میرے دل میں کیا سمایا کہ میں نے اس وقت سفر کا سوچا۔ شہر سے گاؤں تک آنے میں تین گھنٹے کا سفر تو تھا پھر مین راستے سے میرے گھر جانے میں بھی اچھا خاصا وقت لگ جاتا تھا۔ درمیان میں قبرستان اور دور پرانا کھنڈر جیسا مندر بھی پڑتا تھا۔ میں نے شہر سے شادی کے لیے لیا ہوا مختصر سامان بیگ میں ڈالا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ بس میں بیٹھا سارا راستہ میں سمیرا کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔

جب میں سڑک پر اترا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ سرد ہوائیں اور گاؤں کی کھلی فضا کے ٹھٹھرتے ماحول نے میرا استقبال کیا۔ بس سے اترتے ہی میری رگوں میں برف جیسی ٹھنڈک اتر گئی۔ گرم کمبل کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر میں نے بیگ کاندھے پر ڈالا اور گھر کی جانب جانے والی پگڈنڈی پر تیز تیز چلنے لگا۔ چلتے چلتے مجھے احساس ہوا کہ واقعی میں نے اس وقت آنے کا فیصلہ کر کے غلطی کی ہے۔ میں اس اندھیری رات میں سنسان راستے پر چلنے لگا۔ گاؤں میں ویسے بھی رات جلد ہو جاتی ہے۔ اور سردیوں میں تو ویسے بھی لوگ سرشام گھروں میں دبک جاتے ہیں۔ راستے اور گلیاں سنسان ہو جاتی ہیں۔ میں تیز تیز چل رہا تھا تب مجھے محسوس ہوا کہ میرے ساتھ ساتھ کوئی میرے قدم سے قدم ملا کر چل رہا ہے۔ انجانے قدموں کی چاپ محسوس کر کے میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر اندھیری رات میں اپنے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیا کبھی کبھی چاند بادلوں کی اوٹ سے نکلتا تو ہلکی سی روشنی ہو جاتی۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ دفعتاً مجھے لگا جیسے

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5 / 79 ڈاکخانہ 5.L / 78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com



تیسری ہولناک کہانی

گاؤں والا مندر

نزہت جبیں ضیاء

رشتوں کو روندنے والے اس چاچا کا قصہ جس نے اپنے بھتیجے پر کالا علم کرا کر موکل چھوڑ دیے تھے

اماں کے فون نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اب جب کہ میری شادی ہونے والی تھی تب ہی اماں نے یہ کیا انکشاف کر دیا تھا کہ سمیرا پر آسیب کا سایا ہو گیا ہے۔ وہ بالکل بھی اپنے آپ میں نہیں۔ اس کے اندر کوئی طاقت داخل ہو چکی ہے جس نے اس کو اپنے بس میں کر رکھا ہے اور میں نے تمہارا اور سمیرا کا رشتہ ختم کر دیا ہے۔''

''ارے اماں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ صبر کرتیں۔ کسی عامل کو بلوا کر ہم اس کا علاج کروائیں گے۔ سمیرا اور میں بچپن سے منسوب ہیں اور اس طرح سے اس سے رشتہ کر دینا اچھی بات نہیں۔ میں گاؤں آرہا ہوں ہم مل کر اس کے لیے کچھ کریں گے۔''

''پاگل مت بن پتر! تو ہمارا اکلا کلا پتر ہے اور میں اپنے پتر کی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتی اور ہاں تو پریشان نہ ہو میں نے تیرے لیے چاچے غفور کی بیٹی سنجیدہ کو پسند کر لیا ہے۔ تیری شادی وقت پر ہو گی پتر مگر...... سمیرا سے نہیں بلکہ سنجیدہ سے۔''

''ارے اماں! چاچے غفور سے تو بابا کا جھگڑا تھا سالوں سے اور...... اور...... میں نے سنجیدہ کو دیکھا بھی نہیں۔'' میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

''پتر بس جو فیصلہ میں نے اور تیرے بابا نے کر لیا وہی صحیح ہے ہاں تیرے بابا اور غفور کی آپس میں بات ہو گئی اور سنجیدہ بہت خوب صورت ہے بالکل چاند کے جیسی۔ بس تو سمیرا کو بھول جا آگئی سمجھ۔'' اماں نے کتنی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی۔ برسوں سے سمیرا کو ہی اپنا ہمسفر سوچا تھا اور اب جب کہ شادی میں کچھ دن رہ گئے تو اماں نے یہ خبر سنا دی۔ اس وقت چھٹی ملنا بھی مشکل تھا۔ اور اماں کی بات بھی ہمیشہ سے پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔

''میں توصیف احمد اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ہم لوگ اندرون پنجاب کے چھوٹے سے گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ میرے بابا نے کھیتی باڑی کر کے مجھے مشکل سے میٹرک تک تعلیم دلوائی۔ قسمت اچھی تھی کہ شہر میں مجھے ایک آفس میں معمولی جاب مل گئی۔ میری خالہ کی بیٹی سمیرا جو ہمارے گاؤں میں ہی رہتی تھی۔ اس سے بچپن سے میرا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ اماں، بابا کو میری شادی کا بڑا ارمان تھا اور اب میری شادی میں کچھ دن باقی تھے تو اماں نے یہ کیسی خبر سنا دی تھی۔ اگلے ہفتے تو مجھے چھٹی لے کر گاؤں آنا تھا۔ شادی کے لیے

تر نگا جس کے وجود سے وہی غلیظ بد بو آ رہی تھی جو تھوڑی دیر پہلے میں نے محسوس کی۔ دوسری جانب سنجیدہ کی جگہ...... اف خوف سے میری گھگھی بندھ گئی اتنی خوفناک عورت یقیناً وہ چڑیل تھی۔ قصے کہانیوں میں پڑھ کر اور سن کر جو دماغ میں چڑیل کا نقشہ تھا بالکل وہی لمبے لمبے بال خوفناک بڑا سا چہرہ لال انگارہ باہر کو نکلی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، لمبے لمبے دانت آگے کو نکلی ہوئی غیر معمولی تھوڑی، لمبے لمبے ناخن اور منہ سے بہتا ہوا خون میری رگوں میں خوف منجمد ہو گیا۔ اتنی سرد رات میں میرا سارا وجود پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں نے دل میں قرآنی آیات پڑھنا شروع کر دیں۔

''آؤ باراتیو! دیکھو آج ہماری شادی ہے یہ دولھا ہے۔ منتر پڑھو۔''

وہ خوفناک چڑیل آگے بڑھی اور میرا ہاتھ اپنے سخت کھردرے اور غلیظ ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ دفعتاً میں نے دیکھا کہ چاروں طرف سے چھوٹے چھوٹے قد کے بونوں جیسے انسان نکل آئے ویسے ہی خوفناک چہروں والے جنہوں نے آتے ہی عجیب و غریب آوازوں میں چیخنا شروع کر دیا ساتھ ہی رقص کرنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا بدشکل آدمی جو کونے میں بیٹھا تھا اس کے پاس بے شمار کھوپڑیاں رکھی تھیں لمبی داڑھی والا وہ خوفناک بوڑھا ہاتھ میں لمبا سا خنجر لیے زور زور سے کوئی عمل پڑھ رہا تھا اس کے چمکتے خنجر سے خون ٹپک رہا تھا۔ جیسے ابھی ابھی کسی کو قتل کیا ہو اس کے سامنے ہی تڑپتی ہوئی کھوپڑیاں نظر آ گئیں۔

''چلو ادھر آؤ'' وہ خوفناک چڑیل میرے مزید قریب آ گئی اچانک ایسے لگا جیسے زلزلوں کے جھٹکے آ رہے ہوں بوسیدہ دیواریں لرزنے لگیں خوفناک بونوں کی چیخوں میں مزید اضافہ ہو گیا پھر دیواروں سے خون رسنے لگا جیسے کہ پسینہ آتا ہو۔ ہر طرف خون ہی خون دکھائی دینے لگا۔ یہاں تک کہ میرے پیر بھی خون کے اندر دھنسنے لگے مجھے گھسیٹ کر وہ عورت خنجر والے بوڑھے کی طرف لانے لگی میں نے اپنی پوری قوت سے خود کو روکنے کی کوشش کی دفعتاً وہ بوڑھا جو غفور چاچا بن کر ملا تھا۔ اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ میں زمین پر پھیلے ہوئے خون میں لت پت ہونے لگا۔ ہر طرف پھیلی خون کی ناقابل برداشت بد بو سے میرا دل الٹنے لگا درد کی شدت کو برداشت کرنا ناممکن لگ رہا تھا میں پوری آواز سے آیت الکرسی پڑھنے لگا۔ مجھے گھسیٹ کر خنجر والے بدشکل بوڑھے کے سامنے پھینک دیا گیا۔ چڑیل میرے سینے پر آ بیٹھی اپنے نوکیلے اور تیز ناخن میرے اندر گاڑ دیے۔ میرے منہ سے ہولناک چیخ نکلی مگر میں برابر آیت الکرسی پڑھتا رہا پھر میری آنکھوں نے نہایت اذیت ناک اور وحشت ناک منظر دیکھا میرے بابا اور اماں دونوں کی لاشیں میرے سامنے پڑی تھیں جیسے ابھی ابھی قتل کیا گیا ہو دونوں کے سر تن سے جدا تھے اور تازہ تازہ ٹپکتا ہوا خون دیکھ کر میں آپے سے باہر ہو گیا میں چیخنے لگا۔

''تم لوگ کون ہو؟ کیوں مارا میرے اماں بابا کو؟ آخر ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''ہاہاہا۔'' خنجر والے بوڑھے نے قہقہہ لگایا ساتھ ہی دوسرا بوڑھا وہ چڑیل اور وہاں موجود بونے بھی قہقہے لگانے لگے۔ پورا عالم، دیواریں، زمین اور ہر طرف سے خوفناک اور موت کے کھیل میں جو کچھ دیکھ رہا تھا میرے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔ پھر اچانک سب کچھ ساکت ہو گیا۔ قہقہے تھم گئے ماحول پر سکوت سا چھا گیا اور وہ چڑیل جو میرے سینے پر بیٹھی تھی مجھ پر جھکتی چلی گئی۔ اس کے نشتر جیسے ناخن میرے بازوؤں میں پیوست تھے اور اس کے لمبے لمبے دانت میری گردن کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے خود کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر سب بے سود۔ سب ناکام ہو چکی تھیں اس غیر انسانی وجود نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ بس میرے لب پر آیۃ الکرسی تھی اور میں بے بس ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے کانوں جیسے لمبے لمبے دانت میری گردن میں پیوست کر دیے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے آگ کے جلتے ہوئے انگارے میری گردن سے ہوتے ہوئے میرے پورے جسم کے اندر تک پھیلتے چلے گئے میں لاغر ہوتا گیا اور ساتھ ہی مجھے لگا جیسے میرا دم آخر آ پہنچا۔

☆......☆

میرے کانوں میں مچھر جیسی بھنبھناہٹ ہو رہی ہے میں نے سر پر اونی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ بے ساختہ میرا ہاتھ کانوں کی جانب گیا میں نے آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا قبرستان کے ساتھ ہی گورکن کا بنا چھوٹا سا مکان بھی مکمل اندھیرے کی لپیٹ میں تھا جب کہ دور مندر میں دیا جلتا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کبھی بھی اس مندر میں دیا جلتا ہوا نہیں دیکھا گیا۔ مندر کیا تھا ٹوٹا پھوٹا اور آسیب زدہ سا کھنڈر لگتا تھا۔ کبھی کبھی بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ اگر اس طرف آتا تو اماں سے بڑی مار کھاتا تھا۔ ٹوٹی ہوئی دیواروں اور بنا چھت کا یہ مندر اور اس میں جلتا زرد سا دیا عجیب سا ماحول بنا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے جھرجھری سی آگئی۔ میری رفتار مزید تیز ہوگئی۔ دفعتاً مجھے لگا میرے قدم زمین نے جکڑ لیے ہوں۔ میں نے قدم بڑھانا چاہا مگر...... لاکھ کوشش کے باوجود بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ تب میں نے دیکھا میرے ساتھ ایک آدمی کھڑا ہے میں نے گھبرا کر آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کی پیلے رنگ کے لمبے سے چغے میں ملبوس کمزور اور ضعیف سا شخص تھا۔ جس کے گال پچکے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کے پتلے سیاہ اور لمبوترے چہرے پر عجیب قسم کی دہشت تھی۔

''آپ...... آپ کون ہیں؟'' میرے سوال پر وہ زور سے ہنسا۔

''مجھے نہیں پہچانا پتر میں تیرا چاچا غفور ہوں۔ تیرے بابے نے مجھے تجھ کو لینے کے لیے بھیجا ہے۔''

''غفور چاچا آپ......'' میں اس بوڑھے سے لپٹ گیا مگر دوسرے لمحے میں نے اس کو خود سے الگ کردیا۔ اس کے جسم سے عجیب قسم کی غلیظ بدبو آرہی تھی۔ قابل برداشت بدبو۔

''مگر میں تو اچانک آیا ہوں اور اس وقت بابے کو کیسے پتا چلا؟'' میں نے سوال کیا۔

''باتیں چھوڑ پتر جلدی جلدی چل تیری ماں اور بابا انتظار کررہے ہیں۔'' بوڑھے نے میری بات نظر انداز کی اور میرا ہاتھ تھام کر تیز تیز چلنے لگا۔ جیسے ہی اس نے میرا ہاتھ تھاما مجھے لگا جیسے میرا ہاتھ کسی آہنی شکنجے کی زد میں آگیا ہو۔ میرا ہاتھ بہت بھاری ہوگیا تھا۔ تو اس سے پہلے کہ میں اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتا میرے دوسرے ہاتھ کی طرف بھی مجھے کسی کا احساس ہوا دیکھا تو ایک خوب صورت سی لڑکی تھی۔ سفید اور کالے لباس میں، کالا دوپٹہ سر پر ڈالے ہوئے تھی۔ دوپٹے کے نیچے سے نظر آتے ہوئے لمبے لمبے بال جن میں چمک نمایاں تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ جو اندھیرے میں بھی واضح نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے میں عجیب سی کشش تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور میں...... میں اس کے سحر میں بے خود ہونے لگا تھا۔

''چاچا یہ...... یہ کون ہے؟'' میں نے پلٹ کر بوڑھے سے سوال کیا۔

''ارے بھئی! میری بیٹی ہے سنجیدہ دیکھ یہ بھی آگئی تجھے لینے۔ چل جلدی سے گھر چلتے ہیں۔''

''واہ! اماں نے صحیح کہا تھا۔ سنجیدہ واقعی خوب صورت تھی۔ مگر اس وقت چاچا کو سنجیدہ کو لے کر یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں یہ سوچنے لگا تب مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہوں۔ میرا وجود ہوا میں معلق ہوگیا ہو اور میں بالکل ہلکا سا ہوگیا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر زمین کی طرف دیکھا تو خوف وحشت سے میری آنکھیں پھٹنے لگیں۔ ہلکی چاندنی میں مجھے زمین پر رینگتے بے شمار چھوٹے بڑے سانپ نظر آرہے تھے۔ میں اس وقت اکیلا تھا۔ نہ جانے غفور چاچا اور سنجیدہ کہاں چلے گئے تھے۔ وہ مندر پرانا ویران اور کھنڈر جیسا مندر جس کے پاس سے گزرتے ڈر محسوس ہوتا تھا میں اسی مندر کے اندر کھڑا تھا۔ بنا چھت اور ٹوٹی ہوئی بوسیدہ دیواروں والے مندر میں میں کیسے پہنچا میرا دماغ ماؤف ہونے لگا میری چھٹی حس نے خبردار کیا۔ میں، میں کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوچکا تھا۔

''چاچا، چاچا میں نے آواز لگائی۔

''ہاہاہا'' خوفناک قہقہے کی آواز پر گھبرا کر آواز کی سمت دیکھا تو ایک عجیب وغریب منظر میرا منتظر تھا۔ غفور چاچا کی جگہ ایک خوفناک شکل والا آدمی کھڑا تھا۔ کالا سیاہ لمبے لمبے چمکیلے دانت، بڑے بڑے ہاتھ اور لمبا



چوتھی ہولناک کہانی

خواب کے زخم



صداقت حسین ساجد

اُس ڈاکٹر کی دہشت ناک چتا، جو اک ایسے جن جوڑے کے ہتھے چڑھ گیا جس کی دوا تازہ بتازہ خون تھی

کافی دیر سے جاری موسلا دھار بارش نے اب طوفان کی شکل اختیار کرلی تھی۔ لگ تو یوں رہا تھا کہ یہ بارش کا طوفان رکنے والا نہیں ہے۔ بار بار آسمانی بجلی کے کڑکنے سے کچھ دیر کے لیے ہر طرف روشنی ہو جاتی



آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو گھر کے کھلے صحن میں چار پائی پر پایا۔ ذہن میں سب کچھ آ گیا۔ مجھے لگا شاید میں مر گیا ہوں۔ تب ہی اماں اور بابا کو خود پر جھکا دیکھا۔ اماں کی آنکھ سے آنسو میرے گالوں پر گرا تھا۔

''پتر......! میرا پتر تو ٹھیک ہے ناں۔ طبیعت خراب تھی تو کیوں آیا تھا پتر۔ اتنا تیز بخار ہے تجھے راستے میں مندر کے پاس بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ تو اتفاق سے تیرا بابا وہاں چلا گیا ورنہ تو میرا پتر نہ جانے کب تک پڑا رہتا۔'' اماں دیوانہ وار مجھے چومتی ہوئی پیار کرتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔

''اُف وہ سب کیا تھا؟'' میں نے اپنے پھوڑے کی طرح دکھتے بازو کی طرف دیکھا۔ وہاں پر واضح زخم کے نشان اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ سب کچھ میرے ساتھ ہوا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

''پتر لیٹا رہ! ابھی تو بخار ہلکا ہوا ہے تیرا۔'' بابا نے مجھے لٹاتے ہوئے کہا۔

''اماں......اماں......رات کو غفور چاچا......''

''نام نہ لے بیٹا اس کم ذات کا۔ اس نے دشمنی بھی کی تو ایسی کہ اسے بھائی کہتے شرم آتی ہے۔''

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی بابا نے مجھے روک دیا۔ ''اچھا ہوا ناں برے کا انجام برا ہی ہونا تھا۔ توصیف کے بابا دیکھو اللہ نے کیسا بدلہ دیا۔ اس کو کیسی موت ملی ہے خدا دشمن کو بھی ایسی بد موت نہ دے توبہ توبہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' اماں کی بات پر میں اچھل گیا۔ یہ بابا اور اماں کیسی باتیں کر رہے تھے۔

''ہاں دونوں باپ بیٹی جہنم رسید ہو گئے توصیف کی ماں! دیکھو ایک معصوم کے ساتھ زیادتی کر کے کیا ملا۔ رسوائی بھی اور ذلت والی موت بھی۔''

''باپ اور بیٹی!'' میں پلنگ سے اچھل کر گرتے ہی والا تھا۔ ''ابھی رات کو تو مجھے دونوں ملے تھے لیکن......!'' میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''چپ کر جا توصیف کی ماں دیکھ تو توصیف کی طبیعت خراب ہے۔ ہم بعد میں بتائیں گے۔'' بابا نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے اماں کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔

''نہیں نہیں بابا...... میں ٹھیک ہوں مجھے ابھی بتائیں کہ کیا ہوا تھا اور یہ غفور چاچا والی کیا بات ہے اور......کیا ان کی موت ہوئی؟ اماں نے تو مجھے کچھ اور بتایا تھا۔''

''ہاں پتر ہم غلط تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ غفور کے دل میں ہم سب کے لیے اتنی نفرت ہے اور وہ اتنا گر جائے گا۔ وہ ہم سے ملا بھی تو اس کے پیچھے اس نے بہت خوفناک اور خطرناک منصوبہ بنا رکھا تھا اس نے برسوں پرانی دشمنی یوں نکالی کہ سمیرا پر پہلے غلط عمل کروا کر اس پر جنات کو قابض کروا دیا اور پھر تیرے لیے اپنی بیٹی کا پیغام دے دیا۔ سمیرا کی حالت اتنی خراب تھی کہ ہم نے رشتہ توڑ کر سنجیدہ سے تیری شادی طے کر دی۔ سمیرا کے باپ نے شہر سے کسی عامل کو بلوا کر عمل کروایا تو پتا یہ چلا کہ یہ کسی نے گندا عمل کروایا ہے اور دو دن پہلے غفور پرانے بند مندر کے پاس بیٹھا اپنی بیٹی کے ساتھ آخری عملیات کر رہا تھا کہ وہ عامل صاحب وہاں پہنچ گئے۔ گاؤں کے اور لوگ بھی ساتھ تھے، میں بھی تھا۔ وہاں پر عامل صاحب اور غفور کا ٹکراؤ ہو گیا اور اس کا سارا عمل الٹا ہو گیا اور سب نے دیکھا کہ اس وقت غفور اور اس کی لڑکی سنجیدہ تڑپ تڑپ کر خون کی الٹیاں کر کے مر گئے۔ ہم نے سوچا تو آئے گا تب ہی تجھے سچائی بتائیں گے۔''

''اُف!'' میں نے سر تھام لیا۔ ''مطلب غفور چاچا اور سنجیدہ کی روح بھٹک رہی تھی۔ ان کو سکون نہیں ملا تھا اور ملتا بھی کیسے ایسے لوگوں کا تو انجام ہی یہی ہونا چاہیے۔

میں نے سوچ لیا کہ شادی کے بعد اماں، بابا اور سمیرا کو لے کر شہر ہی چلا جاؤں گا۔ اصل بات میں جان بوجھ کر چھپا گیا تھا۔ کیونکہ اماں نے کہا تھا کہ آج پھر شہر سے وہ بزرگ آئیں گے اور ہم سب کے لیے حفاظت کے تعویذ لائیں گے۔ مجھے تو سب سے زیادہ اللہ پر بھروسا ہے کہ وہ مارنے والے سے بہت بڑا ہے مجھے اس نے ہی بچایا ہے۔ ورنہ اب وہ گاؤں والا مندر تو چاچا غفور اور سنجیدہ نے اپنی گندی آتماؤں سے آباد کر ہی لیا تھا۔

☆☆☆

نہیں ہوا۔''

ڈاکٹر ظہور کے ذہن میں ابھی تک اس کا وہ جملہ گونج رہا تھا۔

''ہمیں آپ کی اشد ضرورت ہے۔''

اندھیرے کی وجہ سے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک بار پھر بجلی زور سے کڑکی، تو کچھ دیر کے لیے ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ ڈاکٹر ظہور نے اس آدمی کو دیکھا، تو اس کا دل ایک بار پھر ان جانے خوف سے لرزنے لگا۔ اسے یوں لگنے لگا کہ آج کی رات اس کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوگی۔ وہ حیران تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، حالاں کہ پہلے بھی وہ کئی بار اجنبیوں کے ساتھ دور دراز کے علاقوں میں آدھی رات کو بھی جا چکا تھا، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، جو آج ہو رہا تھا۔

بیس منٹ کے بعد وہ اس سفید مکان کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ دروازے کے قریب ایک درخت تھا۔ ڈاکٹر ظہور نے اس کے نیچے اپنی کار کھڑی کی اور اپنا بیگ اٹھا کر اس شخص کے ساتھ مکان کے دروازے کی طرف بڑھا۔ طوفانی بارش اسی طرح جاری تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ تیز ہوا کے جھکڑوں میں خود کو سنبھالنا بہت مشکل تھا، لیکن عجیب بات تھی کہ اس لمبے تڑنگے شخص پر اس طوفانی بارش اور ہوا کے تیز جھکڑوں کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔

دروازے پر پہنچ کر اس الو کی شکل والے شخص نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ مکان کی اوپر والی منزل سے کسی کے سیڑھیوں سے نیچے اترنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر کسی نے دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ڈاکٹر کو ایک عجیب سی ناگوار بو محسوس ہوئی۔ دروازہ جس نے کھولا تھا وہ ایک بوڑھی عورت تھی۔ اسے دیکھ کر ڈاکٹر دھک سے رہ گیا۔ بڑھیا کی شکل بھی بے حد مکروہ تھی۔ اس کے بال یوں تھے، جیسے کسی چڑیا کا گھونسلا ہو۔ اس کی حالت سے یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ صدیوں کی بیمار ہو۔

والد کے جانے بعد

تمہاری قبر پر میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اُڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا
مری آنکھیں تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک
میں جو بھی دیکھتا ہوں، سوچتا ہوں
وہ وہی ہے
جو تمہاری نیک نامی اور بدنامی کی دنیا تھی
کہیں کچھ بھی نہیں بولا
تمہارے ہاتھ میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں
میں لکھنے کے لیے جب بھی قلم کاغذ اٹھاتا ہوں
تمہیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کرسی پہ پاتا ہوں

شاعر: ندا فاضلی

ڈاکٹر کو دیکھ کر وہ مسکرانے لگی، جس سے اس کے دانت دکھائی دینے لگے۔ اس کے لمبے دانتوں کی نوکیں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے تیز دھار خنجر ہوں۔ ڈاکٹر کو گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ بڑھیا کے ہاتھ میں موم بتی تھی۔ ڈاکٹر کو ایک عجیب سی بات کا احساس ہوا، تو اس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ موم بتی پر طوفانی بارش کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا شعلہ بالکل سیدھا تھا۔ بڑھیا نے ایک طرف ہٹ کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوئے مکان کا دروازہ ایک زور دار دھماکے سے بند ہوگیا۔ مکان جتنا باہر سے بوسیدہ دکھائی دے رہا تھا، اندر سے اتنا برا نہیں تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ جس کمرے میں کھڑا تھا، وہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ اس کے ساتھ چار کمرے تھے۔ حویلی کے دروازے کے پاس ہی سے سیڑھیاں اوپر کی منزل کی طرف جا رہی تھیں۔ اس ہال میں زیادہ تر لکڑی کا سامان تھا۔ فرنیچر کافی بوسیدہ لگ رہا تھا۔ ایک طرف انگیٹھی میں

تھی۔ ابھی وہ کھانا کھا کر لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر اتنے زور سے دستک ہونے لگی کہ لگتا تھا کہ اس نے دروازہ جلدی سے نہ کھولا، تو دستک دینے والا اسے توڑ دے گا۔

"اس طوفانی بارش میں بھلا کون آ سکتا ہے؟ شاید کوئی مریض ایسا ہو جس کی حالت بہت نازک ہو۔"

یہ سوچتے ہوئے وہ اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ بجلی زور سے کڑکی اور اس کی نظر سامنے موجود درخت پر پڑی، جس کی ایک شاخ پر بیٹھا الو اسے ہی گھور رہا تھا۔ ابھی وہ الو کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اسے ایک آواز سنائی دی۔

"ہمیں آپ کی اشد ضرورت ہے...... ڈاکٹر صاحب!"

اس نے چونک کر سامنے دیکھا، تو اس کے سامنے ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر کے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ اس آدمی کا چہرہ اسے الو کی طرح لگا۔ چہرے پر کرختگی چھائی ہوئی تھی۔ اپنی طرف ڈاکٹر کو متوجہ دیکھ کر وہ ایک مکروہ مسکراہٹ اپنے چہرے پر لا کر مسکرانے لگا۔ اس کے سامنے والے اوپر کے دانت کچھ زیادہ ہی بڑے تھے۔ وہ ایک بار پھر مخاطب ہوا۔

"ڈاکٹر صاحب! میرے ساتھ چلیے...... آپ کی بہت مہربانی ہوگی...... کیوں کہ ہمیں آپ کی بہت ضرورت ہے۔"

اب جو ڈاکٹر نے مزید غور کیا، تو وہ اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا، کیوں کہ اس پر اس طوفانی بارش کا ذرہ بھر بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا لباس بالکل خشک تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے پیچھے نظر دوڑائی، تو اسے کوئی سواری دکھائی نہ دی۔ ڈاکٹر نے اس آدمی کو پہلے اس گاؤں میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنے خوف کو وہم جانا اور سر جھٹک دیا۔

"مریض کو کیا ہوا ہے؟"

"اس کا تو مجھے پتا نہیں...... لیکن وہ ہے بہت تکلیف میں۔"

اس نے اس خوف کو اپنا وہم سمجھ کر جھٹک ڈالا، لیکن دل تھا کہ عجیب سے انداز میں دھڑکے جا رہا تھا۔

"آپ تھوڑا انتظار کریں...... میں اپنا بیگ اٹھا لوں اور کار باہر نکال لوں۔"

"ٹھیک ہے...... ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر واپس پلٹا۔ اپنا بیگ اٹھایا اور اپنی کار نکال کر اس شخص کے ساتھ روانہ ہو گیا، حالاں کہ اس کا دل تو بہت کر رہا تھا کہ وہ انکار کر دے، لیکن وہ انکار نہ کر سکا۔ اس نے یہ پیشہ اپناتے ہی اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ دکھی انسانیت کے کام آئے گا اور کبھی کسی مریض کو واپس نہیں بھیجے گا۔

ڈاکٹر کا نام ظہور تھا۔ وہ تیس سال کا جوان آدمی تھا۔ اس گاؤں میں آئے ہوئے اسے ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ اس کے باقی گھر والے تو شہر میں رہتے تھے، جنھیں ملنے کے لیے وہ پندرہ دن کے بعد تین چار دن کے لیے شہر چلا جاتا تھا۔

ڈاکٹر ظہور نے راستے میں اس شخص سے پوچھا۔

"آپ کہاں رہتے ہیں، کیوں کہ آج سے پہلے میں نے آپ کو نہیں دیکھا۔"

"اس گاؤں کے باہر جو ایک سفید مکان ہے ناں!"

"ہاں! میں نے دیکھ رکھا ہے۔"

"ہمیں وہاں آئے کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔"

جس طرح کا وہ خود کرخت تھا، اسی طرح اس کا لہجہ بھی کرخت تھا۔

"لیکن وہ مکان تو کب کا خالی پڑا ہے اور ایک بات اور بھی ہے......"

"کیا بات؟"

"اس میں تو کوئی بھی رہنا پسند نہیں کرتا۔"

"اسی لیے تو ہم وہاں آ کر بس گئے ہیں۔"

"اس مکان کے بارے میں تو عجیب سی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔"

"سب جھوٹ ہے...... ہمیں تو ایسا کچھ محسوس

کی، لیکن اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اسے اندر کی طرف کھینچ سکتا۔ دروازے میں لگی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس میں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ابھی اس نے کار اسٹارٹ کی ہی تھی کہ وہ دونوں چیختے چلاتے اس کی طرف بھاگے۔ وہ یوں اس کی طرف بڑھ رہے تھے، جیسے ہوا میں تیرتے ہوئے آ رہے ہوں۔ ان کی چیخیں دل دہلا دینے والی تھی۔ ڈاکٹر کو پتا تھا کہ اگر اس بار اس نے حوصلہ چھوڑ دیا، تو بچ نہیں پائے گا۔ اس نے کار موڑ کر بھگا دی اور ساتھ ساتھ آیت الکرسی پڑھنے لگا۔ جوں ہی اس نے آیت الکرسی پڑھنی شروع کی، وہ دونوں یوں فضا ہی میں تڑپنے لگے، جیسے انھیں آگ لگ گئی ہو۔ ڈاکٹر نے پھر مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اندھا دھند اپنی کار بھگاتا رہا۔ وہ گھر کے پاس پہنچا، تو کار اس کے قابو سے نکل چکی تھی۔ ایک زوردار دھماکے سے وہ درخت سے جا ٹکرائی اور ڈاکٹر کے ہوش جاتے رہے۔

☆......☆

جب اسے ہوش آیا، تو وہ ایک نرم بستر پر لیٹا تھا۔ اس کے سامنے اس کا دوست وقاص کھڑا تھا، جو اس گاؤں میں اس کا واحد دوست تھا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''م...... م...... میں اس وقت کہاں ہوں؟''

''تم گاؤں سے قریبی شہر کے ہسپتال میں ہو۔''

''ہسپتال میں؟''

''ہاں!''

''لیکن کس لیے؟''

''حادثے کی وجہ سے تمھارا خون بہت بہہ گیا تھا۔''

''حادثہ...... کیسا حادثہ؟''

''تمھاری کار درخت سے ٹکرا گئی تھی۔''

یہ سنتے ہی اسے سب کچھ یاد آ گیا۔

''اوہ!''

''تھوڑی دیر اور ہو جاتی، تو تمھارا بچنا محال تھا...... ویسے ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی؟''

''کس بات کی؟''

''کہ اس طوفانی بارش میں تم جا کہاں رہے تھے؟''

وقاص کی بات سن کر ڈاکٹر نے اسے ساری بات بتا دی۔ یہ سب سن کر وقاص زور سے ہنس کر کہنے لگا۔

''ظہور! تم نے کوئی خوف ناک خواب دیکھا اور خوف زدہ ہو کر کار میں بیٹھ کر کہیں جانے لگے ہو گے پھر کار بے قابو ہو کر درخت سے جا ٹکرائی......''

''نہیں...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''دوست! وہ مکان تو کب کا خالی پڑا ہے۔ اب اس میں کوئی نہیں رہتا۔ تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

ڈاکٹر نے اسے یقین دلانے کی بہت کوشش کی، مگر وقاص نہ مانا۔ وقاص نے اسے اطمینان دلانے کے لیے دو بندے بھیجے، جنھوں نے واپس آ کر بتایا کہ سفید مکان تو ویسے کا ویسا بند پڑا ہے اور اندر سارے کمروں میں جالے لٹکے ہوئے ہیں۔ ہر طرف گرد ہی گرد پڑی ہے۔ اب اسے خاموش ہی ہونا پڑا۔

ڈاکٹر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ رات کو جو کچھ اس نے دیکھا ہے، وہ ایک خواب ہے، لیکن مکان کی جو حالت اب اسے بتائی گئی تھی، اس سے پتا چلتا تھا کہ واقعی اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ اسی خواب سے خوف زدہ ہو کر وہ کار میں جا بیٹھا اور یہ جان لیوا حادثہ ہو گیا۔

ڈاکٹر آہستہ آہستہ تن درست ہوتا چلا گیا۔ وہ ہسپتال سے فارغ ہو کر گھر چلا گیا۔ وہ اس واقعے کو سرے سے ہی بھلانا چاہتا تھا۔ دوسرے دن جب اس نے خود کو آئینے میں دیکھا اور اس کی نظر اپنی گردن پر پڑی، تو خوف سے لرز اٹھا۔ اس کی گردن پر اب بھی دو گہرے زخم تھے، جن میں خون جما ہوا تھا۔ یہ زخم خواب کے تو نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ اس کے ساتھ یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔

☆☆......☆☆

کوئلے دہک رہے تھے۔ انگیٹھی کے اوپر دیوار پر دو تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نے انھیں توجہ سے دیکھا، تو یہ اسی جوڑے کی تھیں۔ یہ ان کی جوانی کی تصویریں تھیں۔ اب تو وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔

بڑھیا نے ڈاکٹر کو ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خود اس شخص کے ساتھ دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ان کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھی۔ وہ بہت خوف ناک دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر نے دھڑکتے دل کے ساتھ ان سے پوچھا۔

''مہربانی کر کے مجھے بتایئے کہ مریض کون ہے......''

''اتنی جلدی بھی کیا ہے؟'' مرد نے کہا۔

''کیوں کہ مجھے اس طوفانی بارش میں واپس جانا بھی ہے۔''

اس نے اتنا کہا ہی تھا کہ یوں لگا کہ جیسے قیامت آگئی ہو۔ ہوا کے جھکڑوں نے اور تیزی اختیار کر لی۔ پورے مکان کے در و دیوار ہلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اسی دوران میں ڈاکٹر کی نظر ان دونوں پر پڑی، تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا، کیوں کہ ان کی شکلیں خوف ناک ہوتی جا رہی تھیں۔ اچانک اس کی نظر ان کے پیروں پر پڑی، تو اس کا دل ایک لمحے کے لیے تو جیسے دھڑکنا بھول گیا ہو۔ ان کے پیر پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے اور ناخن ایک ایک انچ کے قریب بڑھے ہوئے تھے۔ اسے خون اپنی رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں جواب دے گئیں۔ اس کا بس چلتا، تو وہ کب کا یہاں سے بھاگ جاتا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن اٹھ نہ سکا۔ لگتا تھا کہ کسی ماورائی طاقت نے اسے صوفے کے ساتھ جکڑ رکھا ہے۔ ڈاکٹر نے سنا کہ بڑھیا اسے مخاطب کر کے کچھ کہہ رہی ہے۔ اس نے غور کیا، تو اسے اس کے الفاظ اچھی طرح سمجھ میں آنے لگے۔ اس کی بات سن کر وہ لرز کر رہ گیا۔

''ڈاکٹر! مریض اصل میں ہم ہی ہیں اور پتا ہے......''

''کیا پتا ہے؟''

''ہماری دوا کیا ہے؟''

''کیا ہے؟''

''ہماری دوا خون ہے...... جس کے بغیر ہم زیادہ عرصہ تک نہیں جی سکتے۔''

''کیا!!!؟''

''ہاہاہا...... ہو ہو ہو...... ہی ہی ہی......''

اچانک بڑھیا بھیانک آواز میں قہقہے لگانے لگی۔ اب وہ اس شخص کے ساتھ اٹھ کر اس کی طرف بڑھنے لگی۔ لگتا تھا کہ اس میں ہلنے جلنے کی ذرا سی بھی طاقت نہ رہی ہو۔ اس نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی، لیکن وہ اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اچانک ایک دھماکا ہوا اور پورا کمرا اندھیرے میں ڈوب ہو گیا۔ ڈاکٹر کو دو سائے بالکل اپنے پاس دکھائی دیے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے بچاؤ کی کوئی کوشش کرتا، اچانک اس کی گردن میں کوئی نوک دار چیز چبھی۔ تکلیف اس قدر تھی کہ اس کے ہوش جاتے رہے اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، اس کا اسے کچھ پتا نہیں تھا۔

جانے کتنی دیر کے بعد اسے ہوش آیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ پھر اسے سب واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ اس نے دیکھا کہ کمرہ پھر روشن ہو چکا تھا۔ بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے چونک کر سامنے باہر کی طرف دیکھا، تو اچھل پڑا۔ وہ دونوں اب جوان ہو چکے تھے، جس طرح کے وہ تصویروں میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس وقت وہ اوپر والی منزل پر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ ڈاکٹر کو اپنے جسم سے سارا خون نچڑا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ انھیں شاید ڈاکٹر کے ہوش میں آنے کا پتا نہیں چلا تھا، اس لیے اس نے چپکے سے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ اٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش



ہڈیاں تڑوانے اور جان سے جانے کا شوق نہ ہو، تین منزلہ عمارت کی منڈیر پر کراٹے لڑنے یا اچھل کود کا محض سوچ سکتا تھا، عموماً یہ کام پاگل پن کی حدود میں آتے تھے۔ پھر وہ دونوں کون تھے؟ یقیناً کوئی مافوق الفطرت شے تھے کیونکہ اول اگر وہ ماموؤں کے بچوں میں سے ہوتے تو اندھیرے میں بھی میں انہیں پہچان لیتا۔ دوم یہ کہ کسی ماموں کا کوئی بچہ کراٹے نہیں جانتا تھا اور جانتا بھی ہوتا تو اتنی اونچی بلڈنگ کی منڈیر پر اتنی سرعت، اتنی مہارت سے لڑنا ناممکن تھا۔ پہلے پہل ایک لمحہ کے لیے تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ جو منظر میں دیکھ رہا ہوں، آیا یہ ایک مضحکہ خیز منظر ہے یا خوفناک؟ لیکن جب وہ دونوں کراٹے چھوڑ کے میری جانب دیکھنے لگے تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میرے جسم کے ہر خلیے میں ٹائم بم رکھ دیے گئے ہوں جو اگلے لمحے پھٹنے والے ہوں۔ اُن کے چہرے عجیب سے تھے۔ وہ میری جانب دیکھ کے قہقہے لگانے لگے اور مجھے محسوس ہوا کہ دہشت کی وجہ سے میرا دل ہڈیوں کا پنجرہ توڑ کے باہر آ جائے گا۔ میں نے بھاگنا چاہا تو ان میں سے ایک گونجتی ہوئی آواز میں بولا۔

"آؤ... ہمارے ساتھ کراٹے لڑو..."

میں نے سن رکھا تھا کہ عموماً جنات میں شرارت کا مادہ نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اور اگر وہ جن زادے تھے تو شاید وہ اس وقت میرے ساتھ بھی شرارت کرنے کے موڈ میں تھے۔

لیکن اُس لمحے مجھے بھی نہ جانے کیا ہوا کہ میں جیسے میکانکی انداز میں چلتا ہوا آگے آیا اور جست لگا کے منڈیر پہ چڑھ گیا۔ یہ یقیناً خودکشی کے مترادف تھا لیکن اس لمحے شاید میں اپنے آپ میں ہی نہ رہا تھا۔ ایک روبوٹ سا بن گیا تھا جو ریموٹ کنٹرول کے اشارے پر چلتا ہو مگر اس سے قبل کہ کھیل شروع ہوتا، میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ میں آیت الکرسی کا ورد کرنے لگا اور چھلانگ لگا کے نیچے اتر آیا اور



پانچویں ہولناک کہانی

ماہر

سید وجاہت علی

اُس نوجوان کی ناقابلِ فراموش داستان، جس نے جن کے بچوں کو جوڈو کراٹے کھیلتے دیکھا اور پھر۔۔۔۔

منظر بڑا خوفناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ میرے جسم کے سارے بال ببول کے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے اور ایک سرد لہر پورے وجود میں اوپر سے نیچے تک دوڑ گئی تھی۔

یہ مئی کا اوائل تھا اور گرمیوں نے ابھی سے اپنا اشتعال ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔ مزید برآں لوڈ شیڈنگ۔ سب زچ ہو کے ہی رہ گئے تھے۔ دن میں تو بہر حال لوڈ شیڈنگ برداشت کرنا تھی لیکن شام کے وقت یا شب میں چھت ایک اچھا آپشن تھا۔ میں ان دنوں نانی کے گھر آیا ہوا تھا۔ پیپرز دے کے فارغ ہوا تھا اور ذہنی طور پر تازہ دم ہونے کے لیے یہاں چلا آیا تھا۔ عموماً کراچی میں دن میں ہوا کچھ کچھ بند ہوتی تھی لیکن شام کے وقت جنوبی سمت میں سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا بڑی راحت بخش تھی۔ لائٹ چلی جاتی تھی تو سب چھت پر آ جاتے تھے۔ موسم اور لوڈ شیڈنگ سے پیدا ہونے والی ذہنی اور نفسیاتی تلخی بڑی حد تک دور ہو جاتی تھی۔

اُس رات وہ تقریباً ڈیڑھ بجے کا وقت تھا جب میری آنکھ کھلی۔ لائٹ جانے کی وجہ سے گرمی لگی تو میں بیدار ہو گیا تھا۔

میں اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ برابر میں لیٹے کزن کو دیکھا۔ وہ بہ دستور محوِ استراحت تھا۔ لائٹ کے چلے جانے سے اُس دھتّی کی نیند میں ذرا بھی اثر نہیں پڑا تھا بلکہ اُس کے خراٹوں کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ میں نے موبائل ٹارچ آن کی اور چھت کا رخ کیا۔ سارے زینے عبور کرنے کے بعد چھت پر قدم رکھا۔ اُس وقت کوئی بھی وہاں نہیں تھا کیوں کہ رات گیارہ بجے کے بعد لائٹ آ جاتی تھی تو سب واپس اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے۔ اُوپری زینہ چھوڑتے ہوئے اور چھت پر قدم رکھتے ہوئے میری نظر سامنے چھت کی منڈیر پر پڑی تو وہاں کا منظر دیکھ کے میں دھک سے رہ گیا تھا۔

چھت کی منڈیر پر دو لڑکے کراٹے لڑ رہے تھے۔ دونوں نے کراٹوں کا مخصوص سفید لباس پہن رکھا تھا اور جیکی چن جیسی مہارت اور ہاؤ ہو کی آوازوں کے ساتھ وہ باہم دست و گریباں تھے۔ یہ تین منزلہ عمارت کی منڈیر تھی۔ کوئی انسان کا بچہ جسے اپنی

سب سوالات اپنی جگہ تھے اور ان کا جواب معلوم کرنا بھی اہم تھا مگر یہ بات میرے نزدیک طے شدہ تھی کہ جو کچھ میں نے دیکھا' وہ نظر کا دھوکا یا خیالات کی پرفریب تجسیم نہیں تھی بلکہ فی الحقیقت ایسا ہوا تھا۔

بہرحال اس واقعے کو کئی دن گزر گئے۔ میں اپنے معمولات میں مصروف ہو گیا۔ ایام کی گرد نے واقعے کی تازگی کو کہن زدہ کر دیا تھا۔

☆......☆

لیکن پھر ایک روز ایک تعجب آمیز بات ہو گئی۔ اس رات میں اپنے دوست وقار کے کے گھر سے واپس آ رہا تھا۔ میں وقار کے گھر عموماً بائیک پر آتا ہوں لیکن دراصل اس وقت میں رات کا کھانا کھا کے گھر سے نکلا تھا۔ ارادہ چہل قدمی کا تھا' اس لیے بائیک نہیں اٹھائی تھی۔

میں وقار کے گھر پہنچا تو عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ ہم دونوں نے قریبی مسجد میں نماز ادا کی۔

ملاقات کے بعد میں نے اس سے رخصت کی اجازت لی اور واپس چل پڑا۔ اگرچہ وقار نے مجھے گھر چھوڑنے کی پیش کش کی تھی لیکن مجھے اسے زحمت دینا اچھا نہیں لگا۔

گھر تک کا راستہ پندرہ منٹ کا تھا۔ میں شارٹ کٹ لیتے ہوئے اس راستے پر مڑ گیا جہاں لوگوں کی اتنی آمد و رفت نہیں تھی۔ روشنی کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ موبائل وغیرہ چھننے کا خدشہ رہتا تھا' اس لیے راہ گیر اس راستے سے اجتناب کرتے تھے لیکن میں اس راہ پر قدم ڈال چکا تھا۔ سڑک اس وقت سنسان ہی تھی۔ اکا دکا کہیں کوئی لائٹ جلتی نظر آ رہی تھی جس کی کرنیں اندھیروں کے سامنے مغلوب ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔

جب میں سڑک کے وسط میں پہنچا تو یک بارگی بائیک کا شور سنائی دیا جو آہستہ آہستہ بڑھتا گیا یعنی بائیک اس سمت میں آ رہی تھی' جس جانب میں گامزن تھا۔

میں چلتا رہا۔ آتی ہوئی بائیک کے شور میں اضافہ ہوتا گیا۔

حکمت والا قول

ایک مرتبہ شیخ سعدیؒ بازار میں چلے جا رہے تھے کہ اچانک انہوں نے کسی کو بہترین قسم کے خربوزے فروخت کرتے دیکھا۔ ان کے دل میں خربوزے کھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ نفس نے ان سے کہا کہ کسی رشتے دار سے قرض لے کر خربوزے خرید لو، چنانچہ آپ اپنے ایک رشتے دار کے پاس پہنچے لیکن قرض مانگنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آپ نے سوچا' کہیں یہ قرض دینے سے انکار نہ کر دے۔ نفس پکارا۔ ''اگر اس سے قرض لینا نہیں چاہتے تو کسی دوسرے سے لے لو۔'' آپ کو اس کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ نفس پھر پکارا کہ چلو، کسی ایسے رشتے دار سے لے لو جو بہت قریبی ہو اور انکار نہ کرے۔ شیخ سعدیؒ اب اپنے نفس سے یوں مخاطب ہوئے۔ ''تم سے زیادہ قریبی رشتے دار میرا کون ہو سکتا ہے؟ آج تم ہی مجھے ادھار دے دو۔'' اور یوں وہ خربوزے خریدے بغیر ہی چلے گئے۔

حسنِ انتخاب: محمد قاسم خان بلوچ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

ایکا ایکی بائیک میرے برابر میں آ رکی۔ اس پر تین لڑکے سوار تھے اور پیچھے دو لڑکوں کے ہاتھ میں ریوالور تھے جو انہوں نے بڑی سرعت سے میرے پہلو میں لگا دیے تھے۔

اب ساری صورت حال واضح ہو چکی تھی۔ وہ موبائل چھیننے والے لٹیرے تھے اور میرے ساتھ بھی وہ یہی کچھ کر گزرنا چاہتے تھے۔

ان میں سے تیسرے نمبر والے نے میری جیبوں پر ہاتھ مارا اور بیچ میں بیٹھا شخص درشت لہجے میں بولا۔

"جو کچھ ہے' خاموشی سے نکال دے..." اس کے لہجے میں درشتی کے ساتھ بدتمیزی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ "ورنہ ساری گولیاں اتار دوں گا تیرے جسم میں..."

لیکن پھر اس لمحے جو کچھ ہوا' بہت عجیب تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



تیزی سے زینے کی طرف بڑھا۔ دونوں میں سے کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی لیکن ان کے وحشت ناک، اعصاب شکن قہقہے جاری تھے۔ میں نے زینے پر قدم رکھا تو ایک اور حواس کھو دینے والا منظر سامنے تھا۔ سیڑھیوں پر سے ان کی طرح کا ایک اور لڑکا یا مخلوق کراٹے کے سفید لباس میں چھت کی جانب آرہا تھا۔ مجھے نیچے کی جانب جاتا دیکھ کے وہ بولا۔

''کہاں جارہے ہو ڈیئر...؟''

اس کی آواز میں بھی ایک گونج اور وحشت سی تھی لیکن میں اسے نظر انداز کرتا' پاگلوں کی طرح اور بہت تیزی سے اس کے برابر سے گزرتا ہوا، دو دو تین تین سیڑھیاں بیک وقت پھلانگتا ہوا زینے سے نیچے آگیا۔ مجھے اس طرح جاتا دیکھ کے وہ بھی ان دونوں کی طرح ہنسنے لگا اور اُن کے پر ہول قہقہے مجھے اپنے پیچھے آتے محسوس ہوئے۔ آسمان پر ایک کے بعد ایک آتے جاتے ہلکے بھورے بادل' ان بادلوں کی اوٹ میں چھپتے جھانکتے چاند اور ستارے اور اُن مافوق الفطرت مخلوقات کے خوفناک قہقہے... بڑا وحشت ناک سماں تھا۔

میں سیدھا نیچے کمرے میں آ کے رکا۔ سانس لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں ہزار فرلانگ کا سفر دوڑتے ہوئے طے کر کے آیا ہوں۔ توپ کے دھماکوں کے شور سے بھی نہ جاگنے والا میرا کزن حیرت انگیز طور پر بیدار ہو گیا تھا۔ وہ میری اس کیفیت کو دیکھ کے متحیر رہ گیا۔

"کیا ہوا شعیب...؟؟" کاشف نے تعجب سے استفسار کیا۔ "تم ہانپ کیوں رہے ہو...؟؟"

"وہ... وہ... چھ... چھت... چھت پر..." بس میرے منہ سے اتنا ہی نکل سکا اور میں چکرا کے گر پڑا۔ ایسا لگا جیسے حواسوں پر اندھیرے چھاتے جا رہے ہوں۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

بالکل درست اندازہ تو نہیں کہ کس وقت مجھے دوبارہ ہوش آیا تاہم میرا خیال ہے کہ میں زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا تھا۔ ہوش میں آیا تھا تو سب میرے اردگرد جمع تھے اور اُن کی تشویش و تحیر سے لبریز نگاہیں مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا بیٹا شعیب...؟؟ تم نے کیا دیکھا ہے چھت پر...؟؟"

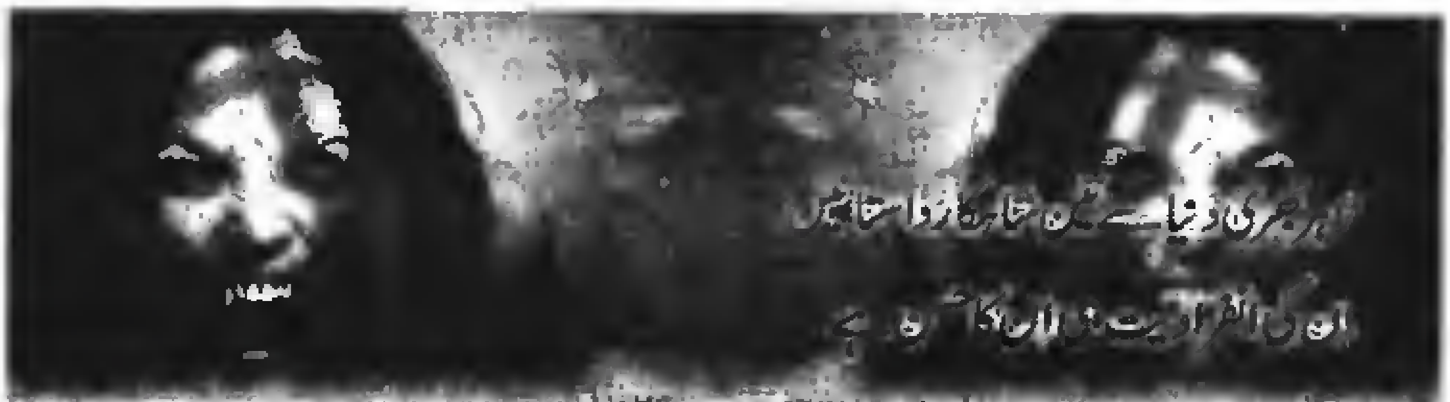
"وہ... وہ چھت پر... وہاں دو لڑکے.. تت.. تین لڑکے..." مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ مجھے اپنا جسم جلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید بخار چڑھ گیا تھا۔

"چھت پر تو کچھ نہیں ہے بیٹا..." سب سے بڑے ماموں نے میری تردید کرتے ہوئے مجھے دلاسہ دیا۔ "ہم دیکھ آئے ہیں چھت پر۔ کچھ بھی نہیں ہے شعیب بیٹا وہاں..."

لیکن میں نے انہیں دھیرے دھیرے ساری بات بتائی تو اُن سب کی فکر اور خوف میں اضافہ ہو گیا اگرچہ وہ سب اس واقعے کو میرا وہم ہی قرار دے رہے تھے اور دوبارہ کئی بار چھت کا دورہ کر آئے تھے۔ اُن میں سے کسی نے وہاں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ سب نے مجھے بھی دوبارہ چھت پر چلنے کی رائے دی تاکہ میرا ''وہم'' دور ہو جائے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ پھر اس کے بعد دو دن تک میں بخار میں مبتلا رہا۔ بخار اُترا تو میں مزید وہاں نہیں رکا اور اپنے گھر آگیا۔

☆......☆

جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا' اُسے میں ہرگز اپنا وہم قرار نہیں دے سکتا تھا لیکن اُس واقعے کی کوئی عقلی توجیہ کرنا بھی ممکن نہ تھی۔ نانی کے گھر والے وہاں عرصہ دراز سے رہ رہے تھے اور ایسا واقعہ کسی کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ ان سب نے تو اُسے میرا وہم ہی ٹھہرایا لیکن ایسا نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ فی الواقع میرا ٹکراؤ اُس غیر انسانی مخلوق سے ہوا تھا۔ وہ تینوں جن زادے تھے یا کوئی اور مافوق الفطرت مخلوق تھے؟ صرف وہ تینوں ہی وہاں بسیرا کیے ہوئے تھے یا اُن کی تعداد زیادہ تھی؟ وہ اتفاقاً یا عارضی طور پر وہاں آئے تھے یا مستقل انہوں نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا؟ یہ



زہر بھرا انتقام

بنت حوا

اولاد انسان کی ہو یا جانور کی پیاری سب کو ہوتی ہے اتفاقاً ہونے والے حادثے نے
جہاں ایک کی جان بچائی دوسرے کو موت دے دی

عشاء کی نماز ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا، ایک تو ویسے ہی اس وقت تقریباً سبھی لوگ اندھیرے کمروں میں نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں اور جو کہیں کہیں جلتے بلب کی وجہ سے تھوڑی بہت روشنی ہوتی ہے وہ بھی لوڈ شیڈنگ کی نظر ہو چکی تھی، گاؤں میں ابھی صرف چوہدری کے گھر ہی یو پی ایس کی



اس لمحے مجھ میں نہ جانے کس طرح ایک توانائی سی بھر گئی اور یہ خیال میری سوچوں میں جاگزیں ہو گیا کہ میں کراٹے جانتا ہوں اور وہ تینوں میرے ایک ہاتھ کی مار ہیں۔

میں تقریباً پانچ فٹ فضا میں اوپر اچھلا اور میری دونوں لاتیں ان دونوں کے سینوں پر پڑیں۔ یہ ان کے لیے قطعی غیر متوقع حادثہ تھا۔ ان تینوں لٹیروں کو یہ شائبہ بھی نہیں نہیں گزرا ہوگا کہ وہ ریوالور برداروں کی موجودگی میں کوئی اس طرح مزاحمت کرے گا۔ وہ بوکھلا ہی گئے۔ ریوالور ان کے ہاتھوں سے نکل کے زمین پر گر گئے تھے اور وہ دونوں بھی بائیک کے دوسری طرف لڑھک گئے تھے۔ اس صورت حال میں پہلے لڑکے نے جو بائیک چلا کے لایا تھا' اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کی لیکن میں نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اس کی گدی پر وار کیا اور بائیں ہاتھ سے وہ ریوالور جھپٹ لیا جسے نکال کے وہ مجھ پر فائر کرنا چاہتا تھا۔ اتنے میں وہ دونوں سنبھل چکے تھے اور اپنے ریوالوروں کی طرف لپک رہے تھے۔ یہ دیکھ کے میں نے ان کے ساتھی کو اٹھا کر ان پر دے مارا۔ اس سے قبل مجھ میں اتنی طاقت اور تکنیک نہیں تھی لیکن اس وقت نہ معلوم کس طرح مجھ میں اتنی قوت اور مہارت آ گئی تھی۔ اس وقت میں خود اپنے آپ پر حیران ہو رہا تھا۔

میں نے پیر کی ٹھوکر سے دونوں ریوالوار دور کر دیے اور اپنے ہاتھ میں موجود ریوالوار ان پر تان لیا۔

"اب تمہیں پتا چلے گا کم نصیبوں..." میں نے ایک ایک لات ان تینوں کے رسید کرتے ہوئے لب کشائی کی۔ وہ تینوں اب کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ حیرانی' پریشانی اور سراسیمگی کی کیفیت میں مجھے دیکھ رہے تھے۔

"اللہ کی مخلوق کو لوٹتے ہو' ناحق پریشان کرتے ہو... اٹھو.. چلو تھانے۔ اب تھانے دار تمہارا بھرتہ بنائے گا اور اگر تھانے دار نے تمہیں چھوڑ دیا تو میں تمہاری سلاد ضرور بنا دوں گا..."

"بھائی ہمیں معاف کر دو..." وہ گھگھیا ئے۔ "ہمیں معاف کر دو.. ہم سے غلطی ہو گئی۔ ہم اب کسی کو نہیں لوٹیں گے۔ ہمیں چھوڑ دو بھائی..."

"چھوڑنے کی التجا تو وہ لوگ بھی کرتے ہوں گے جن کی تم حلال کمائی لوٹتے ہو لیکن اس وقت تمہیں ان پر ترس نہیں آتا... اب تم پھنس گئے ہو مکافات عمل میں ... اٹھو ورنہ گولی چلا دوں گا..."

چاروناچار وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

پھر اس معاملے کا منطقی انجام کیا ہوا؟' وہ ایک الگ داستان ہے۔ اس سے قطع نظر میرے لیے حیرت انگیز امر یہ ہے کہ میں یکا یک کراٹوں کا ماہر کیسے بن گیا تھا؟ اس وقت جس مہارت سے میں نے لٹیروں کا مقابلہ کیا تھا' وہ اس شخص کے لیے ناممکن تھا' جو کراٹوں سے نابلد رہا ہو اور حقیقت یہ ہی تھی کہ نہ مجھے زندگی میں کراٹوں کا کوئی شوق رہا تھا نہ کبھی میں نے یہ فن سیکھا تھا۔ چناں چہ یہ سوال کہ مجھے خود بہ خود کراٹے لڑنا کیسے آ گئے' بڑے اچنبھے کا باعث تھا۔ اس چھت والے واقعے سے قبل میری ایک آدھ دفعہ دو بدو لڑائیاں بھی ہوئی تھیں جن میں مجھے شکست ہوئی تھی لیکن اس مذکورہ واقعے کے بعد میں یک دم لڑائی بھڑائی کے اس کھیل کا ماہر بن گیا تھا۔ کیا اس حیرت انگیز واقعے کا اس رات والے واقعے سے' جب میرا ٹکراؤ ان تین غیر انسانی لڑکوں سے ہوا تھا' کوئی تعلق ہے؟ ان لٹیروں سے نپٹنے کے بعد میں نے کچھ لوگوں سے' جو کراٹوں کے فن سے نہ صرف واقف تھے بل کہ مثالی حد تک مہارت بھی رکھتے تھے' سے نبرد آزمائی بھی کی۔ انھوں نے تین دفعہ مجھ سے مقابلہ کیا اور تینوں دفعہ وہ ہار گئے یعنی ان لٹیروں کو شکست دینا اتفاق نہ تھا بل کہ فی الحقیقت مجھے کراٹوں کا فن آ گیا تھا۔

میرا ان غیر انسانی مخلوقات سے ٹکراؤ اور اس کے بعد میرے اندر کراٹے لڑنے کی اہلیت پیدا ہو جانا بہت حیرت انگیز ہے اور یہ حیرت ہمیشہ مجھے گھیرے رہے گی۔

☆☆......☆☆

نے بلب جلا کر کمرے کا ایک ایک کونہ چھان مارا مگر وہاں کوئی سانپ دکھائی نہ دیا۔عذرا محسن کو سینے سے لگائے سہمی ہوئی نگاہوں سے کمرے میں ہر طرف دیکھ رہی تھی جبکہ انور بھی خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا، اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔اس نئی مصیبت نے ان کے ذہن سے دروازے پر ہونے والی دستک کا خیال نکال دیا تھا، باقی کی رات ان دونوں نے جاگ کر ہی گزاری کمرے کا بلب بھی رات بھر جلتا رہا۔کبھی کبھی وہ دونوں ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے پھر اپنی اپنی سوچوں میں کھو جاتے۔

☆......☆

اگلے دن ایک بار پھر سارے گھر میں بڑی باریک بینی سے سانپ کی تلاش کی گئی تھی اور اس کے نہ ملنے پر وہ دونوں کچھ سکون محسوس کرنے لگے تھے۔عذرا رات بھر جانے کون کون سی سورتیں پڑھ پڑھ کر گود میں سوئے محسن پر پھونکتی رہی تھی دن نکلتے ہی اس نے چاول پکا کر بچوں میں تقسیم کیے تھے یہ ایک طرح سے خدا کا شکر ادا کرنے کا اس کا طریقہ تھا۔محسن پر سے صدقے بھی اتارے گئے اور سرمے کی سلائی سے اس کے سینے پر دل کی جگہ کانا مار کر نظر بد سے بچانے کی تدبیر بھی کر لی گئی تھی۔ان سب حفاظتی انتظامات کے بعد وہ پرسکون ہو گئی تھی وہ جو ایک خوف سا دل کو جکڑے ہوئے تھے اب غائب تھا شام تک وہ سب کچھ بھول بھال کر اپنی گھر گرہستی میں مشغول ہو چکی تھی۔

☆......☆

"کیا بات ہے انور تو کچھ پریشان لگ رہا ہے، گھر پر سب خیریت تو ہے نا؟" اگلے دن کھیتوں میں دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھے تو نورو اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔نور محمد عرف نورو انور کا دوست ہی نہیں ساجھے وال بھی تھا۔دونوں اپنے گھر میں اکیلے تھے کھیتوں میں کام کرنا ایک اکیلے انسان کے بس کی بات نہ تھی کہ دکھ سکھ بھی ہر انسان کی زندگی کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے، دونوں کے کھیت ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ایک دن مشورے سے دونوں نے فیصلہ کیا کہ آج سے وہ دونوں مل کر ساری زمین پر کھیتی باڑی کریں گے اور جو ملے گا اسے آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔آج تین سال ہونے کو آئے تھے انہیں اپنے فیصلے پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوا تھا، دونوں ایک دوسرے کے لیے بھائیوں سے بڑھ کر تھے۔نورو چار دن سے شہر گیا ہوا تھا اس کی بیٹی کا بخار اترنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔گاؤں کی ڈسپینسری سے دو تین بار دوا لینے پر بھی جب آرام نہ آیا تو وہ بیوی بچوں کو لے کر شہر اپنی سالی کے گھر چلا گیا تھا آج صبح ان کی واپسی ہوئی تھی گاؤں پہنچتے ہی وہ کھیتوں میں چلا آیا تھا اور دونوں صبح سے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔نورو کے بار بار پوچھنے پر انور نے اس رات کا سارا قصہ اسے کہہ سنایا۔

"عجیب بات ہے اتنی سردی میں سانپ نکلتے تو نہیں ہیں ویسے، اور پھر اس کا اس طرح غائب ہو جانا" نورو بھی حیران تھا۔

"اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے نورو کہ اس سے پہلے ایک اور سانپ بھی نکلا تھا میرے گھر سے۔اسے بھی میں نے محسن کے پاس دیکھا تھا" انور نے مزید بتایا۔

"یہ کتنے دن پہلے کی بات ہے؟" نورو نے چونکتے ہوئے دریافت کیا۔

"جس صبح تو شہر کے لیے نکلا تھا اسی دن کی بات ہے، تیری بھابی نے مجھے سویرے گھر کا کچھ ضروری سامان لانے کے لیے کہا تھا۔میں پہلے کھیتوں پہ رہا اور جب سورج نکل آیا تو سوچا جا کر گھر سامان دے آؤں۔میں سامان لے کر گھر پہنچا تو محسن کی ماں صحن میں کپڑے دھو رہی تھی۔میں نے محسن کے بارے میں پوچھا تو بولی کمرے میں کھیل رہا ہے۔میں نے سوچا محسن کے لیے جو مٹھائی لایا ہوں وہ خود ہی اسے دے دیتا ہوں بہت خوش ہو جائے گا۔یہی سوچ کر میں اندر گیا اور میں نے دیکھا محسن موڑھے پہ بیٹھا ہے، ٹی وی پر کارٹون لگے تھے۔وہ انہی کو دیکھنے میں مگن تھا اور اس کے موڑھے کی دائیں طرف ایک سانپ تھا محسن کو

سہولت موجود تھی باقی گھروں میں اب بھی لالٹین یا موم بتی سے کام چلا لیا جاتا تھا۔ انور سردی کے باعث بستر میں دبک گیا ساتھ میں اس کا تین سالہ بیٹا محسن اس کی بغل میں گھسا کہانی سنانے کی ضد کر رہا تھا اس کی بیوی عذرا بھی فارغ ہو کر اپنی چارپائی پر جا لیٹی تھی۔

''بس کر محسن اپنے ابے کو تنگ نہ کر آ میں سناتی ہوں تجھے کہانی'' عذرا نے محسن کو بہلا کر پاس بلانے کی آخری کوشش کی۔

''نہیں مجھے ابا سے ہی سننی ہے بس'' اس ڈر سے کہ کہیں اس کی ماں اسے اٹھا کر اپنے پاس نہ لے جائے وہ ضدی لہجے میں کہتا انور سے اور بھی زیادہ لپٹ کر لیٹ گیا۔ ''یا اللہ آج تو سردی کی انتہا ہو گئی ہے'' عذرا نے کپکپاتے لہجے میں کہتے ہوئے لحاف کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا پھر بھی سردی محسوس ہوتی رہی تو اس نے سر بھی لحاف میں کر لیا۔ انور نے محسن کو کہانی سنانا شروع کر دی اور وہ ہمیشہ کی طرح کہانی کے ہر فقرے پر سوالات کرنے لگا۔ عذرا کچھ دیر باپ بیٹے کی باتیں سنتی رہی پھر نیند کی وادی میں اترتی چلی گئی۔ لحاف کی گرمی، باپ کے پیار اور شفقت بھری پناہ میں آکر محسن بھی زیادہ دیر نیند سے جنگ نہ کر سکا اس کی طرف سے کوئی سوال نہ ہونے پر انور خاموش ہو گیا اس نے مسکراتے ہوئے محسن کے ماتھے کو چوما اور پھر خود بھی سونے کا ارادہ کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ کمرے میں جلتی کوئلے کی انگیٹھی کی ہلکی روشنی کمرے کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی تینوں نفوس گہری نیند میں تھے جب اچانک بیرونی دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ ''الٰہی خیر اس وقت کون آیا ہوگا'' عذرا پریشانی سے کہتی ہوئی بے اختیار بستر پر اٹھ بیٹھی۔ انور بھی جاگ چکا تھا اتنے میں ایک بار پھر دستک ہونے لگی۔

''سو جا تو میں دیکھتا ہوں جا کر'' انور چادر لپیٹتا باہر کی طرف لپکا جاتے جاتے اس نے میز پر رکھی ٹارچ بھی اٹھا لی۔

''ذرا دھیان سے۔'' عذرا کی فکر میں کوئی کمی نہیں آئی تھی وہ ابھی تک چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی بلکہ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ بھی انور کے ساتھ باہر جا کر دیکھے کہ اتنی رات کو کون آیا ہے مگر وہ جانتی تھی انور کو اس کا اس طرح اتنا پریشان ہونا برا لگے گا اسی لیے وہیں بیٹھ کر انور کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ ٹارچ کی روشنی میں انور دروازے کی طرف جا رہا تھا جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے سائیڈ پر پڑی ہوئی کلہاڑی اٹھا کر مضبوطی سے دائیں ہاتھ میں پکڑ لی۔ ملکی حالات کا تقاضا تھا کہ محتاط رہا جائے۔ انور صحن میں آیا تو سردی کی لہر اسے اپنی رگوں میں اترتی محسوس ہونے لگی۔ شدید سردی اور اندھیرے نے مل کر ماحول کو خاصا پر اسرار بنا دیا تھا لیکن گاؤں کے لوگوں کے لیے یہ عام بات تھی ہاں البتہ اگر کوئی اجنبی اس وقت وہاں آنکلتا تو ایک بار تو ضرور ماحول کے اثر میں آکر سہم ہی جاتا۔ دروازہ اب بھی اتنی ہی شدت سے بجایا جا رہا تھا۔

''آرہا ہوں بھائی صبر کرو'' انور نے زور سے آواز لگائی لیکن شاید اس کی آواز باہر تک نہیں پہنچی تھی دستک اسی طرح جاری تھی۔ انور کو جھنجلاہٹ ہونے لگی اس نے لمبے لمبے قدموں سے جلدی جلدی بڑا سا صحن پار کیا اور ہوشیار رہتے ہوئے باہر کا دروازہ کھول دیا۔

''کون ہے؟'' اس نے ٹارچ کی روشنی ادھر ادھر گھماتے ہوئے سوال کیا، کوئی جواب نہ پا کر دروازے کے باہر ادھر ادھر بھی دیکھا مگر اسے کوئی دکھائی نہ دیا۔

''عجیب بات ہے کون تھا اور چلا کیوں گیا وہ بھی ایسے اچانک'' وہ کچھ لمحے اور وہاں کھڑا دیکھتا رہا پھر دروازہ بند کر کے اندر چلا آیا ابھی وہ اپنے کمرے کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ اسے اندر سے عذرا کی چیخ سنائی دی وہ تیزی سے اندر کی طرف بھاگا لیکن کمرے کا منظر دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے اندر کوئی چور ڈاکو نہیں تھا بلکہ وہ ایک بڑا سا سانپ تھا جو محسن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انور دیوانہ وار چیختا ہوا کلہاڑی کا وار کرنے کے لیے سانپ پر جھپٹا لیکن وہ لمحوں میں نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا، بجلی آچکی تھی انور اور عذرا

وجہ سے اسے حقیقت بن کر دکھائی دیا تھا مگر عذرا یہ سب ماننے کو تیار نہ ہو رہی تھی۔ ایک بار پھر سانپ کی تلاش کی گئی مگر لاحاصل، دوستوں کے مشورے سے سپیرے کو بھی بلوایا گیا مگر سانپ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اس کے بعد تو یہ جیسے معمول ہی بن گیا کبھی عذرا کو تو کبھی انور کو گھر میں جگہ جگہ سانپ دکھائی دیتا اور لمحوں میں غائب ہو جاتا دونوں اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھے، آخر نورو کے زور دینے پر انور اس کے ساتھ ایک بابا جی کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گیا جس کا نورو پہلے بھی کئی بار ذکر کر چکا تھا مگر انور ان سب چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اتنا جانتا تھا کہ بہت سے لوگ اللہ والوں کا بھیس بھر کر لوگوں کو بے وقوف بناتے پھرتے ہیں لیکن اب وہ اس قدر پریشان ہو چکا تھا کہ کوئی راستہ نہ پا کر نورو کے ساتھ چل پڑا تھا۔ محسن اور عذرا بھی ان کے ساتھ تھے۔

☆☆☆☆

دو گھنٹے انتظار کے بعد جس وقت وہ بابا جی کے حجرے میں داخل ہوئے دوپہر ڈھل رہی تھی، ہوا میں خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ نورو باہر ہی ٹھہر گیا تھا وہ دونوں میاں بیوی محسن کو اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئے تو بابا جی کے الفاظ نے انہیں حیرت میں ڈال دیا جو ہونٹوں پر پُر شفقت مسکراہٹ لیے اس سے مخاطب تھے۔

''آ گئے تم!! میں تو کب سے تمہارا منتظر تھا، آؤ بیٹھو'' وہ دونوں حیران ہوتے فرش پر بچھی سفید چادر پر بیٹھ گئے۔ محسن گردن گھما گھما کر دلچسپی سے حجرے کو دیکھ رہا تھا جبکہ وہ دونوں میاں بیوی عقیدت اور حیرت بھری نظروں سے بابا جی کو دیکھ رہے تھے۔

''بابا جی یہ ہمارا بیٹا ہے محسن اور......'' بابا جی نے انور کی بات درمیان سے ہی اچک لی۔

''جانتا ہوں بیٹا سب جانتا ہوں تمہارا مقدمہ تو کب سے میرے پاس آیا ہوا ہے، ذرا صبر کرو دوسرا فریق بھی آ جائے تو بات کرتے ہیں'' بابا جی کی بات پر عذرا اور انور ناسمجھی کی کیفیت میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، ان کی آنکھیں ایک دوسرے سے سوال جواب کر رہی تھیں مگر لب خاموش تھے۔ بابا جی آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے ان کے لب ہلکے ہلکے ہل رہے تھے اور ہاتھوں میں تھامی تسبیح کے دانے ایک ایک کر کے انگلیوں کے درمیان پھسلتے جا رہے تھے ایسے ہی تقریباً پانچ منٹ گزر گئے، حجرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی تو بابا جی نے آنکھیں کھول دیں عذرا اور انور بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے جبکہ محسن اب کھیل میں مگن ہو چکا تھا۔ لمحہ بھر بعد حجرے میں جو داخل ہوا اسے دیکھ کر خوف سے دونوں میاں بیوی کی آنکھیں خوف سے پھٹنے والی ہو گئیں، حجرے کے دروازے سے وہی سانپ اندر داخل ہو رہا تھا جسے عذرا اور انور پچھلے کئی دنوں سے اپنے گھر میں دیکھتے چلے آ رہے تھے، انور نے لپک کر محسن کو اپنی گود میں بھر لیا اور سانپ کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ اس سے کہہ رہا ہو ''میرے ہوتے تم میرے بیٹے کا کچھ نہ بگاڑ پاؤ گے'' سانپ سیدھا جا کر بابا جی کے سامنے بیٹھ گیا۔

''بس ٹھیک ہے ارسلان اب انسان کے روپ میں آ جاؤ'' بابا جی سانپ سے مخاطب ہو کر بولے تو لمحہ بھر میں سانپ وہاں سے غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک چھ فٹ کا گیم تجیم انسان بیٹھا دکھائی دینے لگا وہ غصے اور نفرت سے انور اور اس کی فیملی کو دیکھ رہا تھا۔ ''میں آپ کے کہنے سے انتقام لینے سے رک گیا ہوں بابا جی لیکن آپ سے انصاف کی امید رکھتا ہوں۔'' انہیں گھورتے ہوئے وہ بابا جی سے مخاطب ہوا۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' بابا جی نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''انور بیٹا یہ ارسلان ہے، ہماری طرح اللہ کی مخلوق ہے جو عام طور پر ہم لوگوں کو دکھائی نہیں دیتے، اس کا کہنا ہے کہ تم نے اس کے بیٹے کا قتل کیا ہے اور یہ اس کا بدلہ لینے کے لیے تمہارے بیٹے کی جان لینا چاہتا تھا، یہ چاہتا تو تمہارے سوتے میں بھی اس کی اور تمہاری جان لے سکتا تھا لیکن یہ تمہارے سامنے تمہارے بیٹے کو مار کر تمہیں تڑپتا دیکھنا چاہتا تھا، اس رات تمہارے دروازے پر دستک دینے والا

شاید اس کی موجودگی کی خبر بھی نہ تھی، میں نے برآمدے میں پڑے موسلے کو اس سانپ پر دے مارا۔ خدا کا شکر ہے میں وقت پہ پہنچ گیا ورنہ جانے کیا ہو جاتا، اور پرسوں رات پھر ایک اور سانپ اور وہ سانپ بھی محسن کی منجی (چارپائی) کی طرف ہی جا رہا تھا، میں تو بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ نہ جانے یہ کیا ماجرا ہے'' انور واقعی بہت پریشان تھا۔

''فکر نہ کر انورے اتفاق بھی تو ہو جاتا ہے نا دنیا میں، تو مالک کا کرم دیکھ دونوں بار اس نے محسن کو کسی بھی نقصان سے بچا لیا'' نورو بھی یہ سب سن کر سوچ میں پڑ گیا لیکن اس نے انور کو تسلی دینا ضروری سمجھا۔

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہا تھا اگر میں دروازہ بجنے پہ نہ اٹھتا تو وہ شاید سوتے میں ہی۔۔۔'' اس سے آگے کے منظر کا تصور کر کے ہی انور کا دل لرز کر رہ گیا تھا۔

''تجھے پتا چلا کون آیا تھا اس رات دروازے پر؟'' نورو کے سوال پر انور کا ذہن اس بات کی طرف گیا جسے وہ اب تک بھلائے ہوئے تھا۔

''یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون تھا۔''

''تم نے کسی سے پوچھا بھی نہیں؟؟'' نورو نے مزید پوچھا۔

''نہیں یار مجھے تو خیال ہی نہیں رہا اس بات کا میں آج معلوم کرتا ہوں کہ کون آیا تھا اس رات''۔

کھانا کب کا ختم ہو چکا تھا بلکہ اس کے بعد دونوں حقے کے کئی کش بھی لگا چکے تھے اب پھر سے دونوں کام کرنے کے لیے تیار تھے۔

☆......☆

کھیتوں سے واپس آتے ہوئے انور اور نورو نے کئی جگہ پر لوگوں سے باتوں باتوں میں جاننے کی کوشش کی کہ اس رات کوئی انور کے گھر آیا تھا کیا؟ مگر انہیں ہر طرف انکار ہی سننے کو ملا۔

''میں تجھے پریشان نہیں کرنا چاہتا انور لیکن مجھے یہ معاملہ کچھ اور ہی لگ رہا ہے'' گھر کی طرف جاتے ہوئے نورو نے انور سے کہا۔

''کیا مطلب ہے تیرا؟''

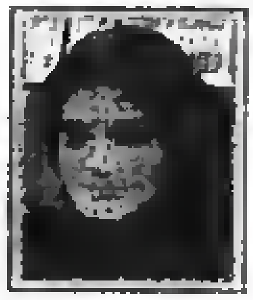
''دیکھ انور پہلی بات تو یہ کہ تیرا گھر گاؤں کے بالکل کونے میں ہے یعنی گاؤں کے باقی گھروں سے کافی ہٹ کر ہے۔ ایسے میں اگر گاؤں میں کسی کو رات کے اس ٹائم کوئی ضرورت بھی ہوتی تو وہ اپنے اردگرد کے گھروں میں جاتا نہ کہ اتنی دور تیرے گھر جاتا اور پھر فرض کرو کسی وجہ سے چلا بھی گیا تھا تو تجھ سے بات کیے بنا واپس کیوں چلا جاتا؟'' نورو کی بات نے انور کو بھی سوچ میں ڈال دیا لیکن اسے اب بھی دستک اور سانپ کے درمیان کوئی تعلق دکھائی نہ پڑ رہا تھا۔ نورو کا گھر آ گیا تھا وہ اللہ حافظ کہتا انور سے جدا ہو گیا اور انور اکیلا اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ جہاں اس کی بیوی اور بیٹے کی صورت میں زندگی بانہیں پھیلائے اس کی منتظر تھی۔

☆......☆

اس کے بعد کئی سارے دن یونہی گزرتے چلے گئے انور اور عذرا بھی اس بات کو بھول بھال گئے لیکن اچانک ایک دن پھر ایسا واقعہ ہوا کہ وہ بھولی ہوئی بات پھر سے سوالیہ نشان کی صورت ان کے ذہنوں میں خوف پھیلانے لگی۔ اس روز رات بھر کھیتوں پر رہنے کی باری نورو کی تھی۔ صبح سویرے انور نے اس کی جگہ ڈیوٹی سنبھالنا تھی اسی لیے وہ بہت سویرے ہی گھر سے نکل گیا تھا، عذرا بھینسوں کا دودھ دوہ کر فارغ ہوئی تو دودھ کی بالٹی سائیڈ پر رکھتے ہوئے اس کی اچٹتی سی نظر صحن کی طرف اٹھی تھی اور پھر وہیں جم کر رہ گئی تھی، صحن میں بڑا سا سانپ رینگتا ہوا محسن کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ عذرا نے چاہا کہ وہ بھاگ کر محسن کے پاس پہنچے لیکن خوف کی شدت نے اس کے قدموں کو زمین سے جکڑ کر رکھ دیا تھا پھر ایک عجیب بات ہوئی عذرا کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سانپ وہاں سے غائب ہو گیا اس کے غائب ہوتے ہی عذرا جیسے کسی سحر سے آزاد ہوئی اور بے تابانہ انداز میں اس طرف بھاگی مگر سانپ کا کوئی اتا پتا نہ تھا کمرے میں محسن میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا۔ عذرا نے فوراً انور کو بلا بھیجا، انور نے بہت سمجھایا کہ وہ سانپ کوئی حقیقت نہیں تھا بلکہ اس کا وہم تھا جو اس کے خوف کی



ناگن



صائمہ عروج

کیا آج کے زمانے میں آپ ناگ، ناگن کی ناقابل فہم کہانیوں پر اعتبار کرتے ہیں

اگر نہیں تو یہ کہانی ضرور پڑھیں

یونیورسٹی میں قدم رکھنے والا ہر طالب علم آنکھوں میں اچھے مستقبل کے خواب لیے گھومتا ہے۔ میں بھی یہی خواب آنکھوں میں سجائے یونیورسٹی کے شب و روز گزار رہا تھا۔ پڑھائی میں مگن اپنی جی پی کو پچھلے سمسٹر سے زیادہ اچھا



بھی ارسلان ہی تھا۔ مجھے جیسے ہی معاملے کی خبر ہوئی میں نے ارسلان کو رکنے کے لیے کہا اور اس نے میری بات مان لی اس لیے اس رات یہ تمہاری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے اس کے بیٹے کا قتل کیوں کیا لیکن تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں'' بابا جی نے ساری تفصیل بتاتے ہوئے انور کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا وہ جو حیرت وخوف کے ملے جلے احساسات کے ساتھ یک ٹک ارسلان کو دیکھے چلا جا رہا تھا بابا جی کے سوال پر جیسے ہوش میں آ گیا۔

''بابا جی میں اسے نہیں جانتا تو پھر اس کے بیٹے کے قتل کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' انور نے الجھتے ہوئے بابا جی اور ارسلان کو دیکھا۔ ''جسے سانپ سمجھ کر تم نے مار ڈالا تھا وہ میرا بیٹا تھا جو سانپ کے بہروپ میں تمہارے بیٹے کے ساتھ کھیل رہا تھا، لیکن تم نے اس کی جان لے لی'' اس سے پہلے کہ بابا جی انور کی بات کا جواب دیتے ارسلان اسے غصے سے گھورتے ہوئے بولا، اور جیسے ساری بات لمحہ بھر میں انور کی سمجھ میں آ گئی۔

''میں مانتا ہوں کہ میری وجہ سے تمہارے بیٹے کی جان جاتی رہی لیکن میری جگہ کوئی بھی باپ ہوتا وہ یہی کرتا، اگر تم اپنے بیٹے کو کسی خطرے میں دیکھتے تو تم بھی اسی طرح اس کا بچاؤ کرتے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' انور کے اندر کا باپ اپنے بیٹے کو خطرے میں دیکھتے ہی ڈٹ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اب وہ بنا کسی خوف کے ارسلان کے چہرے پر نظریں جمائے اس سے سوال کر رہا تھا۔

''اگر بابا جی نے میرے ہاتھ نہ باندھے ہوتے تو میں تم سے سوال جواب کرنے کی بجائے اپنے بیٹے کے قتل کا انتقام لے کر یہاں سے جا چکا ہوتا۔''

''سنو ارسلان مجھے بھی تمہارے بیٹے کی موت کا دکھ ہے لیکن تم انور کی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرو وہ تمہارے بیٹے کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا وہ تو صرف اپنے بچے کی حفاظت کر رہا تھا، اس سے غلطی ہوئی، قتل ہوا مگر یہ سب انجانے میں ہوا، میں تمہیں بھی اچھی طرح جانتا ہوں، تم ایک اچھے جن ہو ارسلان، دردمند دل رکھتے ہو، بیٹے کو کھونے کے دکھ سے واقف ہو، کیا تم چاہو گے کہ جس دکھ میں تمہارا دل تڑپ رہا ہے وہی دکھ کسی اور کو بھی سہنا پڑے جبکہ اس سب کے بعد بھی تمہارا بیٹا تمہیں واپس ملے گا نہ ہی تمہارے دکھ میں کوئی کمی آئے گی'' بابا جی کی بات پر ارسلان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''تو میں کیا کروں بابا جی؟'' ارسلان نے روتے ہوئے پوچھا۔

''ان بہتے آنسوؤں سے اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کر دو ارسلان صبر کے راستے پر چلو، بے شک معاف کرنے والا بہت بڑا ہوتا ہے۔''

''میں تہہ دل سے تم سے معافی مانگتا ہوں کاش کہ یہ سب نہ ہوا ہوتا لیکن اگر اب بھی تمہارا دل مجھے معاف کرنے کو تیار نہیں تو میری غلطی کی سزا میرے معصوم بچے کو مت دو، تمہیں بدلہ چاہیے تو میری جان لے لو'' انور نے روتے ہوئے ارسلان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ارسلان نے ایک نظر بابا جی کی طرف دیکھا اور دوسری نظر محسن پر ڈالی جو باپ کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی حجرے میں گھومتا پھر رہا تھا اور اب گھومتا گھامتا ارسلان کے پاس آ پہنچا تھا، وہ معصوم ہر بات سے بے خبر ارسلان کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ ارسلان کا دل اس مسکراہٹ سے پگھل گیا اس کے اندر بدلے اور انتقام کی آگ سرد پڑ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر محسن کے گالوں کو پیار سے چھوا اور آنسوؤں میں بھیگے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں اپنے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی وہ دھواں بن کر حجرے سے غائب ہو گیا۔ عذرا اور انور نے آنسو بہاتے ہوئے بابا جی کا شکریہ ادا کیا اور محسن کو کسی قیمتی خزانے کی مانند آغوش میں سمیٹے حجرے سے باہر چلے آئے۔ سورج مغرب میں پناہ لے چکا تھا تاریکی پھیل رہی تھی لیکن ارسلان نے ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے عذرا اور انور کی زندگیوں کو غم کی تاریکی میں ڈوبنے سے بچا لیا تھا۔

☆......☆

بھی حور لگ رہی تھی۔

"کیا کھانا پسند کرو گی؟" اور اس نے بلا جھجک اپنی پسندیدہ ڈشیں بتادیں۔

"تو کیا وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔" میرا دل نچلا نہ سماتا تھا اور کھانے کے بعد جب وہ سوفٹ ڈرنک کے سپ لے رہی تھی تب میں نے اپنی پینٹ کی جیب سے ایک ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

ڈبیا میں موجود سونے کی انگوٹھی کی دمک اس کے چہرے کی دمک سے کم نہ تھی۔ وہ بدستور سوفٹ ڈرنک کے سپ لیتی رہی۔

"مجھ سے شادی کرو گی میرا؟" میرا دل الگ لے پر دھڑکنے لگا۔

"نہیں۔" پرسکون سے انداز میں اس نے انکار کر دیا۔

"کیوں؟" میں تڑپ اٹھا۔

چند لمحے وہ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اس نے ڈبیا لے لی اور کچھ دیر انگوٹھی کا ڈیزائن دیکھنے کے بعد ڈبیا میز پر رکھ دی۔

"میری حقیقت جاننے کے بعد تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے۔" وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔

"حقیقت۔" میں اس لفظ کو زیر لب دہرا کر رہ گیا۔

"زمین مریخ سے جا کر ٹکرا جائے، دنیا میں آکسیجن ختم ہو جائے میں پھر بھی تم سے شادی کروں گا اور تم کہتی ہو حقیقت جاننے کے بعد مکر جاؤں گا۔" میرے لہجے میں چٹانوں سی سختی تھی۔

"ہاں تم حقیقت آشنا ہونے کے بعد پیچھے ہٹ جاؤ گے۔" سوفٹ ڈرنک ختم ہو گیا تھا اور اب وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھی میز پر رکھے کہہ رہی تھی۔

"تم مجھے آزمانا چاہتی ہو تو آزمالو میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں۔ بس ایک بار تم اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ پھر میں تمہارا ہاتھ مرنے کے بعد ہی چھوڑوں گا۔"

وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی اور پھر ہنسنے لگی۔ ہنستی ہی چلی گئی اس کی ہنسی کا استہزا مجھے رگیدنے لگا۔

"میرا مجھے تمہارا ہنسنا اچھا نہیں لگ رہا۔"

"اور کچھ دیر بعد تمہیں میں بھی اچھی نہیں لگوں گی۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"ایسا ہی ہو گا۔ ابھی تو تم مجھ سے شادی کے خواہش مند ہو۔ حقیقت جاننے کے بعد تم مجھے دیکھ کر رخ موڑ لیا کرو گے۔"

"اب بتاؤ بھی آزما بھی لو۔" میں اس لفظ حقیقت کی تکرار سے اکتانے لگا۔ وہ مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھنے لگی اور خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا۔ اس سے قبل کہ میں اس خاموشی سے اکتا کر کچھ کہتا۔ وہ بولی۔

"میں انسان نہیں ہوں۔"

"تو کیا جن زادی ہو۔" میں ہنسنے لگا۔

"نہیں، میں ناگن ہوں۔" اور میری مسکراہٹ قہقہے میں بدلنے لگی۔

"بس کرو اب۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"ایسا ہے تو ہمیں بھی سانپ بن کر دکھا دو۔" میری ہنسی نہ رکتی تھی ایسی ماورائی باتیں کر کے وہ اگر مجھے الو بنا رہی تھی تو میں ایسا عقل سے پیدل نہ تھا۔ چند لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی اور پھر اس نے مجھے سانپ بن کر تو نہ دکھایا مگر جو میں نے دیکھا لمحے بھر کو میں کانپ ہی گیا۔

"مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھو۔" میرا کہہ رہی تھی۔

"یہ کام میں شوق سے کروں گا۔" اور میں اسے دیکھنے لگا۔ کس قدر حسین لڑکی تھی اور پھر...... میرے رونگٹے ہی کھڑے ہو گئے۔

اس نے منہ سے زبان نکالی۔ وہ زبان نہ تھی۔ پھن تھا۔ دو دھاری پھن جیسے سانپ کا ہوتا ہے۔ ایک بار نہیں تین بار اور میں سکتے میں آ گیا۔ اب ہنسنے کی باری اس کی تھی۔

"اب بولو میز مجھ سے شادی کرو گے؟" وہ ویسے ہی ہنس رہی تھی جیسے کچھ دیر پہلے میں ہنس رہا تھا۔

اور فقط چند لمحوں بعد کانپتی ٹانگوں پر اپنے دھڑ کا بوجھ اٹھائے میں سیدھی سڑک پر چلتا چلا جا رہا تھا۔

"زمین مریخ سے جا کر ٹکرا جائے، دنیا میں آکسیجن ختم ہو جائے میں پھر بھی تم سے شادی کروں گا۔" اپنے الفاظ میرے کانوں میں گونجے اور میں لڑھکتے لڑھکتے بچا۔ کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے اور یہ فرق آج سے پہلے مجھے کبھی اتنے جامع انداز میں سمجھ نہ آیا تھا۔ بھلا آپ بتائیے میں ایک ناگن سے کیسے شادی کر سکتا ہوں؟ آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟

☆☆☆

کرنے کی فکر اور ساتھ میں یونیورسٹی لائف کی جولانیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اور یونہی ایک عام سے دن جب لیکچرار کے نہ آنے کی وجہ سے ہم کلاس فیلوز ڈیپارٹمنٹ کے سامنے والے لان میں ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ میری نظر میرا پر پڑی۔

میرا جو کلاس کی ذہین طالبہ تھی۔ جو ہر سمسٹر میں نمایاں جی پی لیتی۔ جسے طلباء رشک سے دیکھتے۔

وہ میرا جسے میں دن میں بیسیوں بار دیکھتا مگر آج کی نظر میں ایسا کیا تھا کہ وہ میرا چین وسکون لیے دور پرواز کر گئی اور رات کو میں اپنے بستر پر کروٹیں ہی بدلتا رہ گیا۔

''می را۔'' ٹھہر ٹھہر کر میں نے نام لیا۔ ایک گدگدی کا احساس سر سے شروع ہوا اور پیروں تک رینگتا چلا گیا اور ہونٹوں پر خود بخود ایک مسکراہٹ سجنے لگی۔

صبح کو باوجود اس کے کہ کم خوابی کی ڈوریں میری آنکھوں میں جھلک رہی تھیں مگر میں ہشاش بشاش مسکرائے جاتا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی اس بلاوجہ مسکراتا رہا۔ لیکچرز بھی توجہ سے نہ سنے اور جب کلاسز اختتام کو پہنچیں اور طلباء لیکچر ہال سے کتابیں سنبھالتے رخصت ہونے لگے۔ تب میں لڑکیوں کی اس رو کی طرف بڑھا جہاں میرا بیٹھی تمام لڑکیوں سے جدا لگتی تھی۔ یوں جیسے بہت سے نگینوں میں ہیرا سب سے جدا لگتا ہے۔

''میرا۔'' میں نے اسے پکارا۔ وہ کتاب سے نظر اٹھا کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی اور میں جو صبح سے شاداں وفرحاں اپنے دل کو اچھلنے سے روک رہا تھا، لمحے بھر کو گڑبڑا گیا۔

''کچھ کہنا ہے رمیز؟'' لہجے میں سادگی لیے وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

''وہ میں یہ کہ......'' الفاظ ہی ادا نہ ہوتے تھے اور وہ ہنس دی۔ اس کے ہنسنے سے جیسے جلترنگ سے بجنے لگے۔

''اتنے نروس کیوں لگ رہے ہو رمیز۔'' اس سے قبل کہ میں اس جلترنگ کے سحر میں گرفتار ہو کر کسی فینٹسی بھری دنیا کا سفر کرتا۔ میرا کی آواز نے میرے سفر کے قصے کو روکا۔

''وہ مجھے تمہارے سابقہ لیکچرز کے نوٹس چاہیے۔'' اس وقت مجھے یہی بہانا سوجھا۔

یوں بھی ایک طالب علم کو اپنی صنف مخالف کلاس فیلو سے بات کرنے کے لیے اکثر و بیشتر یہی بہانا سوجھتا ہے۔

''میں کل لے آؤں گی۔'' وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور میں اس پر ہی خوش ہو گیا کہ کل بات کرنے کا بہانا میسر آیا۔

☆......☆

اگلے دن وہ نوٹس لے آئی اور مجھے پکڑا دیے۔ اس سے اگلے دن میں نے وہ نوٹس اسے واپس کرتے ہوئے کہا کہ یہ لیکچرز مجھے سمجھ آ گئے تھے مجھے فلاں لیکچر کے نوٹس چاہیے تھے۔ اس سے اگلے دن وہ مطلوبہ لیکچر کے نوٹس لے آئی اور اس سے اگلے دن میں اس کے پاس جا کر اس سے کہہ رہا تھا۔ ''مجھے یہ پوائنٹس سمجھ نہیں آ رہے، برائے مہربانی سمجھا دو۔''

اگلے دو دن وہ مجھے سمجھاتی رہی اور میں سمجھ کر بھی نہ سمجھنے کی اداکاری کرتا رہا اور جو میں یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ انجان بنی رہے گی تو ایسا ہرگز نہ ہوا۔

''رمیز تمہیں ایک بات بتاؤں۔''

''ضرور۔'' کہنی پر چہرہ ٹکائے میں اشتیاق سے اسے تکے جا تھا۔

''تم ایک برے اداکار ہو۔''

''کیا مطلب؟'' میں گڑبڑا گیا۔

''وہ ہنس دی اور کہنے لگی۔ ''میں جانتی ہوں یہ ٹاپک تمہیں سمجھ آ چکے ہیں بلکہ شاید پہلے سے تمہیں آتے تھے۔ اب شاید تم مجھ سے پرانک کر رہے ہو یا کوئی اور وجہ ہے۔

''نہیں......نہیں۔ یہ پرانک (عملی مذاق) نہیں ہے۔''

''تو کیا پھر فلرٹ کرنا چاہتے ہو۔'' وہ اس قدر بااعتماد لڑکی تھی۔ مجھے اندازہ نہ تھا۔

''نہیں ایسا ہرگز نہیں۔''

''تو پھر......'' سوالیہ نشان آنکھوں میں لیے وہ پوچھ رہی تھی۔

''تو پھر......'' میں سوچنے لگا کیا جواب دوں۔

''کیا تم کل لنچ میرے ساتھ کر سکتی ہو۔ وہیں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔'' اور میں جو سوچ رہا تھا وہ سیخ پا ہو کر انکار کر دے گی۔ خلاف توقع وہ مان گئی۔

☆......☆

اگلے دن میں مقررہ وقت پر ہوٹل پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آ گئی۔ آج بھی وہ سادہ سے حلیے میں تھی مگر پھر

تو اس کی نظر نہر کی پٹڑی کے ایک طرف کھیتوں میں چلتے ہوئے ٹیوب ویل پر پڑی تو اسے خود بھی اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

ٹیوب ویل کی ہودی کی چار دیواری پر سیاہ رنگ کے دو دھاری دار سانپ تین فٹ کی بلندی تک پھن پھیلائے آپس میں اس طرح بل کھا رہے تھے جیسے دو رسیوں کو بل دیا جا رہا ہو۔

''کیا یہ لڑ رہے ہیں۔'' سہیل نے حیرت اور تجسس سے پوچھا۔

''ن نن نہیں یہ ملاپ کر رہے ہیں۔'' ندیم نے انتہائی خوفزدہ انداز میں جواب دیا۔ ''یار تم اتنے خوفزدہ کیوں ہو گئے ہو وہ ہم سے خاصے فاصلے پر ہیں۔'' سہیل نے اسے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

''میں نے سنا ہے کہ جوڑا سانپ انتہائی زہریلے اور خطرناک ہوتے ہیں وہ دیکھو انہوں نے ملاپ چھوڑ دیا ہے اور ہماری طرف دیکھ رہے ہیں ہمیں واپس چلنا چاہیے۔''

ندیم نے پہلے سے بھی زیادہ خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔ سہیل نے واپس ٹیوب ویل کی طرف دیکھا تو واقعی سانپ آپس میں بل کھانا چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے تھے، اور اب لہرا لہرا کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ''ایک منٹ رکو۔'' سہیل نے اسے کہتے ہوئے ایک طرف پڑا ہوا مٹی کا ڈھیلا اٹھایا اور تاک کر پورے زور سے سانپوں کی طرف اچھال دیا۔

نشانہ ٹھیک ایک سانپ کے پھن پر لگا جو مٹی کے ڈھیلے اور ٹیوب ویل کی پختہ دیوار کے درمیان میں آ کر کچلا گیا۔

سانپ بل کھا کر پانی کی ہودی میں گرا اور وہاں سے بہتا ہوا کھالے میں آ گیا۔ اور اس کا مردہ جسم پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہنے لگا، جبکہ اس کا ساتھی سانپ بے قراری سے کھالے کے کنارے اس کے ساتھ ساتھ رینگنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں دونوں سانپ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ''اوہ اوہ یہ تم نے کیا کر دیا۔ اب تمہیں دوسرے سانپ کے انتقام سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ میں تمہارے ساتھ رہا تو یہ مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔''

ندیم نے ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کہا اور واپس گاؤں کی طرف دوڑ لگا دی۔ ''ندیم سنو تو۔'' ندیم۔ سہیل پیچھے سے آوازیں دیتا رہ گیا مگر اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

''اسے کیا ہوا اتنا ڈرپوک انسان میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، سنی سنائی باتوں پر کتنا یقین رکھتا ہے کہ اگر جوڑے سانپ میں سے ایک کو مار دیا جائے تو دوسرا انتقام لیتا ہے۔ ہونہہ مائی فٹ۔''

سہیل بڑبڑاتا ہوا نہر کی پٹڑی سے اتر کر ٹیوب ویل کے پاس آ گیا، جہاں کچھ دیر پہلے تک ناگ اور ناگن آپس میں محبت کر رہے تھے۔





پیاس ادھوری ہے

سعدیہ سیٹھی

اس ناگن کی داستان جو چاہ کر بھی اپنا انتقام نہ لے سکی دشمنی سے پیوستہ ایک زہر بھری داستان

نہر کے درمیان میں پانی کے بہاؤ کی رفتار بہت زیادہ تیز تھی جس کی وجہ سے ایک مخصوص شور کی آواز پیدا ہو رہی تھی جبکہ اس کے برعکس کناروں کے قریب اگے ہوئے سرکنڈوں میں پانی کا بہاؤ نا ہونے کے برابر تھا پانی اس طرف آ تو رہا تھا مگر سرکنڈوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہو کر اس کی ساری تیز طراری ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ویران اور سنسان پٹڑی پر اس وقت کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی شام ہونے میں چند گھنٹے باقی تھے مگر فضا میں خنکی در آئی تھی۔

ایسے میں سہیل اپنے جگری دوست ندیم کے ساتھ نہر کی سنسان پٹڑی پر خراماں خراماں چلتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ سہیل تعلیم کے سلسلے میں شہر میں رہتا تھا مگر اس کا دل ہمیشہ گاؤں اور اپنے دوستوں میں ہی اٹکا رہتا تھا۔

وہ جب بھی گاؤں آتا تو ندیم کے ساتھ نہر کے کنارے دور تک چہل قدمی ضرور کیا کرتا تھا ایگزام ختم ہونے کی وجہ سے اسے کالج سے کچھ دن کی چھٹی تھی۔

کل رات ہی وہ واپس گاؤں پہنچا تھا۔ ”یار چند دن چھٹی ہے تو کیوں نہ فشنگ کا پروگرام بنایا جائے۔“ سہیل نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی، میں نے تو پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ اس بار جب تم چھٹی آؤ گے تو مچھلیاں پکڑنے کا پروگرام بنائیں گے اور اس بار یہاں نہر پر آنے کی بجائے دریا پر جائیں گے۔“ ندیم نے پرجوش انداز میں جواب دیا۔ ”او کے تو پھر یہ پروگرام فائنل سمجھو اور واپس گھر جا کر آج ہی جال وغیرہ کا بندوبست کر لو، میں بھی امی سے کہہ کر ساتھ لے جانے کے لیے کھانا بنوا لوں گا۔“ سہیل نے حتمی لہجے میں پروگرام فائنل کرتے ہوئے کہا۔ ”کیوں نہ اس بار ساجد اور اکرام کو بھی ساتھ۔۔“ ندیم بات کرتے ہوئے اچانک خاموش ہو گیا، جبکہ اس کے اٹھتے ہوئے قدم بھی رک گئے۔ سہیل نے اس کے رکنے اور اچانک چپ سادھنے پر اس کی طرف دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا، کیوں کہ ندیم کے چہرے پر انتہائی ڈر اور خوف کے آثار ابھرے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ سہیل یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کچھ دیر پہلے تک وہ بالکل نارمل انداز میں باتیں کر رہا تھا، اب اچانک اسے کیا ہو گیا تھا کہ اس کے چہرے پر خوف سے پسینہ تک آ گیا تھا۔

”کیا ہوا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ سہیل نے حیرانگی سے پوچھا مگر ندیم نے کوئی جواب نہیں دیا وہ بس ایک طرف دیکھے جا رہا تھا۔ سہیل نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا

واقعہ سننے کے بعد جوگی بابا کسی سوچ میں پڑ گیا۔

"بچے تم نے ناگ کو مار کر بہت بڑی غلطی کی ہے یہ سچ ہے کہ اس نسل کا سانپ انتقام لیے بغیر نہیں چھوڑتا، مگر تم فکر نا کرو۔ میرے پیر و مرشد نے مجھے فیض عنایت کیا ہے۔ میں سانپ سے بات کر سکتا ہوں، میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ انتقام لینے سے باز آ جائے آگے تمھاری قسمت۔" جوگی نے کندھے پر موجود تھیلے میں سے بین نکالتے ہوئے کہا۔ اور پھر دروازے کے سامنے موجود لوگوں کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے بین ہونٹوں سے لگالی۔

اور پھر اگلے آدھے گھنٹے تک بین بجا بجا کر جوگی کی رگیں پھول گئیں مگر سانپ تو کیا کوئی سنپولیا بھی گھر سے برآمد نہ ہوا۔ "بہت زیادہ غصے میں لگتا ہے وہ انتقام لیے بغیر نہیں ٹلے گا۔" جوگی نے بین منہ سے ہٹاتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

"بابا جی میرا ایک ہی بچہ ہے میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں اسے بچالو۔" پروین بیگم نے جوگی کے پیروں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے التجا کی، تو وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"بہن جی کیوں مجھے گنہگار کرتی ہو، میں ایک خاص بوٹی کا دھواں دے کر پھر کوشش کرتا ہوں۔" جوگی نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا، جب اس کا ہاتھ تھیلے سے باہر آیا تو اس میں ایک چھوٹی سی جھاڑی نما بوٹی تھی، پھر اس نے بوٹی کو آگ دکھائی تو اسے آگ لگنے کی بجائے گاڑھا دھواں نکلنے لگا جوگی نے دھواں اگلتی بوٹی کو گھر کے اندر پھینک دیا تھوڑی دیر میں ہی پورا گھر دھوئیں سے بھر گیا، تو اس نے ایک بار پھر بین سنبھال لی اور اسے ایک خاص لے سے بجانے لگا۔ اس بار اسے بین بجاتے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ نیم وا دروازے میں سے ایک سیاہ رنگ کا آٹھ فٹ لمبا سانپ نکل کر گلی میں آ گیا، اور عین جوگی بابا کے سامنے کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور دائیں بائیں لہرانے لگا۔ اس کی آنکھیں اتنی زیادہ سرخ ہو رہی تھیں جیسے شعلے اگل رہی ہوں۔ وہ بار بار سرخ زبان باہر نکال رہا تھا اور گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس طرح سانس لینے سے اس کا پورا جسم پھول اور پچک رہا تھا۔ جس سے اس کی بے چینی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ جوگی نے بین بجانے کے ساتھ ساتھ دوسرے ہاتھ میں چھڑی پکڑی اور اس کا ایک سرا زمین پر رکھ کر سانپ کے گرد گھومنے لگا۔

جوگی کے دائرے میں گھومنے پر سانپ بھی گردن پھیر کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

دائرہ لگانے کے بعد وہ واپس اپنی جگہ پر آ کھڑا ہوا اور پھر اس نے ایک دم بین بجانا بند کر دی۔

اور کسی نامعلوم زبان میں چیخ کر کچھ کہا، جواب میں سانپ نے پھنکار ماری تو اس کے منہ سے زہر فوارے کی طرح نکلا، اور جہاں تک گرا وہاں سے زمین ایسے کھولنے لگی جیسے تیزاب گرایا گیا ہو، لیکن اس کا زہر دائرے سے باہر نہیں نکل سکا۔ "یہ کہہ رہی ہے تم نے میرے شوہر کی جان لی ہے اب میں ہر حال میں تم سے بدلہ لوں گی۔"

جوگی بابا نے سہیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے اس سے کہیں کہ میرے بچے کو معاف کر دے، اس کے بدلے میں میری جان لے لے۔" پروین بیگم نے ہاتھ جوڑ کر انتہائی جذباتی انداز میں روتے ہوئے کہا، جوگی بابا نے ایک بار پھر ناگن سے بات کی۔

"یہ کہہ رہی ہے کہ اگر تم اسے زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو ابھی اس علاقے سے دور بھیج دو اور اگر کبھی یہ دوبارہ مجھے نظر آیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔

پھر اسے میرے انتقام کوئی نہیں بچا سکے گا، اس کی جان میں صرف تمہاری وجہ سے بخش رہی ہوں۔"

جوگی بابا نے ایک بار پھر ناگن سے بات کرنے کے بعد انہیں بتایا۔ "ٹھیک ہے ہمیں منظور ہے۔ میرا بیٹا اب کبھی دوبارہ اس گاؤں میں تو کیا اس ضلع میں بھی قدم نہیں رکھے گا۔" صوفی فیاض نے فوراً حامی بھرتے ہوئے کہا۔

اور سہیل کو اسی وقت عدنان کے ساتھ شہر کی طرف روانہ کر دیا۔ کچھ دیر بعد جوگی بابا ایک بار پھر چھڑی زمین پر رکھ کر دائرے کے گرد چکر لگانے لگا مگر اس بار اس نے پہلے کی نسبت الٹے چکر لگائے تھے۔

جب چکر مکمل ہو گئے تو ناگن دائرے سے نکل کر سر جھکائے شہر کی سمت چل دی۔ اس کی چال میں اپنے جیون ساتھی کے قاتل سے انتقام نہ لے سکنے کا ملال اور شکست خوردگی واضح تھی۔

واپس اپنے بل میں پہنچ کر اس نے اپنے انڈوں کی طرف دیکھا اور ان پر کنڈلی مار کر بیٹھ گئی اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے انتظار ہے کہ اس کا ادھورا انتقام ان میں سے نکلنے والے سپولیے ہی پورا کریں گے۔ اور تب تک اسے صرف انتظار کرنا تھا۔

☆☆......☆☆

اس نے آگے بڑھ کر چونچے سے نکلتے ہوئے تازہ اور ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا اور سیر ہو کر پیا، اور پھر واپسی کے لیے چل پڑا۔ گاؤں پہنچتے پہنچتے پر ندیم اسے گلی میں ہی مل گیا۔

"یار بہت ڈرپوک انسان ہو مجھے لگتا ہے بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں نے ابھی تک تمہیں اپنے حصار میں لیا ہوا ہے۔" سہیل نے اسے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔ "صبح کا کیا پروگرام ہے۔" سہیل نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"میں جال وغیرہ کا بندوبست کرتا ہوں، ساجد اور اکرام کو بھی اطلاع کر دیتا ہوں صبح تڑکے ہی نکل جائیں گے تاکہ واپسی جلدی ہو سکے۔" ندیم نے جواب دیا۔

تو سہیل نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید اب وہ اس کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے بھی نہیں جائے گا۔

بہر حال اب وہ نارمل لگ رہا تھا، سہیل اس سے رخصت ہو کر گھر آ گیا۔

☆......☆

"آج تو کہیں لمبی سیر کے لیے نکل گئے تھے۔" اس کی امی نے اسے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

"بس امی آج ندیم سے کافی دنوں بعد ملاقات ہوئی تو گپ شپ میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "کاڑھا ہوا دودھ پیو گے صبح سے رکھا ہوا ہے سارا دن پک پک کر سرخ ہو گیا ہے۔"

"واہ امی نیکی اور پوچھ پوچھ کر جلدی لائیں۔" اس نے بے صبری سے کہا تو اس کی امی مسکرا کر جگ میں دودھ ڈالنے لگیں۔ انہیں معلوم تھا کہ سہیل کو کاڑھا ہوا دودھ بہت پسند ہے۔

"امی ابو کہاں ہیں صبح سے نظر نہیں آ رہے۔" اس نے آئینے میں اپنے سراپے پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آج مسجد کا لینٹر ڈالا جا رہا ہے۔ تمہیں معلوم تو ہے کہ وہ مسجد کی انتظامیہ میں ہیں، اسی لیے وہ آج وہیں مصروف ہیں۔" پروین بیگم نے دودھ لے کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے انہیں دو چھتی سے کوئی چیز اڑ کر سہیل کی طرف آتی ہوئی نظر آئی تو انہوں نے بنا کوئی وقت ضائع کیے دودھ کا جگ ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے سہیل کو زور سے دھکا دیا تو وہ الٹ کر پیچھے موجود چارپائی پر جا گرا۔

ایک لمحہ پہلے جس جگہ سہیل موجود تھا وہ چیز وہاں سے اڑتی ہوئی نیچے فرش پر جا گری۔ پروین بیگم نے فرش کی طرف دیکھا تو وہ ایک کالے سیاہ رنگ کا ناگ تھا۔

اسے دیکھ کر ان کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

نجانے ان میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی انہوں نے ہاتھ میں موجود گلاس ناگ کو دے مارا۔ تو اس نے تیزی سے کروٹ بدل کر خود کو بچا لیا۔ گلاس ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ سانپ ایک بار پھر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا مگر اسی لمحے بیرونی دروازہ کھلا اور سہیل کے ابو اندر آ گئے۔ انہیں اندر دیکھ کر سانپ ٹھٹھک کر رک گیا اور پھر تیزی سے اندرونی کمرے کی طرف رینگ گیا۔ سانپ دیکھ کر صوفی فیاض کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"یہ کہاں سے آ گیا۔" انہوں نے حیرانگی سے پوچھا مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پروین بیگم خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں جبکہ سہیل سکتے کی حالت میں اندرونی کمرے کی دہلیز کو دیکھے جا رہا تھا جہاں سے سانپ گزر کر کمرے میں گیا تھا۔

اس کے ذہن میں ندیم کی باتیں گھومنے لگیں۔

صوفی فیاض نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو وہ لہرا کر اپنے والد کی بانہوں میں جھول گیا، وہ بے ہوش ہو چکا تھا، کچھ ہی دیر میں پورا گاؤں ان کے صحن میں امڈ آیا۔

ندیم نے سارے گاؤں کے سامنے سہیل کے سانپ کو مارنے کا واقعہ سنایا تو سب دہشت زدہ ہو کر گھر سے نکل کر باہر گلی میں آ گئے، حکیم صاحب مختلف تدابیر آزما کر سہیل کو ہوش میں لے آئے تھے۔ مگر وہ کسی کی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔

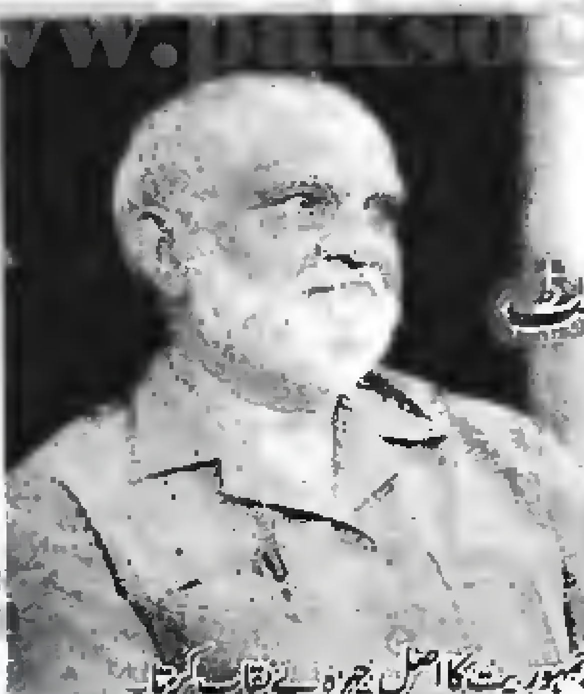
"اس موذی کو کیسے مارا جائے۔" صوفی فیاض نے روہانسی آواز میں گاؤں والوں کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"کچھ نوجوان احتیاطی تدابیر کے ساتھ اندر جائیں اور اسے مارنے کی کوشش کریں۔" پیش امام صاحب نے تجویز دی۔ "ابھی کچھ دیر رک جاؤ، میں نے اپنے بیٹے عدنان کو خانہ بدوشوں کی جھگیوں کی طرف بھیجا ہے، وہاں ایک بہت سیانا جوگی رہتا ہے وہ ہمیں کوئی اچھا حل بتا دے گا۔"

صوفی فیاض کے چھوٹے بھائی شوکت نے انہیں روکتے ہوئے کہا، ابھی اس نے بات ختم کی ہی تھی کہ عدنان جوگی بابا کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ جوگی ایک ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا شخص تھا جس کے کندھے پر میلے سے کپڑے کا تھیلا لٹکا ہوا تھا اور سر پر نارنجی رنگ کی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ سارا

کی خنکی کے لیے ہم پہلے سے تیار ہو چکے تھے اب خنکی اور بڑھ رہی تھی کیونکہ ہم اور بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ ''وائلڈ فلاور ہال جنگلی پھول کا ہال'' 8500 فٹ بلندی پر ہے۔ چاروں طرف حسین سرسبز وادیاں اور بیچ میں وائلڈ فلاور ہال۔ مگر خوب صورت اور حسن ایک اضافی چیز ہے ہم جس ذہنی کیفیت میں اس پہاڑی مقام پر آئے تھے اس کی وجہ سے یہ حسن اور خوب صورتی ہمارے لیے بے معنی تھے۔ وائلڈ فلاور ہال۔ بھارت کے شعبہ سیاحت کا ریسٹ ہاؤس ہے۔ اصل عمارت کے علاوہ کچھ کاٹیج بھی بنے ہوئے ہیں۔ پارکنگ کے لیے الگ جگہ ہے۔ یہاں ہمارا استقبال جے ڈین بھٹ نے کیا۔ وہ کراچی میں بھارتی ہائی کمیشن میں پریس قونصلر ہوتے تھے۔ اس لیے کراچی کے صحافیوں سے ان کا اچھا خاصا تعارف تھا۔ انہوں نے کمروں میں ہماری رہنمائی کی۔ ہم نے ٹیلی گرام آفس وغیرہ کا پتا دریافت کیا۔ ہمیں اب گاڑیوں کے نئے نمبر دیے گئے جو ہماری واپسی تک ہمارے لیے مخصوص رہیں گی اور اس کے بعد ہمیں آسانی تھی کہ جب جی چاہے ہم شہر جا سکتے ہیں۔ صدر بھٹو اور ان کی پارٹی تین ہیلی کاپٹروں سے دوپہر کو ہی شملہ پہنچ گئی تھی۔ پانچ بجے بات چیت شروع ہو چکی تھی۔ معلوم ہوا کہ گرینڈ ہوٹل کے پریس ہال میں 7 بجے بریفنگ ہے۔ جو ٹی این کول بھارت کے فارن سیکریٹری کریں گے۔ ہم نے جلدی جلدی تیار ہو کر پریس ہال پہنچنے کی ٹھانی۔ کیونکہ ہماری منزل بالآخر وہی تھی اور اس کے بعد ٹیلی گراف آفس۔ کمرہ نمبر 3۔ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک میں شریف فاروق (نوائے وقت) اور دوسرے میں عسکری علی شاہ (خیبر میل) نسیم ہمایوں (تعمیر) تھے۔ میرے ساتھی واجد شمس الحسن (ڈیلی نیوز) کو شیخ حامد محمود کی رفاقت نصیب ہوئی تھی۔ دوسرے لوگ باقی کمروں میں بکھرے ہوئے تھے۔ مظہر علی خان اور ایم اے منصوری نیچے الگ الگ کاٹیجوں میں تھے۔

ہم نے پریس ہال کا رخ کیا۔ وہاں بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔ بھارت کے کونے کونے سے صحافی آئے ہوئے تھے۔ غیر ممالک کے صحافیوں کی بڑی تعداد بیٹھی تھی۔ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی بھی موجود تھے۔ ٹی این کول صاحب کا انتظار تھا۔ وہ تو تشریف نہ لا سکے۔ البتہ ایس کے سنگھ جو بیرونی پبلسٹی کے جوائنٹ سیکریٹری ہیں۔ وہ ساڑھے دس بجے کے قریب آئے۔ انہوں نے فارن سیکریٹری کی طرف سے معذرت کی اور بریفنگ کے تین گھنٹے لیٹ ہونے کی کہانی بھی سنائی کہ افسروں کی سطح پر بات چیت طویل ہو گئی۔ اس لیے دیر ہوئی ہے ان کی بریفنگ بڑی دلچسپ تھی۔ وہ دونوں وفود کی طرف سے ایک مشترکہ بیان پڑھ رہے تھے اور اخبار نویسوں کے ہجوم میں سے دبے دبے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ ایس کے اخبار نویسوں میں خاصے مقبول نظر آتے تھے۔ کیونکہ چاروں طرف سے ''ایس کے ایس کے'' کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس بریفنگ سے اتنا معلوم ہوا کہ دونوں سربراہوں کی ملاقات ہوئی جس میں رسمی گفتگو ہوئی بعد میں اور افراد بھی اس گفتگو میں شامل ہو گئے تھے۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس میں آئندہ ملاقاتوں کے لیے موضوعات طے کیے جانے تھے۔ موضوعات کیا تھے دنیا بھر کو معلوم تھا بھارت نے جارحیت کی تھی۔ روس جیسی بڑی طاقت اس کے پیچھے تھی اور کچھ ہماری سیاسی غلطیاں جن کی وجہ سے ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی ناراض ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مشرقی پاکستان پر بھارت کا قبضہ ہو گیا۔ ہمارے بھائی ہم سے جدا ہو گئے۔ 93 ہزار جنگی قیدی کئی ہزار مربع میل سب کچھ بھارت کے قبضے میں تھا۔ ہمارے پاس کیا تھا ایک شکست خوردہ مگر باحوصلہ قوم کا عزم تازہ تیسری دنیا کی متفقہ حمایت۔ مگر یہ سب کچھ اخلاقی سرمایہ تھا۔ مادی نہیں۔ ہمیں جنگی قیدی واپس لینا تھے مقبوضہ علاقے واپس لینا تھے کشمیر اور مشرقی پاکستان کے مستقبل پر بات ہونا تھی۔ یہی موضوعات تھے اور اس میں ترمیمات کا فیصلہ ہونا تھا۔ پہلے کیا اور بعد میں کیا۔ ہم باوقار سمجھوتہ چاہتے تھے مگر بتدریج اب بھارت کے پاس چونکہ ہمارے قیدی بھی تھے اور علاقے بھی۔ اس لیے وہاں Packagedeal یعنی سب کچھ یکمشت کا شور بلند ہو رہا تھا کہ پاکستان کا شیر پھر بھی اس طرح دبا ہوا نہیں ملے گا۔ ابھی جو کچھ حاصل کرنا ہے کر لو۔ لوگ بڑی محبت اور پیار سے ملتے تھے۔ بھارتی صحافی اور بھارتی پریس انفارمیشن کے افسر دیدہ و دل فرش راہ کیے دیتے تھے لیکن ان سب کا سیاسی رویہ اور موقف ایک سا تھا بعض لوگ انتہائی مخلصانہ طور پر کچھ مشورے دیتے تھے۔ بریفنگ کے بعد ہم سیدھے ٹیلی گراف آفس پہنچے۔ تار تیار کیا۔ بات چیت سے



بھارت میں بلیک لسٹ

محمود شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفرنامہ بھارت

آخری حصہ

چنڈی گڑھ ایئرپورٹ شہر سے آٹھ نو کلومیٹر (بھارت میں آج کل فاصلوں کا یہ نظام چل رہا ہے) دور تھی شہر سے باہر باہر ہی ہم شملے کے لیے چل پڑے۔ رستے میں وہی کھیت تھے اور وہی غریب محنت کش، دھوتی بنیان میں ملبوس، سڑک کے اِدھر اُدھر کچھ چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبے آرہے تھے جن سے خوش حالی یا بڑے ملک کا کوئی نشان نہیں جھلکتا تھا۔ کالکا کسولی اور جانے کون کون سے علاقے رستے میں غربت کے مناظر پیش کرتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی بل کھاتے ہوئے پہاڑی راستے شروع ہو گئے تھے جن کے ایک طرف گھاٹیاں، خطرناک گھاٹیاں تھیں۔ اس سڑک کی مرمت ہو رہی تھی۔ کھردرے چہروں والے دبلے پتلے مگر مضبوط بازوؤں والے مزدور پہاڑ کاٹ رہے تھے۔ یہ فرہاد تھے مگر ان کی شیریں، صرف شام کی روٹی تھی۔ شاید مل ہی جاتی ہو۔ مردوں کے ساتھ بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی پہاڑی لباس پہنے پتھر توڑ رہی ہیں۔ ان محنت کشوں کے چہرے پر بھی وہی پسینے کے قطرے تھے جو کسی بھی ملک کے مزدوروں کے چہرے پر ہوتے ہیں۔ وہ اتنی ساری کاروں کو اکٹھے جاتے دیکھ کر ہاتھ روک کر کھڑے ہو جاتے تھے ان کی آنکھوں سے ایک حیرت اور حسرت جھلکتی تھی۔ ہماری کاروں کے کارواں نے رستے میں دو تین مرتبہ پڑاؤ کیا اور چشموں سے ابلتا ہوا پانی نوش جان کیا۔ کاریں زیادہ تھیں۔ رفتار کم۔ اس لیے ہم پانچ بجے کے قریب شملے میں پہنچ سکے۔ شہر میں گرمیاں گزارنے کے لیے آئے ہوئے سکون پسند لوگوں کے سکون اور چہل قدمی میں مداخلت کرتی ہوئی ہماری کاریں منزل کی طرف جا رہی تھیں۔ سیزن میں کاروں کا داخلہ شملہ کے اندر ممنوع ہوتا ہے صرف Summit کی گاڑیاں جا رہی تھیں۔ شملے میں چوٹی کانفرنس کا خاصا اثر نظر آتا تھا۔ ''انڈین آئل'' نے اسے اپنی پبلسٹی کا ذریعہ بنا لیا تھا جگہ جگہ پیٹرول پمپوں پر بینر لگے تھے جن پر پہاڑیوں کی چوٹیاں بنی ہوئی اور اوپر لکھا ہوا کہ انڈین آئل کے ذریعے چوٹی کانفرنس میں پہنچیے، شہر سے گزرے تو یہ گرمیاں گزارنے آئے ہوئے خوب صورت لوگ کھلتے ہوئے رنگوں میں لپٹے کھڑے تھے۔ دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر لگے تھے انگریزی اور ہندی دونوں میں۔ ''دوسرا اعلان تاشقند ہرگز نہیں۔'' یہ بھی کیسا اعلان تھا کہ اس سے پاکستان خوش ہوا اور نہ بھارت۔ دونوں ملکوں میں اس کی رسوائی ہو رہی ہے۔ پہلے ہم ''ہماچل بھون'' پہنچے۔ کیونکہ اس قافلے میں سے کچھ لوگوں کو یہیں ٹھہرنا تھا۔ اس کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہمیں جہاں ٹھہرنا ہے وہ جگہ یہاں سے نو میل دور ہے ابھی کچھ اور موڑ کاٹنے تھے۔ کچھ اور بندی کی پیشانیاں دیکھنا تھیں شملے

ہے کہ نہیں۔ سردار جی کہنے لگے۔ ابھی تو نہیں۔ کل تک شاید کچھ بات چل نکلے۔ میں نے آخر میں پوچھا۔ ”کیا ہم پرامید رہیں۔“ انہوں نے کہا۔ ”کیوں نہیں۔“

ہمیں سردار جی کی بات سے مذاکرات کے رخ کا کچھ اندازہ ہوا۔ اس کے مطابق ہم نے ایک خبر بنائی اور شام کو ہی فائل کردی۔ پھر گرینڈ ہوٹل کے پریس ہال میں جا کر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوا تھا کہ آج پاکستان کی طرف سے بریفنگ ہوگی۔

ہم ہال میں داخل ہوتے ہیں تو بھارتی پریس انفارمیشن کے افسر اور کچھ صحافی گھیر لیتے ہیں۔ خاطر تواضع پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ اپنے میزبان ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔ ہم اپنے تکلف سے اپنے مہمان ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔ وقفوں وقفوں سے اطلاع ملتی ہے کہ بریفنگ کے لیے پاکستان کے سیکریٹری وزارت خارجہ مسٹر افتخار علی آیا ہی چاہتے ہیں۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوتی ہیں تو سیکریٹری وزارت خارجہ کی بجائے بیرون ملک پبلسٹی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر مقبول بھٹی برآمد ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مقبول بھٹی بتاتے ہیں کہ ان کے فارن سیکریٹری ہال کی طرف آرہے تھے مگر ڈرائیور کو شاید راستہ معلوم نہ تھا وہ گاڑی کو کسی اور طرف لے گیا، جہاں سے واپسی کا راستہ بہت طویل تھا اور پیدل بہت چڑھائی تھی۔ فارن سیکریٹری دل کے مریض ہیں وہ اونچائی نہیں چڑھ سکے۔ ان کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی ہے۔ اس لیے وہ گاڑی میں ہی بیٹھ گئے۔ اس کے بعد انہیں پھر میٹنگ میں شرکت کرنا ہے، اس لیے انہوں نے مجھے بھیج دیا ہے کہ میں آپ سے بات چیت کرلوں۔

ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ مذاکرات بڑے کٹھن مرحلے پر ہیں۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دونوں وفدوں کے ارکان کی کوشش ہے کہ ایک متفقہ بیان تیار ہو جائے۔ وہ شاید آپ تک کسی وقت پہنچ جائے۔ آج کی ملاقات دس سے ساڑھے گیارہ بجے تک رہی۔ پھر سہ پہر کو چھ سے سات بجے تک۔ غور وخوض کا موضوع ایجنڈے کی بنیادی اہمیت کے موضوعات رہے ہیں۔ مری میں جو مذاکرات ہوئے ان کی بنیاد پر ہی بات چیت کی جارہی ہے۔ ہمارے صدر محترم شملہ میں مخلصانہ امیدوں کے ساتھ آئے ہیں تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان نئے تعلقات کا دور شروع ہو۔

دوسری میٹنگ کے بعد افسر اپنے اپنے سربراہوں کو رپورٹ دینے کے لیے گئے ہیں۔ آج سربراہوں کی ملاقات نہیں ہوسکی ہے۔ ویسے دونوں سربراہ آج رات کے کھانے پر مل رہے ہیں جو وزیراعظم اندرا گاندھی نے صدر بھٹو کے اعزاز میں دیا ہے۔ یہ ملاقات خالصتاً سوشل ملاقات ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ بات چیت کی رفتار بڑی سست مگر اطمینان بخش ہے۔

ایسی بریفنگ سے اخبار نویسوں کی کیا تسلی ہوتی، وہ اب ایک دوسرے سے کچھ جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے بعد سیسل ہوٹل میں ایس کے کی طرف سے ایک استقبالیہ تھا۔ پاکستانی اخباری نمائندوں کے اعزاز میں۔ یہاں بھارتی اخبار نویس بھی مدعو تھے اور غیر ملکی اخبار نویس بھی۔ جام کھنک رہے تھے۔ کچھ لوگ پرانی یادوں کو تازہ کر رہے تھے۔ لاہور سے گئے ہوئے ہندو شرنارتھیوں کو لاہور یاد آرہا تھا۔ ہندوستان کے علاقوں سے پاکستان میں آباد ہونے والے اپنے علاقوں کے بارے میں کچھ پوچھ رہے تھے۔ یہ بھی ایک عجیب احساس ہے، جس زمین میں پیدا ہوئے، اس زمین سے بچھڑنے کا غم اور ایک نئی زمین کو اپنا وطن بنا لینے کا ایک نیا عزم۔ میں اس احساس سے فرار اختیار کرتا تھا۔ میں ہندوستان کی سرزمین سے اپنے پرانے رشتوں کی راکھ کو کریدنا نہیں چاہتا تھا۔ سفید بالوں والے لوگ یہ باتیں کرتے اچھے لگتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی فضا میں ہم سے کہیں زیادہ عرصے سانس لیے ہیں، ہمارا سرمایہ صرف یہ ہے کہ ہم نے زیادہ سانس آزاد فضا میں لیے ہیں۔

استقبالیہ جب آخری دموں پر تھا تو ایس کے کی آواز آئی۔ میٹنگ سے کچھ اطلاع آگئی تھی۔ اب وہ اس سلسلے میں صحافیوں کو یہیں خبر دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک مشترکہ بیان بھی پڑھ کر سنایا۔ اس میں بھی وہی تفصیل بتائی گئی تھی کہ افسروں کی سطح پر کس وقت اور کہاں ملاقات ہوئی۔ البتہ یہ بتایا گیا کہ وزیراعظم اندرا گاندھی اور صدر بھٹو نے کھانے پر بھی بات چیت کی اور یہ 'ورکنگ ڈنر' تھا۔ اس کے بعد اخبار نویسوں کو پھر ٹیلی گراف آفس بھاگنا پڑا۔ شملے کے ٹیلی گراف آفس میں دہلی سینٹرل ٹیلی گراف آفس کا عملہ لایا گیا تھا۔ کیونکہ دنیا بھر کے اخبار نویس پہنچے ہوئے تھے۔ کام کا

اور کچھ اخبارات سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ چوٹی کانفرنس ایک اور چوٹی کانفرنس کا پیش خیمہ بنے گی۔ ہم نے یہی خبر بھیجی تھی۔ ٹیلی گراف آفس میں شور برپا تھا۔ ٹائپ رائٹر چل رہے تھے۔ ٹیلی پرنٹر کھڑک رہے تھے۔ سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ نکات کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ہمیں رات کی تنہائی اور اندھیرے میں وائلڈ فلاور ہال تک پہنچنا تھا۔ میں اور واجد صاحب ساتھ تھے۔ ہال میں پہنچے تو یاران صحافت کھانے کی میزوں کے سامنے ڈٹے ہوئے تھے۔ آج کی کارگزاری پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ ابھی تک تمام اہل کار پرامید تھے کہ بات یقیناً آگے چلے گی اور ہم مایوس نہیں ہوں گے۔ ہمیں بتایا گیا کہ وائلڈ فلاور ہال میں لوگ ہنی مون منانے آتے ہیں۔ ہم سیاسی ہنی مون منانے آئے تھے۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔ سیاسی ہنی مون سے پہلے بھی تلخیاں اور بعد میں بھی تلخیاں۔ اگلی صبح افسروں کی سطح پر میٹنگ ہونا تھی۔ ہم وائلڈ فلاور ہال سے دس ساڑھے دس بجے نکلے میٹنگ جاری تھی۔ غیر ملکی اخبار نویس ہماچل سیکرٹریٹ کے باہر ڈیرہ جمائے تھے۔ بریفنگ شام کو ہونا تھی۔ ہم بازار کی طرف نکل گئے۔ مری اور شملے میں کافی فرق ہے۔ مری کا سلسلہ کوہ بہت مختصر سا ہے جب کہ شملہ ایک طویل سلسلہ کوہ کے درمیان واقع ہے۔ کیونکہ اسے چاروں طرف سے سرسبز پہاڑ اور وادیاں گھیرے ہوئے ہیں شملہ کا مال روڈ بھی مری کے مال روڈ سے کچھ آگے ہی ہے۔ رونق، رنگ، خوشبوئیں، کچھ موسم بھی تھا۔ کچھ سربراہ کانفرنس کی وجہ سے بھی دور دراز سے لوگ آئے ہوئے تھے اس لیے مال پر ہر طرف رنگ بکھرے تھے۔ صرف پیشانیوں سے گمان ہوتا تھا کہ یہ خواتین ہندومت سے تعلق رکھتی ہوں گی ورنہ وہی بیل باٹم، ساڑھیاں، کھلے بال، فیشن میں پاکستان اور بھارت ایک ہی مقام پر نظر آتے ہیں۔ بھارت ہم سے لاکھوں دس گنا بڑا سہی مگر فیشن میں ہماری خواتین نے بھارتی خواتین کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ مال روڈ پر ہماری دلچسپی کی چیز کتابوں کی دکانیں تھیں۔ ایک جگہ سے اردو اخبار لیے۔ دوسری دکان پر گئے۔ اس کے مالک ملتان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سے ان کی زبان میں گفتگو کی یہ کتابوں کی دکانیں ہماری اونچی سوسائٹی کے مزاج کی کتابیں رکھتی تھیں۔ مثلاً جنس پر، نفسیات پر، بچوں کے لیے انگریزی میں لطیفوں کی کتابیں، انگریزی ناول، نجوم کی کتابیں، پامسٹری، کچھ سیاسی کتابیں بھی سجا رکھی تھیں۔ جن کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ یہ کتابیں صرف پاکستانی وفد کی آمد کے پیش نظر دہلی سے منگوائی گئی تھیں کہ وہ لوگ ایسی کتابیں ضرور خرید کر لے جائیں گے۔ ان میں ولیپ مکر جی کی ''ذوالفقار علی بھٹو۔ اقتدار کی پیاس'' سب سے زیادہ بک رہی تھی۔ بنگلہ دیش پر بھارتی اخبار نویسوں کی تصنیفات بھی بڑی تعداد میں تھیں۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ بھارت کے صحافی اہم موضوعات پر فوری طور پر کتابیں لکھ ڈالتے ہیں تاکہ تمام ضروری کوائف قلمبند ہو جائیں۔ ہمارے سینئر صحافی جو بائیس تئیس سالہ تجربے کا دعویٰ کرتے ہیں انہیں بھی یہ سنجیدہ کام کرنے کی توفیق نہیں ہوتی اس لیے ہمارے ہاں صحافت ایک باقاعدہ سودمند پیشہ نہیں بن رہا ہے۔ بڑے بڑے صحافی تمام راز اپنے سینوں میں دبا کر ساتھ ہی لے جاتے ہیں، قوم اسی طرح محروم رہتی ہے۔ کچھ کتابیں خرید کر، کچھ کتابیں دیکھ کر ہم ہماچل بھون پہنچ جاتے ہیں۔

ہماچل بھون کو اسٹیٹ ہاؤس سمجھ لیجیے۔ بھارتی اخبارات نے لکھا تھا کہ ہماچل بھون کو بہت آراستہ کیا گیا تھا۔ اسے مہمانوں کے شایان شان بنانے کے لیے نئے قالین بچھائے گئے۔ پردے لٹکائے گئے۔ رنگ روغن از سر نو کیا گیا۔ عمارت پر بھارتی ترنگا اور صدر پاکستان کا اسٹینڈرڈ لہرا رہا تھا۔ پاکستان کا پرچم دکھائی نہیں دیا۔ حالانکہ کسی سربراہ کی آمد پر سڑکوں پر مہمان اور میزبان دونوں ملکوں کے پرچم لہرائے جاتے ہیں۔ ہماچل بھون میں اگرچہ سیکورٹی کا سخت انتظام تھا مگر پاکستانی مہمانوں کے لیے آنے جانے کی آزادی تھی۔ ہم اپنے وزرائے کرام سے ملے۔ ابھی تعطل کی فضا تھی۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ ہم وہاں سے وائلڈ فلاور ہال کے لیے روانہ ہوئے، دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ پھر شہر جانے کی سوچنے لگے۔

واپس آرہے تھے تو ایک ترنگے والی گاڑی رکی۔ اس میں سے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ برآمد ہوئے۔ وہ پاکستانی صحافیوں کے لیے رہائش کے انتظامات کا جائزہ لینے آئے تھے۔ میں ان سے مذاکرات کے بارے میں پوچھنے لگا۔ انہوں نے بتایا کہ بات چیت میں خاصی مشکلات پیش آرہی ہیں کیونکہ دونوں ملکوں کو 25 برس سے مسائل درپیش ہیں۔ ان کا ایک دم حل تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ میں نے پوچھا بات کچھ بنی بھی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماےراحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کی اخبار نویسوں سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ ہم ہماچل بھون کے خوب صورت لان میں بیٹھ گئے۔ جس سے شملہ کا پورا منظر دکھائی دیتا ہے۔ سرسبز پہاڑ گنگناتی ہوئی وادیاں۔ اس ہرے بھرے ماحول اور حسین فضا میں ہمیں آپس کی بات چیت میں یہ معلوم ہو رہا تھا کہ بھارت اب تک ہم پر ذلت آمیز امن مسلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ افسروں کی سطح پر ملاقات میں پہلے روز بھارت نے جو مسودہ پیش کیا، وہ تو اعلان تاشقند سے بھی بدتر تھا۔ اس میں بھارت نے بالکل ایک فاتح کی زبان میں گفتگو کی تھی۔ لہجہ عجیب تھا، شرطیں عجیب تر۔ کہنا یہ تھا کہ پاکستان جارحیت سے باز نہیں آئے گا۔ پہلے بھی اس نے تین بار حملہ کیا ہے۔ اب اسے جنگی قیدی واپس مل گئے اور حالات پرسکون ہوئے تو وہ پھر تیاری کرے گا اور کسی نہ کسی روز پھر یہ حملہ کردے گا جنگی قیدی تو واپس نہیں مل سکتے، اس کے لیے تو بنگلہ دیش سے پوچھنا پڑے گا کیونکہ پاکستانی فوجوں نے بھارتی فوجوں اور مکتی فوج کے مشترکہ کمانڈر جنرل جگ جیت سنگھ اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔

ایک شرط یہ تھی پاکستانی فوج کی تعداد بھارتی فوج کے مقابلے میں آبادی کے تناسب سے ہونی چاہیے۔

پھر یہ کہ بھارت کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ پاکستان کی اسلحہ ساز فیکٹریوں اور فوجوں کی انسپکشن کے لیے ماہرین بھیج سکے۔

ایک عجیب پابندی یہ تھی کہ آپ عرب ملکوں سے فوجی سلسلے میں کوئی مدد نہیں لیں گے۔ آپ اپنے فوجی اقتصادی تعلقات کے لیے مشرق وسطیٰ کی طرف رجوع کرنے کی بجائے برصغیر کی طرف رجوع کریں۔ مطلب یہ کہ بھارت کی اسلحہ ساز فیکٹریوں میں خاصا اسلحہ تیار ہوتا ہے۔ دور کیوں جائیے یہیں سے خرید لیا کریں۔

کشمیر کی موجودہ فائر بندی لائن کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کرلیں۔ یہ مسئلہ آپس میں طے ہونا چاہیے اس کو کسی ادارے یا دوسرے فریق کے پاس لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

مغربی پاکستان کی سرحدوں کی حد بندی بھی کئی مقامات پر غلط ہے۔ اس سے بھارت کو دفاعی طور پر نقصان پہنچتا ہے۔ اس لیے ان سرحدوں میں بھی رد و بدل ضروری ہے۔

ان تمام مسائل کا یکمشت طے ہونا ضروری ہے کیونکہ 25 برس سے ان مسائل کے باعث ہی بار بار پاکستان اور بھارت میں جنگ چھڑتی ہے۔

یہ شرائط انتہائی خطرناک تھیں اور ایک طرح سے پاکستان کو بھارت کا غلام بنا لینے کے مترادف۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے بیوروکریٹ اس کے خلاف ڈٹ گئے اور انہوں نے اس ڈرافٹ کو یکسر مسترد کردیا اور یہ بھی کہا کہ یہ ڈرافٹ اس قدر ذلت آمیز ہے کہ اسے مذاکرات کی بنیاد بھی نہیں بنایا جاسکتا۔

بھارتی بیوروکریسی کو دال گلتی نظر نہیں آئی اور دیکھا کہ پاکستانی وفد اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہے۔ تو انہوں نے نظرثانی کے لیے حامی بھرلی۔ پاکستان نے بھی اپنا ڈرافٹ پیش کیا۔ آج جس وقت ہم ہماچل بھون کے وسیع لان میں بیٹھے یہ گفتگو کر رہے تھے۔ اس وقت تک پاکستان اور بھارت کی طرف سے تین تین ڈرافٹوں کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ آخری ڈرافٹ دونوں سربراہوں کے پاس تھے۔ اس وقت انہی ڈرافٹوں پر بات ہو رہی تھی اور دونوں سربراہ بالکل اکیلے تھے۔ درحقیقت یہ پہلی سربراہ ملاقات تھی۔ کیونکہ دونوں سربراہ اکیلے مل رہے تھے۔ پھر افسروں کی سطح پر تفصیلی ملاقات ہو چکی تھیں۔ دونوں طرف سے حتمی ڈرافٹ پیش کیے جا چکے تھے۔ افسروں کو اب مزید کوئی کوشش نہ کرنا تھی۔ دونوں سربراہوں کو اب ادھر یا ادھر کا فیصلہ کرنا تھا۔ دونوں کو اس بات کا اختیار بھی تھا۔

ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے تو ہمارے پروٹوکول کے ایک صاحب نے آکر کہا کہ آپ لوگوں کے اعزاز میں بھارت نے ثقافتی شو کا اہتمام کر رکھا ہے۔ وہ شروع ہو رہا ہے چلیے۔ ہمیں بھی ہماچل بھون میں رکنا تھا کیونکہ صدر بھٹو اور مسز اندرا گاندھی کو بھی اس ثقافتی پروگرام میں آنا تھا۔ ہماچل بھون کا ہال بہت خوب صورتی سے آراستہ تھا۔ روایتی کرپان، بلم، تلوار دیوار پر لگی تھیں۔ ہال مہمانوں اور میزبانوں سے بھرا تھا۔ اگلی قطار خالی تھی۔ جس پر معززین کو آکر بیٹھنا تھا۔ اناؤنسر انتہائی شستہ اردو میں اعلان کر رہے تھے۔

اناؤنسر نے بتایا کہ صدر بھٹو اور مسز اندرا گاندھی بھی کچھ دیر میں پہنچا ہی چاہتے ہیں اس درمیانی عرصے میں ہم

رش تھا۔ اس لیے اخبار نویسوں کو سہولت پہنچانے کے لیے وزارت اطلاعات نے وزارت مواصلات کے تعاون سے خصوصی انتظامات کیے تھے۔ شملہ لاہور سرکٹ کھولا گیا تھا جس کی وجہ سے صرف پانچ منٹ میں تار لاہور پہنچ جاتا تھا۔ ڈان کے ایم اے منصوری بھارت میں نمائندہ کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔ اس لیے ٹیلی گراف آفس میں ان کی جان پہچان بھی بہت تھی۔ رات کا کھانا ہم نے وائلڈ فلاور ہال میں کھایا۔ اس ریسٹ ہاؤس میں دہلی کے اشوکا ہوٹل کی طرف سے انتظامات تھے۔

دو روز گزر گئے تھے۔ بات وہیں کی وہیں تھی۔ بھارتی اخبارات بھی یہی خبریں دے رہے تھے۔ ان کا زاویہ یہ تھا کہ پاکستان مری میں طے شدہ ایجنڈے سے انحراف کر رہا ہے۔ جن سنگھ کے واجپائی کے اخباری بیانات زور و شور سے شائع ہو رہے تھے۔ جن میں بار بار اندرا گاندھی پر زور دیا جا رہا تھا کہ پاکستان سے لگے ہاتھوں وہ حصہ بھی لے لو جسے پاکستان آزاد کشمیر کہتا ہے۔ کیونکہ اس کا پاکستان کے پاس رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔"

اگلی صبح ہم شہر جانے کے لیے تیار ہوتے ہیں تو ہمارے ذہن میں سردار سورن سنگھ کی یہ بات ہوتی ہے کہ آج کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور نکلے گا اور شام تک بات کوئی شکل اختیار کر لے گی۔ اسی امید کے ساتھ ہم چل رہے تھے۔ جمعہ کو تعطل اور بڑھ گیا تھا۔ صدر اور وزیراعظم کی اصل ملاقات نہیں ہو پا رہی تھی۔ آج افسروں کی سطح پر فیصلہ کن بات ہونے والی تھی۔ آج دونوں طرف سے نظر ثانی شدہ مسودوں پر غور ہونا تھا۔ خیال یہ تھا کہ شاید کوئی پہلو نکل آئے۔ ہم ہماچل بھون گئے۔ تو معلوم ہوا کہ صدر بھٹو آج پاکستانی صحافیوں سے ملنے والے ہیں اور اپنے طور بتائیں گے کہ بات چیت کہاں تک پہنچی ہے۔ بیچ میں وقت تھا۔ ہم پھر بازار کی طرف نکل گئے۔ کتاب فروشوں نے کچھ مزید کتابیں لانے کا وعدہ کیا تھا۔ شاید لے آئے ہوں۔ ایک لالہ جی سے میں نے کہا تھا کہ وہ بھارت کی کمیونسٹ پارٹیوں کا لٹریچر دیں۔ انہوں نے اگلے روز کا وعدہ کیا تھا۔ ان کی طرف گیا تو انہوں نے بتایا کہ کمیونسٹ لٹریچر آ گیا ہے۔ اپنی دکان کے ایک کونے میں بلایا اور بڑی رازداری سے کچھ کتابیں دیکھنے کے لیے کہا۔ اس کمیونسٹ لٹریچر میں میکسیم گورکی کی ماں بھی تھی اور اس کے علاوہ تمام وہ پروپیگنڈائی لٹریچر تھا جو روس کا سفارت خانہ پاکستان میں مفت تقسیم کرتا ہے۔ اور اخبارات کے دفاتر میں تو بنڈل کے بنڈل پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے لالہ جی سے کہا کہ یہ تو روس کا لٹریچر ہے جو ہمیں مفت مل جاتا ہے اور بڑی تعداد میں ہمیں تو بھارت کی کمیونسٹ پارٹیوں کا لٹریچر درکار تھا۔ خیر انہوں نے معذرت کر لی۔ ہم نے "ایشیا بک اسٹال" اور "منروا بک ڈپو" سے کچھ مزید کتابیں خریدیں۔ ہمارے موضوعات تو پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش تھے۔ بنگلہ دیش پر ٹونی کی کتاب خاصی بک رہی تھی۔ سبرامینم کی کتاب بھی تھی۔ کچھ چالو کتابیں تھیں۔ جن میں خبریں یکجا کر دی گئی تھیں۔ ان دکانوں پر اپنے دوسرے ساتھیوں سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ کتابوں کی تلاش میں سب مارے مارے پھر رہے تھے۔ ہم نے اپنی برادری میں سے کسی کو ریکارڈوں کی دکان پر جاتے نہیں دیکھا مگر بھارتی اخبارات نے آج یہ خبر بنا دی تھی کہ بھارتی فلمی ریکارڈوں کی خریداری کے لیے پاکستانی وفد کے ارکان ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ بھارتی اخبار نویس اپنی کتابوں کے مقابلے میں اپنے ریکارڈوں کو زیادہ اہم خیال کرتے تھے تو اس میں ہمارا کیا قصور۔ ورنہ ہم تو ان کی کتابوں کے زیادہ قائل تھے کہ ان کے ہاں نہ صرف ان کی قدیم تاریخ، ان کی تحریک آزادی، آزادی کے بعد کے بھارت اور "بنگلہ دیش" کے قیام کے لیے بھارت کی "جدوجہد" اور مسلح مداخلت تک پر کتابیں مل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں پاکستان کی تاریخ، سیاست اور معاشی پہلوؤں پر بڑی اچھی کتابیں ملتی ہیں ایک اردو اخبار نے تو یہ بھی خبر لگائی کہ پاکستان کی وزارت خارجہ کے سیکریٹری جنرل شری عزیز احمد نے ایک دکان سے مکیش کے ریکارڈ خریدے۔

آج ساڑھے تین بجے کے قریب افسروں کی سطح پر ملاقات شروع ہوئی جو سوا گھنٹے تک جاری رہی۔ افسر پھر اپنے اپنے سربراہوں کو رپورٹ دینے کے لیے چلے گئے۔ آج کسی وقت صدر بھٹو اور وزیراعظم اندرا گاندھی کی ملاقات بھی متوقع تھی۔ ہم چھ بجے کے قریب ہماچل بھون پہنچ گئے۔ کیونکہ صدر بھٹو پاکستانی صحافیوں سے ملنے والے تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ صدر، وزیراعظم اندرا گاندھی سے ملنے کے لیے جانے والے ہیں۔ اس لیے صدر

اندرا گاندھی کو رخصت کر چکے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ واجد شمس الحسن اور طارق عزیز ایک طرف رکے رہے۔ بھٹو صاحب نے ہماری طرف دیکھا۔ خیریت دریافت کی۔ خود ہی کہنے لگے میں آپ لوگوں سے ملنے والا تھا مگر ملاقات کا وقت درمیان میں آ گیا۔ پھر سہی۔ ابھی ہم پھر مل رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کوئی وقت مقرر ہوا ہے تو انہوں نے بتایا کہ کل صبح دس بجے۔

ہمارے لیے یہ ایک خصوصی خبر تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کوئی اور اخبار نویس نہیں تھا۔ طارق عزیز کو تو آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون ہے؟ اس لیے اس سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس کے بعد ہم نے ایمبسڈر رسید ھے ٹیلی گراف آفس کی طرف دوڑائی۔ وہاں لوگ پاکستان کے سیکریٹری وزارت خارجہ کی بریفنگ سن کر آئے تھے۔ ان کا آج کی خبروں کا ذریعہ افتخار علی تھے۔ جو کل دل کی دھڑکن تیز ہو جانے کے سبب بریفنگ کے لیے نہیں آ سکے۔ آج خبروں کا ماحصل یہ تھا کہ صدر بھٹو جواز خود وزیراعظم سے ملنے کے لیے ریٹریٹ میں گئے تھے۔ اس سے مذاکرات نے ایک فیصلہ کن سمت اختیار کی ہے۔ ممکن ہے ناکام ہوتے ہوئے مذاکرات سنبھل جائیں اور کچھ بات بن جائے۔ کشمیر آج بھی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

آج مجھے تھوڑا سا وقت ملا تو میں نے بھارت کے ایک مقتدر صحافی پران چوپڑا کا مضمون دیکھا۔

پران چوپڑا 1962ء میں سردار سورن سنگھ کے ساتھ آئے تھے۔ وزرائے خارجہ کی سطح پر بات چیت کا دو چل رہا تھا۔ پران لکھتے ہیں کہ ان مذاکرات کی رپورٹنگ کے علاوہ وہ ایک اور مشن پر بھی تھے۔ جے پرکاش نرائن نے پاک بھارت دوستی گروپ قائم کیا تھا۔ جے پرکاش نرائن پاکستان میں چند جرأت مند لوگوں میں سے اس سلسلے میں رابطہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دہلی میں پاکستان کے ایک سابق ہائی کمشنر مسٹر بروہی کے نام ذاتی خط بھی لکھا تھا۔

پران لکھتے ہیں۔ ''میں بروہی سے ملا وہ اس تجویز سے ہی کانپ گئے۔ مضبوط دل ہونے کی بجائے نرم دل ہوتے ہوئے انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ میں اس کام کے سلسلے میں کسی سے رجوع نہ کروں۔ اسی میں آپ کی خیریت ہے اور اس شخص کی خیریت بھی، جو اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا کہ حالات اتنے خراب نہیں ہونے چاہئیں جتنے بتائے جا رہے ہیں۔ میں نے چوہدری خلیق الزماں سابق سیکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ سے ملنے کی ٹھانی۔ انہیں میں تقسیم سے پہلے جانتا تھا۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑی دیر میں کھلے اور کہنے لگے۔ ایک مہاجر کی حیثیت سے کراچی میں بالکل اچھوت ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہنے لگے۔ زندگی کے آخری برسوں میں پاکستان اور بھارت کے درمیان صلح آشتی ہو جائے تو اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہوگی لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے۔ کیونکہ زندگی کا باقی ماندہ عرصہ ان کے لیے بڑا قیمتی ہے۔

اس کے بعد پران چوپڑا صاحب نے مسٹر بھٹو سے ملنے کی ٹھانی۔ مسٹر بھٹو ان دنوں شہرت کے زینے طے کر رہے تھے۔ انتہائی وضع دار، پر تکلف رہنے سے بڑوں کے لیے بڑا ادب۔ سورن سنگھ کے گاڑی کے پاس پہنچنے سے پہلے خود بڑھ کر کار کا دروازہ کھول دیتے۔ بھٹو صاحب سے میں ملا تو وہ انتہائی گرم جوشی سے ملے وہ مستقبل میں پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں اچھی توقعات رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان مذاکرات کے نتائج کا انتظار کیجیے پھر شاید دوستی گروپ کے قیام سے کچھ زیادہ ہی ممکن ہو جائے۔ اس وقت صبح اور لاپ اس حد تک پہنچ جائیں گے کہ اس کے لیے کسی ملک میں بھی لابی کی ضرورت نہ ہوگی۔

پران چوپڑا لکھتے ہیں کہ ایک یہ مسٹر بھٹو تھے۔ دوسرے مسٹر بھٹو سے میں ذاتی طور پر نہیں ملا لیکن سنا بہت کچھ اپریل 1963ء میں جب پاک بھارت مذاکرات کا سلسلہ ناکام ہو کر ٹوٹ گیا اس وقت دہلی میں مسٹر بھٹو نے جو پریس کانفرنس کی۔ اس میں مسٹر بھٹو کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھی ہوئی زبان سے نکلتا محسوس ہوتا تھا۔ 1965ء کے مسٹر بھٹو کو ہم سب جانتے ہیں۔ ہمارے خیال میں وہ قابل معافی ہے۔ کیونکہ پاکستان میں مقبول ہونے کے لیے بھارت کی مخالفت انتہائی ضروری ہے۔ صدر ایوب کو پاکستانیوں کی نظروں میں مسٹر بھٹو اسی صورت میں گرا سکتے تھے کہ وہ بھارت کے خلاف بڑھ چڑھ کر نفرت پھیلائیں۔ مسٹر کرشن نے یکے بعد دیگر بھارتی وزرائے اعظم کو اس لیے یہ مشورہ دیا تھا کہ صدر ایوب کی سیاسی زندگی کے دوران ہی پاکستان سے

اپنا پروگرام کچھ تبدیل کر کے پیش کریں گے۔ معزز مہمانوں کے آنے کے بعد پروگرام پھر ترتیب سے پیش کیا جائے گا۔

اناؤنسر کی اردو بھی نہایت شستہ تھی اور جملے معنی خیز تھے۔ رقص اور گیت واجبی سے تھے۔ معلوم یہ ہوا تھا کہ یہ لوگ کلو کے پہاڑی علاقے سے آئے ہیں اور پھر پروگرام بھی سارا پہاڑی ہے۔ اس لیے رقص اور گیتوں میں تیزی نہیں ہے۔ گیت پہاڑی پنجابی میں تھے کچھ سمجھ میں آجاتے تھے کچھ اوپر سے گزر جاتے تھے۔ میرے ساتھ طارق عزیز بیٹھے تھے۔ اناؤنسر کی آواز سن کر انہیں بڑا جوش آتا اور بھی خطابت کا شوق بھی آتا مگر آداب محفل کہ خاموشی کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ خالد حسن بھی بڑے مودبانہ انداز سے پروگرام سن رہے تھے پہاڑی لباس میں لپٹی عورتیں حسن و جمال کا ان پر شائبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس ثقافتی پروگرام کی دلچسپی اور رقاصاؤں کے جمال کا اندازہ اس سے لگالیجیے کہ رقص دیکھنے کے بجائے میں، احمد حسن علوی (مساوات) اور واجد شمس الحسن اپنے نوٹس سے خبر تیار کرتے رہے۔ اسی اثناء میں صدر بھٹو آپہنچے اور کچھ دیر بعد مسز اندرا گاندھی۔ اس دور میں ہم پہلی بار اس خاتون کی جھلک دیکھ رہے تھے۔ اب نئے سرے سے پروگرام شروع ہو گیا۔ اناؤنسر بار بار اس بات پر زور دیتے تھے کہ برصغیر کی ثقافت ایک ہے۔ اب جو رقص پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ پاکستان اور ہندوستان میں مقبول ہے۔ ان جملوں کی کاٹ میری سمجھ میں آئی تو تھی اور کوئی انہیں محسوس کرتا یا نہ کرتا۔ میرے آباؤ اجداد بھی اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ کانگڑہ، کلو۔ یہ سب نام بچپن میں سن رکھے تھے۔ کسولی، کالکا، میرے بچپن سے وابستہ ذخیرہ الفاظ میں نظر آتے ہیں مگر اب ہم اپنا ایک آشیاں تعمیر کر چکے ہیں۔ اس کی حفاظت کی کوشش تو کر رہے ہیں۔ اب دیکھیں کہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں اور بھی بہت سے ممالک ہیں جن کے درمیان سرحدیں کھنچ گئی ہیں۔ ثقافت، معاشرت ایک ہی ہے۔ پھر بھی وہ اپنی ثقافتی اور سیاسی وحدت قائم کیے ہوئے ہیں۔ بھارت کی بیٹی رقص کر رہی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں۔ مذاکرات کا کیا ہوا ہے۔ ساتھ میں بیٹھے ایک صاحب اشارہ دیتے ہیں بات کچھ آگے بڑھی ہے تو دونوں سربراہ یہاں آئے ہیں اور اکٹھے بیٹھے بھی ہیں۔ میں بھی دیکھ رہا تھا کہ کبھی کبھی صدر صاحب اور اندرا گاندھی آپس میں بات کرتے تھے سردار سورن سنگھ صدر بھٹو کے بائیں ہاتھ بیٹھے تھے۔ وہ بھی آپس میں بات کرتے تھے۔

بدھائی کا رقص چل رہا تھا۔ کنور کا عوامی رقص تھا۔ بول کچھ یوں تھے۔ "ہماچل پردیش بھارت کا تاج ہے۔ اس کی اونچی اونچی برف پوش چوٹیاں مرنال پرندے کی کلغی کی طرح ہیں نیچے میدانی علاقہ ہے۔ مشکل ترین حالات میں رہنے والے یہاں کے محنتی اور جفاکش لوگ ہنسی خوشی ہر مشکل کا سامنا کرتے ہیں۔

ایک گیت "میریا وزیرا!....." ہندوؤں میں ذات پات اور چھوت چھات کے بارے میں تھا۔ ایک سردار ایک عام خاندان کی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ ذات پات کی دیواریں توڑ کر ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں اور یہ ثابت کر دکھاتے ہیں کہ وہ محبت کرنے والے دلوں کو کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔

ہماچل پردیش کے دارالحکومت میں بیٹھے، ہم اس پہاڑی صوبے کے مختلف اضلاع کے رقص اور ثقافتی مناظر دیکھ رہے تھے۔ سرموری ناٹی چامک رقص ایک دو گانا تھا۔ کنجو، چنچلو جس کے بارے میں بتایا گیا کہ پنجاب میں جس طرح ہیر گائی جاتی ہے اسی طرح سارے ہماچل میں کنجوا گایا جاتا ہے۔

زانی او براتی مت اندا کنجودا
بیری بھری آں بندوقاں او
میرے جندے بیری بھری آں
بندوقاں او

(چنچلو۔ کنجو سے درخواست کرتی ہے۔ کنجو تو اس طرح رات بے رات مت آیا کر دشمنوں نے تجھے مارنے کے لیے اپنی بندوقیں بھر رکھی ہیں۔)

"ہم آزاد ہیں۔ ہماری اپنی حکومت ہے۔ ملک تیزی کے ساتھ شاہراہ ترقی پر گامزن ہے گاؤں گاؤں میں بجلی پہنچ گئی ہے۔ جگہ جگہ کارخانے کھل گئے ہیں۔ نہریں بن گئی ہیں۔ کھلے نیلے آسمان پر ایک ستارہ کی طرح ہمارا ملک دمک اٹھا ہے۔

آخر میں گدا تھا۔ جو خوشی کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ پروگرام ختم ہو گیا۔ سب لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ دونوں سربراہ بھی۔ ہم باہر ہال میں آئے۔ صدر بھٹو

"آپ کا جی بھی چاہتا ہے آنے کو؟" ان میں جی چاہنے یا نہ چاہنے کا سوال نہیں ہے اگر میرے جانے سے کچھ فائدہ ہوگا تو ضرور جاؤں گی۔"

بعد میں دوسرے موضوعات پر بھی بات چیت ہوئی اندرا گاندھی ویسے تو انتہائی اعتماد سے بات کر رہی تھیں ان کا عورت پن بھی بات بات میں جھلکتا تھا۔ ان کے بالوں میں سفیدی اور جواب دیتے وقت مسکراہٹ۔ ڈپلومیٹک مسکراہٹ سے زیادہ زنانہ مسکراہٹ تھی مگر اس زنانہ مسکراہٹ کے باوجود انہوں نے انتہائی ڈھٹائی سے گزشتہ تمام جنگوں کی ذمے داری پاکستان پر ڈالی۔ 1948ء، 1965ء، 1971ء میں ہمیشہ پاکستان نے جارحیت کی۔

اب ہم ان سے کیا بحث کرتے۔ وہ تو سفید دن کو سیاہ رات کہنے پر تلی ہوئی تھیں۔ ان سے کہا گیا کہ آپ کا بڑا ملک ہے بڑا رقبہ ہے بڑی فوج ہے۔ امن کو خطرہ آپ سے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے صاف صاف کہا میں بڑے اور چھوٹے ملک پر ایمان نہیں رکھتی۔ اب بھی ہمارے عوام بالخصوص سرحدی علاقوں کے عوام ڈرتے ہیں کہ پاکستان یقیناً اس پر حملہ کرے گا اور اس کا نشانہ ہم لوگ ہوں گے اس لیے اب جب کہ پاکستان کا وفد بات چیت کے لیے آیا ہوا ہے۔ اس سے جارحیت کا خطرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹالنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔

جنگی قیدیوں کی بات چلی تو انہوں نے اس کو بھی پاکستان کے حملے کے خوف سے نتھی کر دیا۔ جنگی قیدی تربیت یافتہ فوجی اگر آپ کو واپس کر دیں تو پھر آپ ہم پر حملہ کر دیں گے پھر جنگی قیدیوں نے ہماری اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کمان کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس لیے بنگلہ دیش کی اجازت اس سلسلے میں ضروری ہے۔

پاکستان ٹائمز کے ایچ کے برکی نے سوال کیا۔ مادام آپ کہتی ہیں کہ جنگی قیدی تربیت یافتہ فوجی ہیں جنگ نہ کرنے کی ضمانت لیے بغیر انہیں کیسے بھیجا جا سکتا ہے آپ جانتی ہیں کہ ہمارے ہاں افرادی طاقت کی کمی نہیں ہے۔ ہم اتنے ڈویژن اور بھی تیار کر سکتے ہیں۔ جہاں تک اسلحے کے لیے وسائل کا سوال ہے۔"

یہاں مادام اندرا گاندھی نے بیچ میں سوال کاٹتے ہوئے لقمہ دیا۔

"مجھے معلوم ہے وہ بھی بہت ہیں۔"

"پھر۔" ایک صاحب نے کہا۔ "جنگی قیدیوں کو رکھنے سے آپ کیوں کہتی ہیں کہ ہم حملہ نہیں کریں گے۔ یہ تو نیت کی بات ہے۔"

ان سے کہا گیا پہلے جو کچھ ہوا اس کا سبب یہ تھا کہ پاکستان میں غیر نمائندہ حکومتیں تھیں۔ عوام کا اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ اب پہلی بار منتخب نمائندہ حکومت آئی ہے۔

مادام نے کہا۔ یہ درست ہے۔ مجھے بھی اس کا احساس ہے کہ اب آپ کے ہاں منتخب عوامی حکومت ہے لیکن اس سے پہلے جو غیر نمائندہ حکومتیں تھیں ان کے زمانے میں پریس کا کیا کردار رہا۔

"مادام کو بتایا گیا کہ پریس بھی بہرحال حکومت کے کنٹرول میں رہا ہے۔"

بات مسئلہ کشمیر پر آئی تو پھر مادام نے کہا کہ کشمیر پر پاکستان نے حملہ کیا تھا کشمیر تو ہمارا حصہ ہے۔ یہ جارحیت ہے۔

اس پر امین ترین صاحب نے کہا۔ بات گھوم پھر کر وہیں آجاتی ہے۔

دوسرے مسائل پر بھی بات آئی۔ مذاکرات کے سلسلے میں انہوں نے کہا کہ میں اگرچہ زیادہ ناامید نہیں ہوں لیکن کوئی خاص بات ابھی تک نہیں نکلی ہے۔ اس لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

خاصی دیر بات چلتی رہی۔ ہم وہاں سے اٹھ کر آئے تو خبر بھیجنے کی بے تابی تھی۔ واجد شمس الحسن کی خواہش تھی کہ ان کا اخبار پریس میں جانے والا ہوگا اگر اس کو یہ سرخی مل جائے تو بڑی بات ہے۔ وائلڈ فلاور ہال میں ٹیلی گرام کا انتظام ہو چکا تھا۔ وہاں آئے تو انہوں نے جلدی جلدی تار ٹائپ کیا اور ٹیلی گرام والوں کے حوالے کیا۔ تار بہرحال وقت پر چلا گیا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ وقت پر ڈیلی نیوز کے دفتر میں پہنچ سکا تھا کہ نہیں۔ پورا دن ابھی باقی تھا اور مذاکرات فیصلہ کن موڑ پر پہنچے ہوئے تھے۔

ہم پھر شہر کی طرف چل نکلے۔

ہمیں بتایا گیا تھا کہ آج انڈین انفارمیشن والے ایک فلم دکھا رہے ہیں۔ فلم کے لیے وقت دو بجے تھا۔ میں نے

کوئی سمجھوتا کرلیا جائے بعد میں بہت مشکل ہوگا۔

مشرقی پاکستان کے سقوط تک یہی مسٹر بھٹو ہے اور آج کل ہم جن مسٹر بھٹو کو دیکھ رہے ہیں وہ قطعی مختلف ہے یقین نہیں آتا ہے کہ مسٹر بھٹو جیسے جذباتی شخص کو جس ناگفتہ بہ حالت میں ملک ملا تھا، وہ اس کو بھنور سے نکال کر آگے لے چلا ہے۔ اس وقت اگر پہلے والے مسٹر بھٹو ہوتے تو وہ سو مرتبہ غصہ کر چکے ہوتے۔ قمیض پھاڑ لیتے۔ لیکن نہیں وہ اپنے ملک کو انتہائی تحمل سے آگے لے آئے ہیں۔

پران چوپڑا لکھتے ہیں۔ ''اب مسٹر بھٹو اپنے ملک کے سب سے بڑے لیڈر ہیں جو تمام تر مشکلات اور دقتوں کے مقابلے میں بلندیوں پر جا پہنچے ہیں۔ مسٹر بھٹو نے صرف اپنی ذاتی مقبولیت کی طاقت پر یہ شہرت حاصل کی ہے۔ وہ نہ تو قائد ہیں اور نہ تخت کے پیچھے پوشیدہ فوجی ٹولے کا آلہ کار۔ ان کی طاقت عوام کی طاقت پر مبنی ہے۔ اگر آپ کو ہجوم یا بھیڑ کی طاقت پسند ہے لیکن بہر حال یہ طاقت جنتا کی طاقت نہیں ہے۔''

یہ جذباتی، چالاک اور انتہائی تجربہ کار مسٹر بھٹو ہیں۔ جن سے مسز گاندھی کو ملنا ہوگا۔ وہ یقیناً ایک بڑا چیلنج ہوں گے۔ ایک ایسا شخص جس میں اپنے آپ تحفظ کی جبلت بڑی مضبوط ہے جس کا دماغ مختلف قسم کے واقعات نے اور تیز کر دیا ہے۔ وہ چوٹی کی کانفرنس سے کیا حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور مسز گاندھی کو کیا رہنمائی کرنی چاہیے کہ وہ اس میں سے کیا حاصل کریں۔

جواب ظاہر ہے کہ وہ اپنے جنگی قیدی واپس لینا چاہیں گے۔ مغربی پاکستان کے مقبوضہ علاقے حاصل کرنا چاہیں گے۔ یہی دو باتیں بنیاد ہیں سارے مسائل کی۔

آخر میں پران چوپڑا نے یہ لکھا ہے کہ مسٹر بھٹو کے سامنے اب دو تین باتیں ہیں انہیں فیصلہ کرنا ہے کہ وہ برصغیر جنوبی کی تعمیر نو کریں گے یا اس عمل سے باہر رہ جائیں گے لیکن اگر وہ تعمیر نو کے لیے تیار ہیں تو انہیں ان تبدیلیوں کو تسلیم کرنا ہوگا جو کم از کم جزوی طور پر ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں اگر وہ جاتے ہوئے یہ احساس بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تو بڑی بات ہوگی۔''

پران چوپڑا بھارت کے بڑے پرانے صحافی ہیں۔ ان کا طویل اقتباس میں نے صرف اس لیے نقل کیا ہے کہ اس سے بھارت کا مزاج پڑھنے میں مدد ملے گی کہ وہ مسٹر بھٹو سے کیا کیا توقع باندھے بیٹھے تھے۔

ادھر مذاکرات میں ایک موڑ رونما ہو چکا تھا۔ اندرا گاندھی اور مسٹر بھٹو کی بات چیت نے ناکام ہوتے مذاکرات کو کامیابی کی امید عطا کر دی تھی۔ وائلڈ فلاور واپس جا کر ہمیں معلوم ہوا کہ کل صبح ساڑھے آٹھ بجے مسز اندرا گاندھی پاکستانی اخبار نویسوں سے ملاقات کریں گی۔ ہم نے شکر کیا ورنہ شاید صرف رات ثقافتی پروگرام میں مسز اندرا گاندھی کی جو جھلک دیکھی تھی اس پر اکتفا کرنا پڑتا۔

اگلی صبح ہمیں جلدی تیار ہونا پڑا۔ کیونکہ مادام اندرا گاندھی سے بات چیت کرنے کے لیے جانا تھا۔ ری ٹریٹ جہاں مسز اندرا گاندھی قیام پذیر تھیں۔ یہاں پہلے صدر بھٹو کو ٹھہرایا جارہا تھا مگر بعد میں بھارتی حکومت نے جانے کیا سوچا شاید ''ری ٹریٹ'' کے لفظ کو اچھا شگون نہ جانا اور وہاں خود وزیراعظم ٹھہر گئیں کیونکہ اگر برصغیر میں پائیدار امن کے قیام کی ضرورت ہے تو اس کے لیے ری ٹریٹ بھارت کو کرنا ہوگا نہ کہ پاکستان کو۔ خوب صورت ہرے بھرے لانوں میں گھری ایک پرانی سی عمارت جس سے تنہائی جھانک رہی تھیں۔ وہاں جب ہم پہنچے تو لان میں کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں۔ ہمارے ساتھ جے این بھٹ گئے تھے۔ انہوں نے مادام کے پرائیویٹ سیکریٹری سے متعارف کرا دیا۔ ہم اپنی اپنی جگہ بیٹھنے لگے تو مادام بھی عمارت سے آتی دکھائی دیں۔ باری باری سب کا تعارف ان سے کروایا گیا۔ وہ ہاتھ باندھ کر پرنام کیے جا رہی تھیں۔ پھر وہ بیٹھ گئیں تو بات چیت شروع ہوئی ایک عجیب سی فضا تھی۔ جانے کتنے برسوں بعد ایک بھارتی سربراہ اور پاکستانی اخبار نویسوں کے درمیان بات چیت ہو رہی تھی۔ سیکڑوں تلخیاں، ہزاروں کشیدگیاں، برسوں کی دشمنیاں، صدیوں کے فاصلے سب سے پہلے بات پاکستانی صحافی کے منہ سے نکلی تو یہی۔ ''آپ پاکستان کب آرہی ہیں۔''

''آپ کے پریذیڈنٹ صاحب نے دعوت تو دی ہے دیکھئے کب آؤں۔''

''آپ گزشتہ مرتبہ کب آئی تھیں؟''

''پنڈت جی کے ساتھ لیاقت علی خان صاحب کے زمانے میں۔''

کے نکلے تو ہم نے پریس ہال کا رخ کیا۔ پھر ہماچل بھون جا نکلے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ سفارتی سرگرمیاں معطل ہو چکی ہیں۔ اس وقت صدر بھٹو اپنے خصوصی معاون رفیع رضا کے ساتھ بلیرڈ کھیل رہے تھے۔ ہم ابھی یہ تجزیہ ہی کر رہے تھے کہ بلیرڈ کھیلنے کا اس وقت کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ مذاکرات آگے بڑھنے کی امید تھے کہ مادام گاندھی کے پرنسپل سیکریٹری مسٹر ہکسر اور مسٹر ڈی این کول سیکریٹری وزارت خارجہ کچھ فائلیں دبائے۔ ہماچل بھون میں داخل ہوئے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ صدر بھٹو کو خبر کی گئی وہ کوٹ پہنتے ہوئے بلیرڈ روم سے باہر نکلے۔ دریافت کیا۔ کیا وہ لوگ آگئے ہیں؟" بتایا گیا کہ ہاں وہ لوگ آچکے ہیں۔ پھر وہ دونوں حضرات صدر بھٹو سے ملنے چلے گئے۔ ہم نے سوچا کہ بات کچھ بڑھی ہے اور کوئی نیا موڑ ملا ہے۔ جس کی وجہ سے بھارت کے یہ دونوں ڈپلومیٹ یوں اچانک ملنے آئے ہیں۔

ہم ہماچل بھون میں خبر سونگھتے پھر رہے تھے مگر میٹنگیں تھیں کہ ختم نہیں ہوتی تھیں جتوئی صاحب کے کمرے میں جھانکا وہاں شیر پاؤ صاحب بھی تھے۔ ان سے کچھ بات چیت کی۔ ملک معراج خالد سے ملے اتنی دیر میں رات پڑ گئی۔ نیچے ہال میں ایک فلم دکھائی جانے والی تھی۔ "صاحب، بی بی، غلام" بہت عمدہ فلم تھی رنگین نہیں تھی۔ سیدھی سادی بلیک اینڈ وائٹ مگر کہانی اس قدر گھمبیر، دلچسپ کہ فلم سے ادھر اُدھر توجہ نہیں ہٹتی تھی۔ ایک مٹتی ہوئی بوسیدہ تہذیب کی کہانی جس کے کردار جاگیردار اور نواب جو اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارتے ہیں۔ ایک بوسیدہ جاگیردارانہ نظام مٹ رہا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کے خلاف جدوجہد زوروں پر ہے۔ گورودت اس جدوجہد کا ایک کردار تھا۔ اس نے اپنی مختصر سی زندگی میں حقائق کا مقابلہ کیا۔ حقائق کو پیش کیا اور پھر وہ حقائق کی تلاش میں دنیا سے گزر گیا۔ اس فلم میں جاگیردار بھی تھے تماشبین جاگیردار غریب کارکن بھی اور انقلابی گوریلے بھی۔ جو انگریز فوج کو خودساختہ بم پھینک کر ہلاک کرتے تھے۔ یہ فلم دیکھ کر اٹھے تو محسوس ہوتا تھا کہ تین گھنٹے ضائع نہیں ہوئے وحیدہ رحمٰن کا کردار پہلی بار دیکھا۔

اگلی صبح جب ہم اٹھے تو دو جولائی طلوع ہو چکی تھی مذاکرات کا آخری دن ابھی تک معاملہ گومگو ہی تھا۔ معلوم نہیں ہم کیسے لوٹتے ہیں۔ آج اتوار بھی ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ کچھ فوٹو گرافی کرلیں۔ بازار آدھا بند ہے آدھا کھلا ہے۔ آج آخری دن ہے۔ سفارتی سرگرمیاں عروج پر ہیں۔ ملاقات کے مختلف اوقات معلوم ہو رہے ہیں۔ صدر بھٹو پریس کانفرنس بھی کر رہے ہیں جس کا وقت ساڑھے پانچ بجے معلوم ہوتا ہے۔ ہم بازار گھوم کر پریس ہال میں چلے جاتے ہیں۔ جہاں آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے مبصر ظفر پیامی سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان کی بیگم بھی ریڈیو سے کچھ پروگرام پیش کرتی ہیں۔ ایک پرچے کی ادارت بھی کرتی ہیں وہ بھی بیٹھی تھیں۔ کافی دیر تک "باہمی دلچسپی" کے معاملات پر بات چیت ہوتی رہی۔ ہم نے ظفر پیامی صاحب کو ریڈیو پر سنا تھا۔ ظفر پیامی نے ہمارے اخبارات جو کبھی کبھار ملتے تھے ان میں ہمیں پڑھا تھا۔ برصغیر میں امن کیسے قائم ہو اس پر خاصی دیر تک بات رہی۔ ادھر طارق عزیز بہت بڑی محفل جمائے بیٹھے تھے۔ بھارت کے بڑے بڑے اخبار نویس ہمہ تن گوش تھے۔ طارق عزیز کئی روز سے تقریر کا موقع ڈھونڈ رہے تھے۔ آج انہیں اس "پریس کانفرنس" سے خطاب کا موقع مل گیا تھا۔ اتنی دیر میں ایک اخبار نویس آپہنچے۔ وہ سرینگر سے آئے تھے۔ کشمیر کا مسئلہ بھی اس کانفرنس میں زیر غور آنا تھا۔ اس لیے انہیں خاص طور پر بھیجا گیا تھا کہ وہ کشمیر کے موضوع پر نظر رکھیں۔

اس اخبار نویس نے بتایا کہ کشمیر میں صدر بھٹو کی اس تجویز کو بہت پسند کیا تھا۔ جو انہوں نے کسی غیر ملکی اخبار نویس کو انٹرویو دیتے وقت پیش کی تھی کہ کشمیر کے دونوں حصوں کے لوگوں کو دونوں ملکوں میں آزادانہ گھومنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس اخبار نویس کا کہنا تھا کہ گزشتہ 25 برس میں اس سے بہتر تجویز سامنے نہیں آئی۔ اس طرح کشمیریوں کو اپنے بچھڑے رشتے داروں سے ملنے میں بھی آسانی ہوگی اور وہ اس طرح رفتہ رفتہ اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی راہ متعین کرسکیں گے۔

اب ہم پریس کانفرنس کے لیے ہماچل بھون کا رخ کر رہے تھے۔

بھٹو صاحب کی پریس کانفرنس کے بارے میں یہاں بڑا چرچا تھا۔ بھارت کے اخبار نویسوں کو ان کی 1963ء کی دہلی کی پریس کانفرنس یاد تھی۔ اس کے بعد انہیں موقع نہیں ملا تھا کہ وہ

اور واجد صاحب نے پھر بازار میں گھومنے کا ارادہ کیا۔ کتابوں کی دکانیں ہم اچھی طرح چھان چکے تھے۔ اب ان دکانوں میں سوائے جنسی اور سستے ناولوں کے کچھ نہ رہا تھا۔ وہ اپنے ہاں بھی مل جاتی ہیں۔ احتیاطاً ایک بار پھر پوچھ لیا کہ کوئی نئی کتاب آ گئی ہو تو دیکھ لیں مگر مایوسی ہوئی۔ جمنا داس اختر کی کتاب ''پاکستان میں سیاسی سازشیں لیاقت علی خان کے قتل سے لے کر ایوب خان کے زوال تک'' کی ہمیں بہت تلاش تھی۔ ایک دکاندار نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دہلی فون کر کے منگوا دیں گے مگر اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہم آج شملے کی زندگی کو اور قریب سے دیکھنے کے لیے جدید شملے سے اتر کر قدیم شملے میں چلے گئے جسے ''لوئر شملہ'' بھی کہا جا سکتا ہے اوپر والے اور نچلے شملے میں بڑا فرق تھا۔ اوپر انتہائی صفائی، رونق اور رنگ بکھرے تھے۔ جدید سے جدید فیشن دکھائی دیتا ہے۔ ساڑیاں، بیل باٹم، کھلے بال، لانبی قمیصیں، ہپیوں والے بال، دکانوں کے چمکتے دمکتے شوکیس اور نیچے وہی مفلسوں والی زندگی۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹل، جن پر مزدوروں کا ہجوم ہے مزدور بوجھ اٹھائے جا رہے ہیں۔ گاڑیاں کھینچ رہے ہیں، پھٹے کپڑوں والے غریب گندے میلے کچیلے بچے...... یہ بھی شملہ ہے۔ فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے بے گھر لوگ۔ غربت ہندوستان میں بھی پاکستان کے برابر کی ہے۔ حقیقی شملے کی جھلکیاں دیکھتے ہوئے ہم واپس مال روڈ پر پہنچ گئے جہاں ہماری ایمبسڈر DLY155 ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ رٹز سینما جہاں یہ فلم دکھائی جا رہی تھی نزدیک ہی تھی مگر احتیاطاً ہم گاڑی ساتھ لے چلے۔ بھٹ صاحب ہمارے منتظر تھے فلم دیکھنے کے لیے ہمارے وفد کے خاصے ارکان موجود تھے۔ فلم ''پاکیزہ'' تھی۔ کمال امروہی کی ''پاکیزہ''، ہمیں بتایا گیا کہ یہ مرحومہ مینا کماری کی آخری فلم تھی۔ فلم رنگین تھی۔ جس کے پمفلٹ میں کہا گیا تھا۔

''اس کی دنیا میں پیار گناہ تھا۔ وہ بازار میں پیدا ہوئی تھی اور تماشا بننا اس کی تقدیر میں تھا۔ وہ ہر آنے والے سانس کے ساتھ پیدا ہوتی رہی۔ ایک ایک سانس کی ان گنت زندگیاں اور بے شمار موتیں! اس نے مرگ مسلسل قبول کی لیکن اپنے وجود کو صرف اپنا جسم سمجھنے سے انکار کرتی رہی اور جب چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ کمال امروہی کی پاکیزہ کے روپ میں ظاہر ہوئی۔''

ایک اہم ترین مشن پر آئے ہوئے ہم اپنے قیمتی تین گھنٹے اس فلم پر صرف کر رہے تھے۔ اس لیے اس فلم کی طرف توجہ دینا ضروری تھا مگر ہو یہ رہا تھا کہ بار بار توجہ ہٹ جاتی تھی یا پھر یہ فلم ہمیں ''چوٹی کانفرنس'' معلوم ہونے لگتی اور اس کے کردار چوٹی کانفرنس کے کردار، کانفرنس کی طرح اس فلم میں بھی کئی مرتبہ تعطل پیدا ہوا۔ بحران رونما ہوا۔ بھارتی فلموں کے ہم پاکستانی بہت دلدادہ ہوتے ہیں کابل جا کر دیکھتے ہیں۔ لندن میں زیادہ وقت اس نیک کام میں صرف کرتے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ فلم نہ جانے کتنی اچھی فلم ہو گی۔ فلم کے رنگ بھی دلکش تھے۔ فوٹو گرافی بھی عمدہ تھی مینا کماری کی اداکاری بھی انتہائی اعلیٰ تھی مگر فلم کی کہانی وہی گھسی پٹی۔ طوائف اور ایک تماش بین جاگیردار کا چکر! کہانی کئی مرتبہ درمیان میں ختم ہوئی اور کئی بار شروع ہوئی۔ کہانی پر کہانی کار کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ مکالمات بھی وہی تھے جو ایسی فلموں کے بالعموم ہوتے ہیں۔ گیت البتہ اچھے تھے اور ان میں کئی گیت ہٹ ہو چکے تھے۔ یہ گیت تو آپ پاکستان میں بھی سن چکے ہوں گے۔

ان ہی لوگوں نے
انہیں لوگوں نے لے لینا دوپٹہ میرا

☆

چلتے چلتے، چلتے چلتے
یوں ہی کوئی مل گیا تھا، سرِ راہ چلتے چلتے
وہیں تھم کے رہ گئی ہے مری رات ڈھلتے ڈھلتے

☆

موسم ہے عاشقانہ
اے دل کہیں سے ان کو ایسے میں ڈھونڈ لانا

☆

چلو دلدار چلو
چاند کے پار چلو
ہم ہیں تیار چلو
آ ؤ کھو جائیں ستاروں میں کہیں
چھوڑ دیں آج یہ دنیا یہ زمیں
چلو دلدار چلو

اپنے پانچ دنوں میں سے یہ تین گھنٹے یہاں صرف کر

ہے۔'' اس کا جواب اثبات میں ہے۔ مسز گاندھی دستخط کردیتی ہیں پاکستان کے وفد کے سرکاری ارکان صدر پاکستان کے پیچھے کھڑے ہیں مگر بھارت کے وفد میں فارن سیکریٹری مسٹر کول دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ ہندوستان کے بارہ بج کر چالیس منٹ اور پاکستان کے بارہ بج کر دس منٹ۔ معاہدۂ شملہ پر دستخط ہو گئے ہیں۔ تالیاں بج رہی ہیں۔ میں نیچے قالین پر دوسرے کئی اخبار نویسوں کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ سامنے وہ شخصیتیں ہیں جن کی فراست پر برصغیر کے کروڑوں انسانوں کی زندگیوں، خوشحالی اور فلاح و بہبود کا دارومدار ہے۔ آج تاریخ کا ایک اہم باب رقم ہوا ہے۔ کون جانے یہ بات کب تک باقی رہے۔ پھر کوئی نیا موڑ آجائے۔ تاریخ لکھی جارہی ہے۔ مجھے خبر بھیجنا ہے۔ ہم اِدھر اُدھر سے سونگھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت کم علم ہوتا ہے۔ جتوئی صاحب کے کمرے میں جتوئی صاحب اور شیر پاؤ صاحب معاہدے کے مختلف صفحات دیکھ رہے ہیں۔ ساتھ وزارت خارجہ کے سیکریٹری جنرل جناب عزیز احمد بیٹھے ہیں اب معلوم ہونا مشکل ہے۔ اس معاہدے کا صبح نو بجے اعلان ہو گا۔ اِدھر اُدھر سے سونگھ کر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بھارت اور پاکستان مغربی سرحد پر موجود مقبوضہ علاقوں سے اپنی فوجیں ہٹالیں گے۔ کشمیر پر صورت حال جوں کی توں رہے گی۔ دوستانہ تعلقات، معاندانہ پروپیگنڈہ بند۔ تار بھیجتا ہوں۔ شملے سے ایک فون لاہور میں خلیل شفائی صاحب کو کرتا ہوں کہ وہ کراچی فون کردیں۔ معاہدہ ہوگیا ہے۔

ہم جس مقصد کے لیے آئے تھے اس میں سے کچھ تو حاصل ہوا۔ بات چیت آگے تو چلی۔ اب ہمیں تیاری کرنی ہے۔ دو بجے والڈ فلاور ہال پہنچتے ہیں صبح چھ بجے روانگی ہے۔ بڑا سامان پہلے ہی چندی گڑھ جا چکا ہے۔ ہم ہیلی کاپٹروں سے جا رہے ہیں۔ چندی گڑھ پہنچتے ہیں اور سرکاری وفد کی شملے سے آمد کا انتظار کرتے ہیں جو ہمارے بعد آنے والے تھے۔ پی آئی اے کا بوئنگ بھی اسی وقت اتر رہا تھا۔ جب ہمارا ہیلی کاپٹر اترا۔ پی آئی اے کا بوئنگ کراچی سے آرہا تھا۔ اس لیے کراچی کے اخبار اسی وقت مل گئے۔ یہ ایک معجزہ سی لگا کہ بھارت کی سرزمین پر اسی دن کے کراچی کے اخبار 8 بجے مل جائیں۔ چندی گڑھ ایئرپورٹ پر موجود بھارتی افسروں کو بڑی شکایت تھی کہ کراچی کے اخبارات میں سمجھوتے کی جھلکیاں شائع ہوگئی ہیں جب کہ جہاں معاہدہ ہوا اس سے صرف چند میل دور چندی گڑھ سے شائع ہونے والے اخبار ''ٹری بیون'' میں صرف یہی لکھا گیا ہے کہ رات گئے سمجھوتے پر دستخط ہو گئے۔ کراچی کے اخبارات میں 2 جولائی کے بجائے 3 جولائی کی ڈیٹ لائن سے سمجھوتے کی کچھ جھلکیاں بھی دے دی گئی ہیں۔ اتنے میں ایک طوفان آگیا اور اندازہ ہوگیا کہ اب ہیلی کاپٹر آنے میں دیر لگے گی۔

میں یہاں کچھ بھارتی وزراء کا ردعمل جاننے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ ہریانہ کے انتہائی سادہ منش وزیراعلیٰ مسٹر بنسی لال ملے۔ کھدر کے پاجامے کرتے میں ان کے پاس بیٹھا۔ بات شروع کی۔ وہ کہنے لگے۔ ''اچھا ہو گیا جی۔'' میں نے کہا۔ ''کچھ اور بھی بتائیں۔'' وہ جواب دینے لگے ''یا تو جانے آدمیاں کی باتاں ہیں ہم تو صوبے کے وزیر ہیں۔ ہم سے تو صوبے کی بات کرو۔'' بات اتنی معقول ہے کہ اور بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ وی آئی پی روم تھا۔ یہاں پنجاب کے وزیراعلیٰ بھی بیٹھے تھے۔ گورنر بھی۔ سادہ کپڑوں میں سادہ لوگ۔ فارن سیکریٹری بھی یہاں موجود تھے۔ وہ مظہر علی خان صاحب سے بات چیت کررہے تھے۔ بنسی لال صاحب مجھ سے سندھ اور پنجاب میں زراعت کے بارے میں پوچھنے لگے۔ آبپاشی کے طریقوں میں کیا ترقی ہوئی۔ کتنی پیداوار ہے۔ ہم نے تو یہاں یہ تجربے کیے ہیں۔ اپنے علاقے کے مسائل پر ان کی بڑی دسترس معلوم ہوتی تھی۔ ہریانہ اور پنجاب دونوں کا دارالحکومت چندی گڑھ میں ہے۔ بنسی لال صاحب نے بتایا کہ سیکریٹریٹ میں تیسری منزل پر یہ پنجاب کے وزیراعلیٰ گیانی صاحب بیٹھتے ہیں اور چوتھی منزل پر میں بیٹھتا ہوں۔ چندی گڑھ مرکز کے زیر انتظام ہے۔ ہریانہ اور پنجاب دونوں کی حکومتوں نے کرائے پر چندی گڑھ میں دفاتر لے رکھے ہیں۔

کچھ دیر بعد صدر صاحب اور ان کی پارٹی کے ہیلی کاپٹر آگئے۔ اس کے بعد جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ہم جہاز میں جا بیٹھے۔ جہاز میں چندی گڑھ سے لاہور اتنا قریب ہے کہ آئس کریم بھی نہیں کھائی جاسکتی۔ 25 منٹ کا فاصلہ اترنے اور چڑھنے سمیت یہ 25 منٹ اس سے پہلے 25 برس تک پھیلے رہے ہیں۔ ہم 25 منٹ بعد لاہور پہنچ گئے۔ جہاں عوام کا عظیم اجتماع بھٹو صاحب کے انتظار میں تھا۔

☆☆......ختم شد......☆☆

بھٹو صاحب کی پریس کانفرنس دیکھ سکیں۔ ہمارا پہلے سے ہی خیال تھا کہ رش بہت ہوگا لیکن اپنے آپ کو مہمان سمجھتے ہوئے ہم مطمئن تھے۔ ہما چل بھون جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور وقت مقررہ کا انتظار کرنے لگے اور یہ خیال نہ رہا کہ پریس کانفرنس میں جگہ بھی نہیں ملے گی۔ وہی ہوا بھی۔ جب پریس کانفرنس میں پہنچے تو پیچھے چند کرسیاں خالی تھیں اور بس معلوم ہوا کہ بھٹو صاحب مادام اندرا گاندھی سے ملنے گئے ہیں۔ یہ ناکام ہوتے مذاکرات کو کامیاب بنانے کی آخری کوشش ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ پاکستان کشمیر کے مسئلے پر اڑا ہوا ہے اور بھارت اس کو لگے ہاتھوں حل کروانے کی فکر میں ہے۔ افسروں کی سطح پر مذاکرات تقریباً ناکام ہو چکے ہیں۔ کچھ غیر ملکی اخبار نویس تو یہ خبر بھی بھیج چکے ہیں کہ مذاکرات ناکام ہو گئے۔ بھٹو صاحب آ گئے ہیں۔ پریس کانفرنس شروع ہو رہی ہے۔ بھٹو صاحب نے رکی جملوں کے بعد انکشاف کیا ہے کہ ”اگر چند منٹ قبل میں وزیراعظم اندرا گاندھی سے نہ ملا ہوتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ ہم یہاں سے کامیاب جا رہے ہیں نہ ناکام لیکن اب میں کہہ سکتا ہوں کہ بات آگے بڑھی ہے اور ہم ڈنر سے پہلے اور ڈنر کے بعد بھی مل رہے ہیں اگر رات گئے مجھ سے ملیں تو شاید آپ کو کوئی خبر دے سکوں۔“

اس پریس کانفرنس میں باتیں اصولی ہی ہوئیں کیونکہ ابھی بھٹو صاحب کوئی خاص بات کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ غیر ملکی اخبار نویس، بھارتی صحافی بڑے سخت اور خطرناک قسم کے سوالات پوچھ رہے تھے اور گھیراؤ کی کوشش کر رہے تھے مگر بھٹو صاحب تو پریس کانفرنس کے ماہر ہیں۔ آدمی سوچ سکتا ہو، کچھ کہنے کو ہو تو کون سی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔

اس پریس کانفرنس سے اخبار نویس بڑے متاثر نظر آتے تھے باوجود اس کے کہ انہیں کوئی خبر نہیں ملی تھی مگر وہ مطمئن تھے کہ رات تک کچھ علم ہو ہی جائے گا۔ آج بھارت میں ہماری آخری رات تھی۔ کل صبح ہم وطن کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ نیلی گراف آفس گئے۔ پریس کانفرنس شملے سے دوسرے مقامات پر منتقل ہو رہی تھی۔ میں صرف اتنا اور اپنے دفتر کو یہ اطلاع بھیجتا ہوں کہ رات گیارہ بجے تک انتظار کریں۔ معاہدہ طے ہونے کا امکان ہے جس میں فوجوں کی واپسی، سفارتی تعلقات کی بحالی، دوستانہ ماحول کے قیام کے سلسلے میں مختلف امور ہوں گے۔ پھر ہم پریس ہال میں جا پہنچے۔ دس ساڑھے دس بجے تک ہما چل بھون پہنچنا ہے۔ فی الحال وہاں صدر بھٹو کی طرف سے ڈنر ہے۔ اب کے شملہ میں جگہ کی تنگی اور پاکستانی وفد کی زیادہ تعداد ہونے کے سبب ضیافتیں کئی حصوں میں ہوتی رہی ہیں۔ صدر بھٹو کے ڈنر میں بھی سب مدعو نہیں ہیں۔ اس کے دعوت نامے ہماری وزارت خارجہ نے دیئے ہیں۔ کچھ ایڈیٹروں کو بلایا ہے، وزارت خارجہ کی ڈکشنری میں ایڈیٹر صرف انگریزی اخبار والا ہوتا ہے۔ مظہر علی خان، عسکری علی شاہ، واجد شمس الحسن اور امین ترین مدعو تھے۔ اردو اخبار یا رسالہ کتنا ہی موثر اور کتنی ہی اشاعت رکھتا ہو، وزارت خارجہ کے نزدیک اس کا ایڈیٹر نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم اپنا ڈنر ہوٹل گرینڈ میں ہی کھا رہے تھے۔ یہاں سے ہم ساڑھے دس بجے کے قریب ہما چل بھون پہنچے۔ میرے ساتھ مساوات کے احمد حسن علوی تھے۔ ڈرائنگ روم میں واجد شمس الحسن ملے انہوں نے کہا کہ یہاں تاریخ بن رہی ہے۔ آج یہیں ٹھہرنا ہے۔ ابھی چند لمحوں میں برصغیر کی تاریخ کا ایک نیا باب لکھا جانے والا ہے لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کیمرہ مین، فوٹو گرافر، اخبار نویس ہال میں جمع ہو رہے تھے۔ ڈرائنگ روم جہاں پریس کانفرنس ہوئی تھی وہاں سے کرسیاں میز غائب ہو چکی تھیں۔ صرف قالین بچھا تھا سوا گیارہ بجے تو ایک میز بھی آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسٹیشنری آ گئی پھر پاکستان اور بھارت کے چھوٹے پرچم آ گئے۔ اخبار نویسوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کچھ بات بن رہی تھی۔ دو کرسیاں آ گئیں، بیورو کریٹ دکھائی دینے لگے۔ سیڑھیوں کے ساتھ والے دروازے پر سب کی نظریں لگی تھیں۔ ٹیلی ویژن والے اپنی لائٹیں درست کر رہے تھے۔ وہ گھڑی نزدیک آ رہی تھی۔ کیا طے ہوا کیا نہیں ہوا کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ بارہ بج گئے۔ 2 جولائی گزر گئی۔ بارہ بج کر پندرہ منٹ، بیس منٹ، پچیس منٹ، تیس منٹ، پینتیس منٹ۔ صدر بھٹو اور مسز گاندھی آ گئی ہیں، مسز گاندھی پہلے اس کرسی پر بیٹھنے لگیں جس کے سامنے پاکستانی پرچم تھا، صدر بھٹو نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا اور دوسری کرسی پر بیٹھنے لگیں تو ان کا پرس نیچے جا پڑا ایک پروٹوکول افسر نے پرس اٹھایا۔ بارہ بج کر چالیس منٹ پر دستخط ہونے والے ہیں مسز گاندھی مسٹر بھٹو سے انگریزی میں پوچھتی ہیں۔ ”آپ نے اسے پڑھ لیا



شادی کے روز میں صبح سویرے بیدار ہو گیا اور ناشتے کے فوراً بعد روانہ ہو گیا تا کہ شادی کے کاموں میں اپنے دوست کی مدد کر سکوں۔ شادی اگرچہ شام کو ہونا تھی لیکن گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یوں مہمانوں کی دیکھ بھال اور تیاریوں میں دن گزرنے کا پتا بھی نہ چلا اور شام کو رسموں کا آغاز ہو گیا۔

سہرا بندی ہونے تک اندھیرا چھا چکا تھا۔ پھر بارات بینڈ باجے کے ہمراہ دھوم دھام سے روانہ ہوئی اور ناچتے گاتے بھنگڑا ڈالتے تقریباً گھنٹہ بھر میں دلہن کے ہاں پہنچے۔ وہاں ہمارا بہت پرجوش استقبال ہوا اور سردی کی وجہ سے بارات کی مٹھائی اور چائے سے تواضع کی گئی۔ پھر نکاح کی سنت ادا کی گئی۔ خطبہ نکاح اور مبارک بادوں کے طویل سلسلے کے بعد کھانے کا آغاز ہوا۔

گاؤں میں عورتوں اور مردوں کے کھانے اور بیٹھنے کا الگ الگ انتظام ہوتا ہے۔ پہلے مردوں کو کھانا کھلایا گیا پھر خواتین کا نمبر آیا۔ اس وقت تک رات کے گیارہ بج چکے تھے اور ابھی بارات کی واپسی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں نے سوچا جب تک بارات واپس جائے گی اور پھر کوئی مجھے چھوڑنے جائے گا تب تک کافی دیر ہو چکی ہوگی اور میری والدہ کو بھی دیر تک بیٹھ کر میرا انتظار کرنا پڑے گا لہٰذا بہتر یہی ہے کہ میں اکیلا ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ ویسے بھی میں اتنی مصروفیت میں ان کو مزید تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ یوں میں اپنے دوست کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود تنہا گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

یہاں سے ہمارا گاؤں تقریباً گھنٹہ سوا گھنٹے کے پیدل راستے پر تھا، جوانی کا آغاز تھا۔ ڈر، خوف کا ذہن میں دور دور تک گزر نہ تھا ویسے بھی گاؤں میں اتنا پیدل چلنا معمولی بات سمجھا جاتا ہے۔ سو میں نے بھی اللہ کا نام لے کر سفر کا آغاز کر دیا۔ میں بہت تیزی سے چل رہا تھا لیکن تھوڑی دیر میں سردی کی شدت نے مجھے کپکپانے پر مجبور کر دیا۔ تبھی میں نے شارٹ کٹ سے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ راستہ مجھے تقریباً پندرہ منٹ پہلے پہنچا دیتا۔ یہ ایک ویران علاقہ تھا جس میں جابجا گھنے درخت اور جھاڑیاں تھیں اور وسط میں قبرستان تھا۔ دن میں تو لوگ بے دھڑک وہاں سے گزرتے تھے لیکن رات میں اسے استعمال کرنے سے گریز کرتے تھے لیکن میں نے بے خوفی سے اپنے قدموں کا رخ ادھر موڑ دیا۔

ابھی رات زیادہ نہیں بیتی تھی لیکن گاؤں میں لوگ جلد ہی کاروبار زندگی بند کر کے گھروں میں بند ہو جاتے ہیں اس لیے ہر طرف سناٹا تھا چونکہ چاند کی آخری تاریخیں تھیں اس لیے ہر طرف



غیبی امداد

شاہدہ ذاکر

اگر اس رات وہ مہربان ضعیفہ میری مدد نہ کرتیں تو......

سال تھا 1975ء کا اور مہینا تھا دسمبر کا۔ میری عمر اس وقت پندرہ سال تھی اور میں میٹرک کا طالب علم تھا۔ اگرچہ اس واقعے کو گزرے تقریباً چالیس برس بیت چکے ہیں مگر ابھی تک یہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ میری یادداشت میں محفوظ ہے۔

میرا تعلق صوبہ پنجاب کے ایک نہایت خوب صورت اور سرسبز و شاداب گاؤں سے ہے۔ والد صاحب ایک خوش حال زمیندار تھے اور والدہ دن بھر گھریلو امور اور ہماری یعنی اپنی اولاد کی دیکھ بھال اور تربیت میں مگن رہا کرتی تھیں۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ سب سے بڑے بھائی پھر تین بہنیں اور آخر میں میرا نمبر ہے جو چھوٹا ہونے کی وجہ سے اپنی والدہ کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اگرچہ میں کم عمر تھا لیکن گاؤں کی تازہ اور عمدہ خوراک اور صاف ستھری، قدرتی آب و ہوا کی وجہ سے میں نے خوب قد کاٹھ نکالا تھا اور اپنی عمر سے بڑا نظر آتا تھا۔

وسیم میرا بہت قریبی دوست اور ساتھی تھا۔ ہم نہ صرف ہم جماعت تھے بلکہ ہمارے گھر بھی قریب قریب تھے۔ اگرچہ اس کا تعلق دوسرے گاؤں سے تھا مگر وہاں میٹرک تک تعلیم کی سہولت میسر نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے چچا کے گھر رہائش پذیر تھا جو ہماری ہی گلی میں رہتے تھے۔ ہم مل کر اسکول آتے جاتے اور شام کو بھی اکٹھے ہی کھیلنے کے لیے جاتے جس کی وجہ سے ہمارے اکثر دوست اسے میرا بھائی ہی سمجھتے تھے۔ میری والدہ بھی اس سے نہایت شفقت آمیز رویہ رکھتیں اس لیے اس کا ہمارے گھر بھی بے تکلفانہ آنا جانا تھا۔ گرمی کی چھٹیاں وہ اپنے گاؤں میں گزارتا۔ اس مرتبہ واپسی پر وہ اپنے بڑے بھائی کی منگنی کی خوش خبری اور مٹھائی لایا۔ شادی دسمبر میں مقرر ہوئی تھی۔

ہم دونوں کی شدید خواہش تھی کہ میں اس میں شرکت کروں۔ اپنے والدین کی اپنے لیے محبت اور فکرمندی کو دیکھتے ہوئے مجھے زیادہ امید نہیں تھی کہ وہ مجھے اکیلے دوسرے گاؤں جانے کی اجازت دیں گے لیکن میرے اور وسیم کے شدید اور لگاتار اصرار کے باعث وہ رضامند ہو گئے لیکن شرط یہ تھی کہ رات کو میں ہر حال میں گھر واپس آجاؤں گا۔ وسیم نے وعدہ کیا کہ اس کے بھائی مجھے واپس چھوڑ جائیں گے۔



بلا..... میرا محسن

کنزہ ملک

بچپن کی ایک نیکی پُر اسرار طور پر اُس دوشیزہ کو بہت بڑے نقصان سے بچا گئی

موسلا دھار بارش جاری تھی اور شام کا وقت تھا۔ میں چھت پہ جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ مجھے بارش میں نہانے کا بہت شوق ہے۔ اسی لیے چھت پہ جا کر بارش کی ننھی ننھی بوندوں سے لطف اندوز



تاریکی کا راج تھا۔ دور دور تک آدم نہ آدم زاد اور مکمل خاموشی ایسے میں پاؤں کے نیچے چرچراتے پتوں کی آواز بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ جب کوئی پرندہ اڑتا یا کوئی چھوٹا سا جانور بھاگ کر پاس سے گزرتا تو میں چونک جاتا۔ رفتہ رفتہ ویرانی، تاریکی اور مہیب سناٹے نے مجھ پر ہیبت طاری کرنا شروع کردی۔ ایسے میں درختوں کے سائے بھی عجیب شکلیں اختیار کرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد شروع کر دیا اور بخیریت گھر پہنچنے کے لیے دعائیں کرنے لگا۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی ٹارچ تھی جس کی روشنی میں تھوڑی دور تک نظر آجاتا تھا۔ میں تقریباً بیس پچیس منٹ میں قبرستان تک پہنچ گیا۔

اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس کے مدھم سے بلب کی روشنی میں مجھے کچھ کتے محو آرام نظر آئے۔ میری موجودگی سے چوکنا ہو کر وہ بھونکنے لگے اور چند ایک تو میرے پیچھے لپک کر آئے۔ میں نے خوفزدہ ہو کر تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا لیکن تھوڑی دور جا کر جھاڑیوں میں الجھ کر میں بری طرح گر گیا۔ ویسے تو مجھے معمولی خراشیں آئی تھیں لیکن وہاں پر ایک درخت کا کٹا ہوا تنا تھا جس سے ٹکرا کر میری ٹانگ شدید زخمی ہوگئی اور خون بہنے لگا۔ اب تک میں کتوں کی پہنچ سے دور آچکا تھا۔

ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو زخم گہرا تھا اور میرے پاس خون روکنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اچانک مجھے کچھ فاصلے پر ایک مدھم سی روشنی ٹمٹماتی ہوئی نظر آئی۔ جب میں وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک جھونپڑی میں دیا جل رہا ہے۔ میں نے ان سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ میرے پکارنے پر ایک ضعیفہ باہر آئیں اور میری بات سن کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئیں۔ انہوں نے مجھے ایک کپڑا اور دوائی دی۔ میں نے زخم صاف کر کے دوائی لگا کر پٹی باندھ لی جس سے خون رک گیا۔

انہوں نے بتایا کہ وہ بے اولاد ہیں اور اپنے شوہر کے ساتھ برسوں سے یہاں مقیم ہیں جو آج کسی ضروری کام سے قریبی شہر گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے منع کرنے کے باوجود مجھے گرم گرم دودھ کا ایک گلاس پلایا جس کی خوشبو اور ذائقہ میں آج تک نہیں بھلا سکا۔ تھوڑی دیر رک کر جب میں روانہ ہونے لگا تو سردی کی شدت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مجھے زبردستی ایک گرم شال دے دی۔ میں ان کے اخلاق اور مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوا اور تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کیا۔

گرم گرم مشروب اور شال نے سردی کی شدت کو کم کر دیا۔ ان سے ملاقات نے خوف بھی کم کر دیا تھا۔ لہٰذا میں تیزی سے چلتا رہا اور آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ گیا۔ میری والدہ میرے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ پورا واقعہ سن کر وہ ان نادیدہ خاتون کی شکر گزار ہوئیں اور مجھے صبح شال واپس کرنے کی ہدایت کی اور پھر ہم سونے چلے گئے۔

دوسرے دن بھائی کے ساتھ بائیک پر میں شال واپس کرنے کے لیے جانے لگا تو میری والدہ نے تحفتاً ان کے لیے کچھ تازہ پھل بھی دیے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو آدم نہ آدم زاد، دور دور تک کسی جھونپڑی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ بھائی سمجھے شاید میں جگہ بھول گیا ہوں لہٰذا ہم نے اس علاقے میں دور تک تلاش کیا۔ حیرت سے میرا برا حال تھا۔ پھر ہم مسجد گئے اور امام صاحب سے جھونپڑی کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ وہاں گزشتہ بیس برس سے رہائش پذیر ہیں لیکن انہوں نے آج تک وہاں کوئی جھونپڑی نہیں دیکھی۔

جب میں نے انہیں پورا واقعہ سنایا تو انہوں نے کہا اللہ کے راز اللہ ہی جانے۔ نہ جانے وہ اللہ تعالیٰ کی کون سی مخلوق تھی جس نے اس رات میری مدد کی۔ اس راز سے آج تک پردہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ اگرچہ انہوں نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن میں کافی عرصہ خوفزدہ رہا اور اس راستے پر پھر کبھی تنہا نہیں گیا۔

☆☆☆

تھے۔ خیر میری کال سنتے ہی وہ گھر کے لیے روانہ ہوئے۔

میں ہمسائیوں کی مدد سے رمشا کو ہسپتال لے گئی اور اکمل بھی جلدی آ گئے۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد رمشا کو ہوش آیا تو ہم گھر آ گئے۔ اگلی صبح جب میں نے رمشا سے پوچھا۔

''بیٹے ..... کیا ہوا تھا۔ تمہیں؟''

''امی!''

پھر جو اُس نے بتایا تو حیران ہونے کے لیے کافی تھا۔ آج احسان فراموش اپنا بدلہ چکا گیا تھا۔ اب مجھے اُس کا احسان مند ہونا تھا۔ رمشا ٹیوشن سنٹر سے گھر آ رہی تھی۔ راستے میں انسانی بھیڑیے تاک لگائے بیٹھے تھے۔ انسانی روپ میں شیطانوں نے میری بیٹی کو نوچنا چاہا۔ جانے وہ آوارہ کتے کب سے میری بیٹی کے پیچھے پڑے تھے اور اپنے ناپاک ارادوں سے میری بیٹی کی عزت خاک میں ملانا چاہتے تھے۔ ٹیوشن سنٹر سے گھر تک آنے میں کھیتوں سے گزر کر آنا پڑتا تھا۔

رمشا جب کھیتوں سے گزر رہی تھی تو اُس وقت ان درندوں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ یہ درندے اچانک رمشا کے سامنے آ گئے اور اس سے بدتمیزی کرنے لگے۔ اس سے پہلے کہ میری بیٹی بے آبرو ہو کر جیتے جی مر جاتی۔ کھیتوں سے موٹا تازہ بوڑھا سا بلا نکلا اور آناً فاناً چاروں درندوں کے چہرے نوچ لیے۔

اُن کے چہروں سے خون فوارے کی طرح پھوٹ پڑا تھا اور رمشا اُن کے چنگل سے آزاد ہو کر گھر کی طرف بھاگی۔ جوتے وہیں رہ گئے، بیگ بھی، دوپٹہ بھی۔

آج اللہ نے میری لاج رکھ لی تھی۔ ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتی۔ میرے لبوں پہ خیر کے کلمات نکل رہے تھے۔ ابھی ہم ماں بیٹی صحن میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ دیوار سے میاؤں میاؤں کی آواز آئی۔ میری نظریں آواز کے تعاقب میں اُٹھ گئیں اور دوسرے لمحے میری بیٹی رمشا خوشی

ہم پیار سکھانے والے ہیں

تم اپنے عقیدوں کے نیزے
ہر دل میں اُتارے جاتے ہو
ہم لوگ محبت والے ہیں
تم خنجر کیوں لہراتے ہو
اس شہر میں نغمے بہنے دو
بستی میں ہمیں بھی رہنے دو
ہم پالن ہار ہیں پھولوں کے
ہم خوشبو کے رکھوالے ہیں
تم کس کا لہو پینے آئے
ہم پیار سکھانے والے ہیں

(شاعر: احمد فراز)

سے کہہ رہی تھی۔

''امی! یہی بلا تھا۔'' جس نے مجھے بچایا۔ جس نے میری عزت بچائی۔ امی یہی تھا۔ یہی تھا۔''

اور مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی تھی۔ یہ وہی بلا تھا جس کو بارش میں اس کے بچپن میں کمرے میں لے جا کر دودھ پلایا تھا۔ اُس کی بھوک مٹائی تھی، اُس کی جان بچائی تھی۔

آج اُس نے میری بیٹی کی عزت، آبرو بچا کر بدلہ چکا دیا تھا۔ وہ احسان فراموش نہیں تھا اور میں سوچ رہی تھی انسانوں سے یہ جانور بھلے جو احسان فراموش نہیں ہوتے۔ انسان تو انسانوں کو نوچتے پھرتے ہیں۔

اُس کے بعد میں بلے کا انتظار کرنے لگی کہ وہ دیوار سے نیچے اُتر آئے گا اور میں اُس کی بے پناہ خدمت کروں گی۔ لیکن وہ دیوار سے ایسے غائب ہوا جیسے آیا ہی نہیں تھا۔ نہ میں دیوار سے نیچے اُترتے دیکھا۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے ہی غائب ہو گیا تھا۔ یا وہ واقعی بلا تھا...... یا اُس کا تعلق جنات سے تھا؟ اس سوال کا جواب بھلا کون دے سکتا تھا۔

☆☆☆

ہونا چاہتی تھی۔ آخری سیڑھی چڑھتے ہوئے میری نظر سامنے چھت کے آخری کونے پر پڑی تو میں حیران رہ گئی۔ معصوم کالے رنگ کا بلی کا بچہ ٹھنڈ کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ مجھے جانوروں سے بہت ڈر لگتا ہے، جانوروں میں، بلی، کتے، ہوں تو اور بھی زیادہ دور بھاگتی ہوں۔ مگر بلی کے اس بلونگڑے کو دیکھ کر نجانے کیوں جذبہ ہمدردی جاگ اُٹھا۔ اسی جذبے کے تحت میں آگے بڑھی۔ بلونگڑے کو اُٹھایا اور فوراً چھت سے نیچے اُتر آئی۔ کمرے میں جا کر بلی کے بلونگڑے کو اچھی طرح تولیے سے صاف کیا، اور پیالے میں دودھ ڈال کر پلایا۔

مجھے اس بلی کے بچے پر بہت پیار آ رہا تھا۔ ایسا پیارا بچہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کالی سیاہ رنگت، اُس کی آنکھیں ہیرے کی طرح چمکتی تھیں۔ میں اُسے بانہوں میں بھر کر پیار کرتی رہی۔ وہ شاید بھوکا تھا۔ جب دودھ کا پیالہ اُس کے سامنے رکھا تو اُس نے لپ لپ کر کے دودھ پیا اور زبان سے منہ صاف کیا اور پُرسکون ہو کر اونگھنے لگا۔ اُس کی پیاس بجھ چکی تھی اور اب کانپ بھی نہیں رہا تھا۔ میں اُس کو کمرے میں چھوڑ کر پھر سے چھت پہ چلی گئی۔ بارش اب بھی برس رہی تھی۔

گرمی کا زور ٹوٹ گیا تھا چرند، پرند اور حضرت انسان خوش ہو گئے تھے۔ میں چھت پہ کھڑی اردگرد کے نظارے کر رہی تھی۔ بچے گلی میں بارش کے پانی میں کھیل رہے تھے اور سڑک پہ گاڑیاں بھاگ رہی تھیں۔ ہر چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں روح کو سکون بخش رہی تھیں۔

میں شاید چھت پہ اور ٹھہرتی مگر ماں جی کی آواز پہ مجھے نیچے کمرے میں جانا پڑا۔ کمرے میں داخل ہوئی تو بلی کا بچہ غائب تھا۔

ہیں...... یہ کہاں گیا میں نے چارپائی کے نیچے، بیڈ کے نیچے دیکھا مگر مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ وہ جا چکا تھا، احسان فراموش۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور خود سے باتیں کرتی میں گھر کے کاموں میں جت گئی۔

☆......☆

یہ دو سال گزرتے چلے گئے۔ میں لڑکپن سے جوانی میں پہنچی تو ماں باپ نے میری شادی کر دی۔ اکمل ہنس مکھ اور پیار کرنے والے شوہر ثابت ہوئے۔ ساس، سسر شادی کے چند سال بعد فوت ہو گئے۔ زندگی بڑی خوش گوار گزر رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے تین بیٹیوں اور دو بیٹوں سے نواز دیا۔ میری بڑی بیٹی رمشا دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ فریحہ پانچویں اور ننھی علیشاہ صحن میں دوڑتی تھی۔ بیٹے علی ساتویں اور کاشان چھٹی میں پڑھتے تھے۔

جون کا مہینہ تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں اسکولوں میں ہو چکی تھیں۔ رمشا محلے میں ٹیوشن جاتی تھی۔ بورڈ کا امتحان جو تھا۔ خوب تیاری کرنی تھی۔ علی اور کاشان، فریحہ نانو کے گھر چلے گئے تھے۔

اکمل کی دوسرے شہر پوسٹنگ ہو گئی تھی اور پندرہ دن بعد گھر کا چکر لگاتے تھے۔ میرا گھر شہر کے مضافاتی علاقے میں تھا۔ یہاں چند خاندان آباد تھے۔ پُرسکون ماحول، نہ گاڑیوں کا دھواں نہ شور و غل لیکن...... لیکن ایک دن میری زندگی میں ہلچل مچ گئی۔ میں کانپ اُٹھی۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ اُس دن کی بات ہے جب رمشا ہانپتی کانپتی، بکھرے بالوں، خوف زدہ چہرے کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی۔ پاؤں میں جوتے غائب، نہ کندھے پر بیگ۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

''ماں!''

رمشا نے گھر میں داخل ہوتے ہی پکارا اور زور دار چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ یہ مغرب سے کچھ دیر پہلے کا وقت تھا۔ میں نے رمشا کو اُٹھایا اور بیڈ تک لے گئی۔ اُس کا جسم تپ رہا تھا۔ اُس کے منہ پہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ مجھے سب کام بھول گئے۔ ننھی علیشاہ بھی رو رہی تھی۔

میں نے اکمل کو فون کیا کہ وہ جلدی گھر آ جائیں۔ اُنہوں نے آج ہی گھر آنا تھا مگر رات گیارہ بارہ بجے گھر آتے تھے۔ وہ ابھی آفس میں

گئے۔ صبح ہوئی تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ خواب تھا یا حقیقت کیونکہ میرا دماغ سن سا ہو گیا تھا لیکن جب میری نظر اپنی چپلوں پر پڑی تو میں حیران ہو گیا۔ کیونکہ اس کا ایک اسٹریپ ٹوٹا ہوا تھا۔ میرے بھائی اور کزنز کو پتا نہیں کہ رات کو کیا ہوا۔ خیر میں نے اپنی پیاری سینڈل کے اسٹریپ کو چھت پر ہر جگہ تلاش کیا پھر باہر گلی میں بھی دیکھا لیکن نہیں ملا بعد میں وہ سینڈل کئی بار موچی کو بھیجی لیکن وہ جڑی ہی نہیں اور پہننا نصیب نہیں ہوئی لیکن اس کے بعد سے میں نے کبھی چھت پر پیشاب نہیں کیا۔ بعد میں پھوپو کے گھر والوں نے بتایا کہ اکثر چھت پر لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے بلکہ جن لوگوں کا خون ہلکا ہوا ان کو وہ لوگ نظر بھی آتے ہیں لیکن کبھی کسی کا برا نہیں ہوا تو تم نے ان کی جگہ پر پیشاب کیا تھا تو بچہ سمجھ کر ایک چھوٹی سی سزا دی کہ جس چیز کو تم عزیز سمجھتے تھے تو وہ توڑ دی یعنی چپل کا اسٹریپ ایسا توڑا کہ کبھی جڑا نہ کبھی پہننا نصیب ہوا۔

ان کے کرائے داروں کو لگتا ہے کہ چھت پر بچے بھاگ دوڑ رہے ہیں جب جا کر دیکھو تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ وہ لوگ بہت اچھے ہیں اگر کرائے دار اچھے نیک نمازی ہوں، صفائی والے اور پڑھائی والے ہوں تو بہت پھلتے پھولتے ہیں اور زیادہ تر اپنے گھر والے یعنی کرائے سے ذاتی مکان میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔ اکثر شادیاں ضرور اس گھر میں ہوتی ہیں یہ گھر سب کو بہت راس آتا ہے۔

میری شادی کو چار سال ہو چکے ہیں اور میرا ایک بیٹا پانچ مہینے کا محمد سالک خان ہے۔ میں میٹرو چینل میں ایڈیٹر ہوں اور شاہ فیصل کالونی میں پھوپو کے گھر کے پاس ہی کرائے پر رہائش ہے۔ میں نے بھی چاہا کہ پھوپو کے گھر کرائے پر اوپر والا پورشن لے لوں لیکن وہ خالی ہی نہیں ہو رہا تھا مگر مجھے امید ہے میں پھر سے اس گھر کے پوشیدہ مکینوں سے ملاقات ضرور کروں گا۔

☆☆☆





جنوں والا مکان

عظمیٰ یوسف زئی

اُس گھر کی داستانِ عجب' جس میں جو بھی کرایہ دار آیا' جلد ہی اُس کا اپنا مکان ہو جاتا تھا

میری پھوپو شاہ فیصل کالونی میں رہتی ہیں۔ ہم بچپن سے سنتے آرہے ہیں کہ ان کے گھر کی چھت پر اثرات ہیں لیکن کبھی کسی کو کچھ نقصان نہیں ہوا۔ اس لیے اس بات کو زیادہ توجہ نہیں دی ویسے بھی بچپن تھا کھیل کود کے دن تھے۔ مجھے ایک واقعہ ان کے گھر کی چھت پر پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ہمارے پھوپا جن کو ہم بڑے ابو کہتے تھے کافی بیمار رہ کر فوت ہو گئے۔ ان کے چالیسویں والے دن گھر میں بہت مہمان تھے۔ گھر بھرا ہوا تھا۔ جون کا مہینہ تھا، گرمی بھی تھی۔ ہم لڑکے رات کو اوپر سونے چلے گئے۔ میرے بڑے بھائی انور اور میرے دو کزنز عامر اور آصف تھے ہم نے دوسری منزل پر پڑی ریت کے اوپر چادر بچھائی اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔

ان دنوں گلی محلوں میں بڑی وارداتیں ہو رہی تھیں اس لیے گھر والے ہر ممکن انتظام کر کے سوتے تھے۔ چھت پر بھی تالا لگا ہوتا تھا کہ برابر کے گھروں سے کوئی کود کر نہ آجائے۔ ہمارے چھت پر آنے کے بعد لاعلمی میں کسی نے تالا لگا دیا اور ہمیں پتا نہ چلا۔

آدھی رات کو مجھے پیشاب آنے کی وجہ سے آنکھ کھلی۔ میں نیچے جانے کے لیے اٹھا تو گرل والے دروازے پر تالا پڑا تھا۔ میں بہت پریشان ہوا کہ پورا گھر سویا ہوا ہے، میں کیا کروں۔ اب مجھ سے برداشت بھی نہیں ہو رہا تھا تو میں نے وہیں چھت پر ایک کونے میں پیشاب کر لیا۔ پاکی کا خیال تو بہت رکھتا تھا تو استنجے کے لیے ڈھیلا استعمال کر لیا اور چھت پر پانی کا نل لگا تھا ہاتھ دھو کر دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔

ایک بات بتاؤں کہ میں اپنے جوتوں اور چپل کا خاص خیال رکھتا تھا کیونکہ میرے والدین سفید پوش ہیں تو وہ خراب ہونے پر بار بار چیزیں لے کر نہیں دے سکتے۔ اس لیے میں ہر چیز حفاظت اور محبت سے سنبھال کر رکھتا تھا۔ اپنی سینڈلوں کو میں سوتے وقت اپنے قریب رکھتا تھا کیونکہ یہ بہت اچھی تھیں اور ہوائی جہاز کے ٹائروں سے بنی ہوئی تھیں اور مجھے بہت پسند تھیں ابھی مجھے لیٹے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ میرے سرہانے آکر کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ ایک پوری فیملی تھی جن میں مرد عورت اور بچے تھے۔ عورت کے چہرے پر نقاب تھا آدمی نے مجھ سے کہا۔

''اچھا ہماری جگہ پر پیشاب کرتا ہے۔ ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے میری سینڈل اٹھائی اور اس کا اسٹریپ اکھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر وہ سب غائب ہو

گیا جو ہمیں دکھ رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد دریا کے دوسرے کنارے دو لمبے آدمی آئے۔ تقریباً ان کی لمبائی 20,22 فٹ تو ہوگی۔ جیسے ہی وہ دونوں آئے ہم دونوں ڈر گئے اور ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ ان دونوں کے آنے سے دریا میں بھینسوں کا ایک جھنڈ پتا نہیں کہاں سے آ گیا۔ چاند مکمل تھا اور وہ ہمیں صاف طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ایک آدمی نے دوسرے آدمی سے کہا۔

''مجھے تو بہت بھوک لگی ہے'' تو دوسرے نے بھینسوں کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا۔

''یہ تمہارے سامنے کھانا پڑا ہے اور تم نہیں کھا رہے'' اس نے ہاتھ بڑھایا اور ایک بھینس کو اٹھا کر ایک ہی نوالے میں سارا کا سارا کھا گیا پھر دوسرا، پھر تیسرا اور اسی طرح سارے بھینس وہ کھا گیا۔ پھر اس نے کہا کہ اس سے تو میرا پیٹ نہیں بھرا'' تو دوسرے نے جواب دیا'' کہ جو تمہارے سامنے آدمی بیٹھا ہے اس کو کھا لو'' جیسے ہی اس نے یہ کہا اس نے فوراً ہاتھ بڑھایا اور ہمارا دوست جو دائرے میں بیٹھا تھا اس کو اٹھایا جیسے ہی اس آدمی نے میرے دوست کو اٹھایا ہم دونوں نے اپنے جوتوں کو بھی وہیں چھوڑا اور تیز اپنے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اپنے محلے پہنچ کر میں نے اپنے دوست سے کہا۔

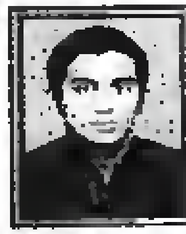
''کل جیسے بھی ہو ہمیں صبح سویرے وہاں جانا ہے'' اور گھر آ گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو بہت تیز بخار تھا اور اس بخار میں بھی گھر سے نکلا اور دوست کو لے کر رات والی جگہ پر پہنچا لیکن وہاں پر میرے مرے دوست کی لاش اور ہمارے جوتوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں حیران ہوں کہ آخر ایسی کونسی غلطی ہوئی میرے دوست سے جو انہوں نے اس کی جان لے لی۔ پہلے چالیس راتیں تو اچھی طرح سے گزریں لیکن اکتالیسویں رات آخر اس سے ایسا کیا ہوا؟ جس کا جواب مجھے ابھی تک نہ ملا۔

☆☆......☆☆





اکتالیسویں رات



جواد احمد

اس شخص کی کہانی، جس نے جن کو قابو کر لیا تھا، مگر عمل کی آخری رات...

یہ واقعہ جو میں لوگوں کو بتانے جا رہا ہوں یہ بالکل ایک سچا واقعہ ہے ہمارے محلے میں ایک 75 سالہ بزرگ رہتے ہیں ان کے آنکھوں کے سامنے یہ ناقابل فراموش واقعہ ہوا ہے انہوں نے مجھے خود سنایا ہے۔ لیجیے ان کی زبانی پڑھیے۔

میرا نام رحمان اللہ ہے یہ واقعہ میری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں 25 سال کا تھا یعنی یہ پچاس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ میرے دو دوست سب سے بہترین دوست تھے ہم تین لوگ بہت اچھے ساتھی تھے۔ ہر جگہ ایک ساتھ جاتے تھے۔ ان میرا ایک دوست جن کو جنات قابو کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ ہر جگہ گیا، ہر عامل کے پاس گیا لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر اسے ایک جنات سے متعلق ایک کتاب ملی۔ اس کتاب میں جنات کو قابو کرنے کا طریقہ لکھا ہوا تھا اس نے وہ کتاب مجھے دکھائی اور کہا کہ یہ اکتالیس دن کا عمل ہے جسے مجھے اکیلے ہی آدھی رات کو کسی سنسان جگہ پر کرنا ہے اور میں نے اس عمل کو کرنے کے لئے جگہ کا بھی انتخاب کرلیا ہے اور دن کا بھی۔"

میں نے اسے بہت سمجھایا کہ یار یہ مت کر اس میں تمہاری جان بھی جاسکتی ہے لیکن وہ نہیں مانا۔ خیر انہوں نے وہ عمل شروع کر دیا پہلے چالیس دن تو اچھی طرح سے گزرے۔ اکتالیسویں دن وہ ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"آج آپ دونوں بھی میرے ساتھ چلیں گے۔ ویسے بھی آج آخری رات ہے پھر اس کے بعد مزے ہی مزے ہیں" ہم نہیں مانے لیکن اس کی ضد کے سامنے ہم نے ہتھیار ڈال ہی دیے۔

ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک دریا ہے جہاں دریا کے نزدیک کوئی آبادی نہیں ہے۔ درختوں سے بھرا ہوا ایریا ہے۔ اس جگہ کا انتخاب انہوں نے کیا تھا۔ آدھی رات کو ہم تینوں وہاں پر پہنچے۔ تو اس نے کہا کہ آپ دونوں یہیں پر بیٹھ جائیں میرا انتظار کرے وہاں آپ لوگوں کے سامنے دریا کے کنارے میں اپنا عمل شروع کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اور دو دوست یہیں پر بیٹھ گئے اور وہ دریا کے کنارے جا کر اپنے اردگرد دائرے کھینچ کر وہیں بیٹھ



ناول
کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 21

آصف نے خبر پڑھنے کے بعد درشہوار کی طرف دیکھا جیسے وہ یہ جاننے کے بعد ہی اپنا ردِعمل ظاہر کرنا چاہتا ہو کہ اس خبر کو خدا کی مدد سمجھا جائے یا اس پر افسوس کیا جائے۔

''ہمیں وقت مل گیا ہے آصف اب ہم اپنی بیٹی کو اس مصیبت سے بچا سکتے ہیں اس کا تسلی بخش علاج ہونے کے بعد ہی اس کی شادی کریں گے۔'' درشہوار نے کہا۔ آصف کی بجھی ہوئی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی پھر سوچ کی گہری لکیروں نے اس کی جگہ لے لی۔

''پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ رحمٰن نے اچانک اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا ہے یہ بہت ہی غیر یقینی اور سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ صنوبر کے حوالے سے سوچتا ہوں تو یہ اچھا ہوا ہے۔ لیکن جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں وہاں ایسی باتوں کو کتنا بڑا طوفان بنا دیا جاتا ہے یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اس شادی کو کچھ عرصے لیے ملتوی کرتے تب بھی اسی قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔ ملتوی کا مطلب ہمیشہ ملتوی نہیں ہوتا لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے اصل میں شادی ختم کی گئی ہے۔ بس زیادہ بڑے ردِعمل کی وجہ سے خاتمے کو ملتوی کا نام دیا گیا ہے اور ایسے حالات میں کوئی نہ کوئی مناسب عذر بھی ضرور ڈھونڈ لیا جاتا ہے جس کے سہارے لوگوں کے سوالوں کا جواب دینا آسان ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو درشہوار جس معاملے میں لوگ سوال جواب سے تشنہ رہ جائیں اس معاملے کو برسوں تک بھی بھلایا نہیں جا سکتا لوگ کسی نہ کسی بہانے اس کا تذکرہ کرتے ہی رہتے ہیں۔ ایسا ہو تو پھر جن پر بیت رہی ہوتی ہے ان کے لیے کہیں جانا اور کسی بھی محفل یا کسی بھی گروپ کا سامنا کرنا کتنا دشوار ہوتا ہے یہ ہم ابھی سوچ بھی نہیں سکتے۔'' آصف کی اس لمبی چوڑی تقریر کو درشہوار نے بہت غور سے سنا اس کے ایک ایک لفظ سے وہ متفق تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ جب قدرت کی طرف سے انسان پر کوئی مصیبت آن گرے تو یہ اس کی زندگی میں اس کی بہترین ذہنی صلاحیتوں کے استعمال کا امتحان ہوتا ہے اس لیے وہ بولی۔

''اب جو بھی ہو آصف ہمیں اپنی بیٹی کو دنیا کی ہر بات پر فوقیت دینا ہی ہوگی یہی سب والدین کی محبت کا تقاضا ہوتا ہے۔ میں بہرحال اس خبر کو اپنی صنوبر کے لیے ایک گڈ نیوز سمجھتی ہوں۔''

آصف نے اس کی بات پر صاد کیا۔ لیکن ساتھ ہی اس تجسس کا بھی اظہار کر دیا کہ ہمیں کم سے کم یہ تو ضرور پتا ہونا چاہیے کہ رحمٰن کے بڑے فیصلے کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں۔ دونوں نے اس سے بھی پہلے اس بات پر

''سوچ رہا ہوں کہ ایسا کیا ہوا ہوگا جو رحمٰن انکل نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ انھوں نے اپنی اس شہرت کی بھی پروا نہیں کی کہ جو اس خبر سے اب تک مٹی میں مل چکی ہوگی۔''

''ہم نے اب تک بھی صنوبر سے بات نہیں کی ہے۔ سوچ رہے ہیں کہ اس سے کس طرح اور کیسے بات کریں۔ تم بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' یہ پہلا موقع تھا جب سلمان کے والد نے اس سے بات کی وہ بھی اس طرح اس لہجے میں جیسے وہ اسے واقعی کسی قابل سمجھتے ہیں۔ سلمان کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھرنے لگیں اور وہ بھی ایک قسم کی الجھن میں پھنس گیا۔ کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی رہی اور پھر سلمان نے پوچھا۔

''ماما کہاں ہیں اس وقت؟''

''صنوبر جاگ چکی ہے وہ اسی کے پاس ہے۔ مجھے رحمٰن سے بات کرنے جانا تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہوئی ہے جو اس نے یہ فیصلہ لیا ہے مگر اس کا فون بند ہے آفس سے وہ جاتے کے ساتھ ہی نکل گیا تھا زیادہ سے زیادہ دس منٹ رکا ہوگا۔ گھر پر فون کیا تھا جو معلوم ہوا کہ فارس تو اپنے کمرے میں موجود ہے لیکن وہ کسی سے کوئی بات نہیں کر رہا البتہ رحمٰن گھر والوں کا فون بھی نہیں اٹھا رہا جس کی وجہ سے اس کی بیگم اور بیٹی بہت پریشان ہیں کہ آخر رحمٰن چلا کہاں گیا ہے۔ اس سچویشن میں جب کہ ہمیں خود کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہے جسے بتا کر ہم صنوبر کو مطمئن کر سکیں ہماری خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کریں۔ ہم تو صنوبر کی خراب حالت کی وجہ سے پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ اس حالت میں اس کی رخصتی نہ ہو تو اچھا ہوگا۔ تاکہ ہمیں اس کا علاج کرانے کا وقت مل جائے لیکن یہ تو پورا منظر ہی تبدیل ہو چکا ہے۔ ہم سے زیادہ پریشانی کی خبر تو وہاں سے آ گئی ہے۔''

''اب صنوبر کیسی ہے؟'' آصف کی بات ختم ہونے کے بعد سلمان نے پوچھا۔

''میں اس سے ملا نہیں ہوں۔ بس دور دیکھا ہے۔ میں یہاں تمہارے پاس چلا آیا اور تمہاری ماما صنوبر کے پاس ہیں بظاہر وہ ٹھیک لگ رہی تھی، اس کا چہرہ پرسکون تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کسی بات کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ ویسے بھی پہلے بھی یہی ہوا تھا وہ ایک دم سے بیمار ہوئی تھی اور ایک دم ہی ٹھیک ہوگئی جب میں اسے امریکا لے جانے کی بات کر چکا تھا۔ دونوں بار ایک بات کامن رہی وہ یہ کہ صنوبر کو ایک ذرا سا بھی اپنی بیماری کا یاد نہیں ہے اسے تو حیرت ہوتی ہے جب ہم اس کی ایکسٹرا کیئر کرتے ہیں تو۔'' آصف کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے آج وہ اپنے اس نظر انداز کیے ہوئے بیٹے سے نہیں بلکہ اپنے کسی خاص انسان سے بات کر رہے ہیں جس سے وہ اپنا ہر راز و نیاز کر سکتے ہیں۔

''ڈاکٹرز نے اس وقت اس قسم کی کسی بیماری کو تسلیم کیا تھا؟'' سلمان نے کچھ اس انداز سے پوچھا کہ آصف کو اس کی بات میں چھپی ہوئی وہ پریشانی محسوس ہوگئی جس پر وہ کسی بھی قیمت پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہو سکتا تھا۔

''کہیں تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ صنوبر کسی جن وغیرہ کے قبضے میں ہے۔ کمزور عقیدے کی عورتیں اکثر اس قسم کی لغو باتیں کیا کرتی ہیں اور تمہاری ماما بھی ایک عورت ہی ہے اسے بھی ان فضول باتوں پر یقین آ جاتا ہے۔'' آصف کا لہجہ قدرے تلخ ہو رہا تھا۔

''لیکن پاپا یہ تو قرآن سے ثابت ہے کہ جنات ہوتے ہیں تو پھر اس بات کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟'' سلمان نے سوچا پہلے اپنے باپ کی سوچ کا بھرپور انداز میں جائزہ لے لے تاکہ اسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ اسے کس قسم کی لائن آف ڈائریکشن پر کام کرنا ہے۔

''میں بھی یہ مانتا ہوں، ہر مسلمان کو ماننا پڑتا ہے کیونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کلام کے ایک ایک لفظ پر ایمان لانے سے ہی ایمان کامل ہوتا ہے۔ یہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کے من پسند حصوں پر آپ ایمان لائیں اور باقی کو رد کر دیں۔ مجھے معلوم ہے اس کتاب کی ہر بات پتھر پر لکھی لکیر سے بھی زیادہ اہم اور ناقابل تردید ہے۔ لیکن بیٹے یہ روحانی جو معاملات ہوتے ہیں ان کی سب سے بڑی دشواری ہی یہ ہوتی ہے کہ یقین کی منزل تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا ایک ڈاکٹر کی ڈگریاں دیکھ کر آپ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس کا علم کیا ہے اور ہم اس پر کس حد تک بھروسا کر سکتے ہیں۔ لیکن روحانی معاملے میں بھروسا کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا اور پھر اگر آپ غلطی سے بھی کسی دھوکے باز کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ تو ساری عمر آپ

تبادلہ خیال کیا کہ انھیں صنوبر کو یہ خبر کیسے سنانی ہے۔

☆......☆

سلمان ابراہیم کے لیے ہر چند کہ اس کھیل کو کچھ اور دن جاری رکھنا کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ کچھ دیر تک فارس کے جسم کے اندر رہے اس سے وہ سارے کام لے جو اسے صنوبر سے بہت دور لے جانے کا سبب بنیں اور پھر اس کا جسم چھوڑے اور صنوبر کے گھر پہنچ کر جائزہ لے کہ اس کے ان کارناموں کا وہاں کیا ردعمل ہو رہا ہے۔ اس وقت بھی وہ فارس کے جسم میں ہی تھا اور فارس کو سلانے کے بعد یہ سوچ رہا تھا کہ رحمٰن اس تھپڑ کے بعد کیا کرنے والا ہے کیا وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو گھر سے نکال باہر کرے گا یا کوئی اور قدم اٹھائے گا۔ سلمان ابراہیم یہ نہیں جانتا تھا کہ رحمٰن نے رات ہی کو اپنے بیٹے کی نہ صرف شادی ختم کردی تھی بلکہ اسے جائداد سے بھی عاق کر دیا تھا۔ اس لیے وہ اگلا قدم اٹھانے میں تذبذب کا شکار تھا۔

فارس کی ماں بیگم رحمٰن نے جب یہ خبر دیکھی تو ان کے پیروں تلے زمین کھسک گئی ان کے شوہر نے فیصلہ کرنے میں غیر معمولی عجلت سے کام لیا تھا وہ اپنے غصے پر قابو کرنے اور بہترین فیصلہ کرنے کی صلاحیت کھو چکے تھے انھوں نے فارس کو جائداد سے الگ کر کے اس کی شادی ختم کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس نے انھیں سارے وجود سے دہلا دیا تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ کر ہی بہت پریشان تھیں کہ فارس تو کبھی اس طرح سارا دن اپنے کمرے میں بند نہیں ہوتا پھر ایسا کیوں ہو رہا تھا کہ وہ پورا دن سوتا رہا رات کو بس کھانا کھانے باہر نکلا اور کھانا بھی اس نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ مقدار میں کھایا ایک ڈکار لی اور واپس اپنے کمرے میں چلا گیا اس نے کسی سے بات نہیں کی تو کسی اور کو اس سے بات کرنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ اس کی بہن فرح ناز نے ایک بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے اپنی سرخ انگارہ جیسی وحشت زدہ اور ڈرا دینے والی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر سے کھانے میں مشغول ہو گیا۔ فرح ناز نے مارے حیرت کے اپنی ماں کی طرف دیکھا تو انھوں نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ فارس نے کھانا ختم کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دونوں ماں بیٹیوں کو فارس کی حرکتوں پر گہری تشویش ہو چکی تھی اس لیے فارس کے جاتے ہی انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور فرح ناز بولی۔

''ماما فارس بھائی نے کھانا کتنا کھایا ہے جیسے وہ کوئی مہینے بھر کے بھوکے ہیں!''

''پتا نہیں بیٹا مجھے تو خود کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ آخر فارس کو ہوا کیا ہے وہ ایسا کیوں بی ہیو کر رہا ہے جیسے ہم اس کے کچھ نہیں لگتے اور وہ یہاں اپنے ہی گھر میں اجنبی ہے۔ سارا دن وہ شوہر کو فون لگاتی رہی تھیں مگر رحمٰن صاحب نے ایک بار بھی ان کی کال اٹینڈ نہیں کی ان کا فون سائلنٹ پر تھا اس لیے انھیں خبر تک نہیں ہوئی کہ کون کون انھیں کتنی دیر سے اور کتنی بے چینی سے فون کر رہا ہے۔ انھوں نے اپنی ساری ہی معروفیات کو ترک کر کے خود کو جم خانہ کے ایک کمرے میں بند کر لیا تھا۔ وہ مسلسل سوچ رہے تھے۔ انھیں ایسا بھی لگ رہا تھا کہ اگر سوچوں کی یہ یلغار رو کی نہ جا سکی تو کہیں ان کے دماغ کی شریان پھٹ نہ جائے۔ اس لیے انھوں نے سکون آور دوا کی دگنی مقدار کھائی اور سو گئے۔ ادھر گھر میں شدید پریشانی اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب بیگم رحمٰن کو پتا چلا کہ ان کے شوہر تو دوپہر سے پہلے کے دفتر سے نکلے ہوئے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں کیونکہ خلاف توقع انھوں نے اپنے ڈرائیور کو بھی ساتھ میں رکھنے سے گریز کیا تھا اور بہت عرصے بعد خود گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ پہلے ادھر ادھر گھومتے رہے پھر جم خانہ چلے گئے۔ اتنے بڑے سرمایہ دار کو ادھر ادھر بلا وجہ گھومتے ہوئے اگر کسی میڈیا کے بندے نے دیکھ لیا ہوتا تو وہ آناً فاناً بریکنگ نیوز بن جاتے لیکن ایسا نہیں ہوا اور انھیں کسی نے نہیں دیکھا۔

☆......☆

صنوبر کے گھر میں اس خبر پر صبح آصف اور روز شہوار نے تفصیل سے بات چیت کر لی تھی اور جب ان کا بیٹا سلمان نیند سے بیدار ہوا تو انھوں نے اسے بھی وہ خبر کسی راز کی طرح سنائی اور سلمان کی بھی جیسے بولتی بند ہو گئی کہ خبر پڑھ کے کہیں اس کے دماغ میں بھی ایسی گھنٹیاں بجنے لگیں کہ اگر اس نے خود کو اپنے باپ کا فرماں بردار نہ بنایا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا انجام بھی فارس جیسا ہو۔ وہ چپ تھا اور اس کی سوچیں پتا نہیں کہاں کہاں کی سیر کر چکی تھیں۔

''کیا سوچنے لگے؟'' آصف نے پوچھا تو وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

حوصلہ بڑھ جاتے اور ہم ان کی دل جوئی کرتے تو سب کا درد کچھ کم ہو جاتا۔''
''آنٹی ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما۔ ڈیڈی کو اس طرح خود کو ہم سے الگ نہیں کرنا چاہیے انھیں اس وقت یہاں ہمارے ساتھ ہونا چاہیے۔''
فرح ناز کی بات سننے کے بعد ساجدہ سوچنے لگی کہ ''میں تم لوگوں کو کیسے بتاؤں کہ فارس نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ وہ اندر تک ٹوٹ کے بکھر چکا ہے، رحمٰن نے منع نہ کیا ہوتا تو میں تمھیں بتاتی کہ فارس نے اپنے اس باپ کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہے۔ جس سے ساری زندگی وہ نظریں ملا کر بات نہیں کر سکا۔ اتنی بڑی تبدیلی، اتنا بڑا طوفان کیسے اور کیوں آیا رحمٰن کی نہیں میری بھی عقل دنگ رہ گئی ہے۔
''رحمٰن بھائی نے فارس کو جائداد اور اپنی وراثت سے کیوں الگ کر دیا ہے۔ ناراضگی اور جھگڑا کہاں نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ انسان اپنے سب رشتے ایک جھٹکے میں ختم کر دے اور تو اور اسے اس کے سارے حقوق سے بھی محروم کر دیا ہے آپ کے کون سے سات آٹھ وارث ہیں کہ ایک کو عاق کر دیا تو دوسرا اس کی جگہ لے گا اللہ اسے لمبی عمر دے ایک فارس ہی آپ لوگوں کی کل کائنات ہے اور وہ ہی ہر قسم کی میراث کا مالک ہے۔ اسی کو کچھ نہیں دیں گے تو کسے دیں گے؟''
''تم چپ کر جاؤ ماجدہ پلیز چپ کر جاؤ۔ تم کچھ نہیں جانتیں کہ کیا قیامت ٹوٹی ہے ہمارے گھر پر.... رحمٰن کو اس قیامت نے جڑوں تک سے ہلا کے رکھ دیا ہے۔ انھیں سنبھلنے میں کچھ وقت لگے گا۔ ہم سب کو یہ دعا مانگنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن کو ہمت و حوصلہ دے کہیں وہ جذبات میں آ کر کوئی غلط قدم نہ اٹھا لیں۔''
''لیکن باجی بات کیا ہوئی ہے۔ آپ نے تو کہا تھا کہ فارس نے بدتمیزی کی ہے جس کا رحمٰن بھائی کو بہت صدمہ پہنچا ہے اور اب آپ کی باتوں سے لگ رہا ہے کہ ضرور کوئی اور بات ہے جسے آپ چھپا رہی ہیں آپ کس قیامت کا ذکر کر رہی ہیں۔ پلیز باجی مجھے ضرور بتا ئیں نہیں تو میں سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گی....'' ساجدہ نے ایک جھجکی اور گہری نظروں سے ماجدہ اور فرح ناز کی دیکھا اور ساری بات سارا واقعہ جو رحمٰن صاحب نے انھیں سناتے ہوئے کسی کو بھی بتانے سے منع کیا تھا وہ سب کا سب ان دونوں کو بتا دیا جیسے وہ مجبور ہو گئی ہوں۔ بتانے پر ان کی بات جیسے ہی ختم ہوئی ماجدہ کی ایک فلک شگاف چیخ نکلی اور وہ بے ساختہ بولی۔
''اوہ میرے اللہ... فارس نے اتنی بدتمیزی کی۔ میں تو اس حد تک فارس کے آگے بڑھ جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس نے تو رحمٰن بھائی کا سارا غرور، سارا مان اور ان کی ساری عزت جیسے پاؤں تلے کچل ڈالی۔ میں فارس کو اتنا بے ہودہ اور بدتمیز نہیں سمجھتی تھی۔ سچ کہا آپ نے باجی فارس نے تو حد ہی کر دی۔''
''لیکن ماما انھوں نے ایسا کیا کیوں؟ وہ بھی اس وقت جب ان کی شادی ہونے والی ہے۔ صنوبر سے تو شادی کرنا ان کا خواب تھا پھر اپنے ہی ہاتھوں سے وہ اس خواب کو کیوں چکنا چور کریں گے؟؟'' فرح ناز کی بات سن کر دونوں بہنیں چونکیں ضرور مگر ان کی سمجھ میں یہ بات بھی اسی طرح نہیں آئی جیسے وہ اب تک یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ آخر فارس نے ایسی حرکت کی تو کی کیوں؟
''اب ہو گا کیا باجی!'' ماجدہ کے لہجے میں ایک مہیب یاسیت کا شور سنائی دیا۔
''پتا نہیں کیا ہو گا۔ صبح سے صنوبر کے والد اور بھائی کا مسلسل فون آ رہا ہے وہ رحمٰن کو پوچھ رہے ہیں میری تو خود کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں انھیں کیا جواب دوں۔'' ساجدہ نے مضمحل لہجے اور ڈھیروں پریشانیوں کے انبار سے کہا۔
''ظاہر ہے وہ لڑکی والے ہیں جب انھوں نے یکایک اس قسم کی نیوز دیکھی اور پڑھی ہو گی ان کے تو پیروں تلے زمین کھسک گئی ہو گی۔ آخر اس طرح اچانک بھی کوئی شادی ختم کرتا ہے وہ بھی شادی سے چند دن پہلے۔'' ماجدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بات کرے۔ خاموشی اس وقت اس گھر اور اس کمرے کے لیے زہر قاتل تھی کہ سناٹا ایسے گرجنے لگتا تھا کہ دل دھڑکنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔

کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اب آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ کسی ڈاکٹر کو تو آپ اس بنیاد پر تبدیل کر سکتے ہیں کہ اس نے غلط پریکٹس کے ذریعے آپ کے پیشنٹ کو نقصان پہنچایا ہے لیکن ایک روحانی عامل کو کس بنیاد پر تبدیل کیا جائے یا اسے غلط ثابت کیا جائے۔ اس لیے اس قسم کے چکروں میں پھنسنے کا مطلب یہ کہ اس کا کوئی انت نہیں ہے۔ میں ایسا کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔''

''میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں پاپا لیکن کیا آپ کو ڈاکٹر نے ایسا کچھ بتایا کہ جو علامات صنوبر کی بیماری میں ہمیں نظر آتی ہیں وہ کسی بیماری میں ہوتی ہیں۔ جیسے اسے یہ یاد نہ رہنا کہ اسے کوئی بیماری ہوئی بھی یا نہیں یا پھر اس کا ایسے ری ایکٹ کرنا کہ وہ تو بالکل ٹھیک ہے حتیٰ کہ اسے اپنی بیماری کے دوران ہونے والا کوئی بھی واقعہ ذرا سا بھی یاد نہیں رہتا۔ علاوہ اس بات پر حیران ہو رہی ہوتی ہے ہم اس کے ارد گرد کیوں جمع ہیں۔؟''

''مینٹل ڈس آرڈر'' یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جس کی تفصیلات اتنی زیادہ ہیں کہ کوئی بھی ایسا انسان جو ان تفصیلات میں دلچسپی نہ لینا چاہے اس کے لیے انھیں جاننا تقریباً ناممکن ہے اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ اس بیماری کی کئی شکلیں اور قسمیں آتی ہیں کوئی مریض ایسے ری ایکٹ کرتا ہے کہ اسے کچھ نہیں ہوا وہ بالکل ٹھیک ہے اور کوئی ایسا بن جاتا ہے جیسے بیماری جس کو ہے وہ .....وہ نہیں ہے بلکہ وہ کوئی اور ہے اور یہ جو ہمارے سامنے بیٹھا ہوا ہے مریض ہے یہ کوئی اور ہے۔ یعنی دو شخصیتوں والا انسان ۔ جسے اپنی دونوں الگ الگ شخصیتیں الگ الگ انسان لگتی ہیں۔ تو اسے ایک بات دوسرے کی نہیں لگتی اس لیے وہ اسے ماننے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔'' اتنا کہہ کر آصف خاموش ہو گیا اور پھر کچھ توقف کے بعد گمبھیرتا سے بولا۔ ''اس بیماری کی ابتدا ایسے ہوتی ہے جیسے صنوبر!'' اتنا کہہ کر آصف نے چپ سادھ لی ان کی آنکھوں میں اداسی نے ڈیرے ڈال لیے تھے اور اب سلمان کو لگا کہ اس کے پاپا اس سے کوئی بھی بات نہیں کر سکیں گے۔ سلمان انہیں وہیں بیٹھا چھوڑ کر صنوبر اور اپنی ماما سے ملنے جانے لگا پھر جاتے جاتے مڑا اور بولا۔

''کیا آپ نے رحمن انکل کے ہاں کہہ دیا تھا کہ وہ جب اور جس وقت بھی آئیں ہمیں ضرور اطلاع کریں۔''

''ہاں کہہ تو دیا تھا مگر ہم کیا زیادہ رات ہو جانے پر اس کی طرف جا سکیں گے؟'' آصف کو لگا کہ یہ کافی مشکل ہو گا۔

''ان کے ساتھ ساتھ ہماری بھی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ ہمیں بھی جاننے کا اتنا ہی حق ہے جتنا ان کو ہے اس لیے رات کتنی بھی جا چکی ہو وقت کچھ بھی ہو ہم ان کی طرف ضرور جائیں گے۔'' سلمان یہ کہہ کر چلا گیا اور آصف کے دل کو جو بری طرح بے چین اور بے قرار تھا کسی قدر سکون کا احساس ہوا۔

کیا واقعی اس کا بیٹا اپنی ذمہ داریوں کا خیال کرنے کے قابل ہو چکا ہے؟ اس نے سوچا۔

☆......☆

رحمن صاحب کی گمشدگی سے ان کی بیوی ساجدہ اور ان 19 سالہ بیٹی فرح ناز بہت ہی پریشان تھیں اور ان دونوں کو دلاسا اور تسلی دلانے کے لیے ساجدہ کی چھوٹی بہن ماجدہ بھی ان ہی کے گھر میں موجود تھی ماجدہ لاہور سے آئی تو شادی میں شرکت کرنے تھی مگر اب جو پورا کا پورا منظر بدلا تو اسے ایسا لگنے لگا کہ یہ شادی کبھی بھی ہونے والی نہیں ہے۔ اس وقت یہ تینوں عورتیں ایک دوسرے سے اپنی پریشانیوں اور الجھنوں کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔

''ایسا تو رحمن بھائی نے کبھی نہیں کیا وہ اس طرح کیوں کر رہے ہیں آفس میں بھی نہیں ہیں اور اپنا فون بھی بند کیا ہوا ہے انہیں ذرا بھی احساس نہیں ہو رہا کہ ہم لوگوں پر کیا گزر رہی ہے'' ماجدہ اپنی چھوٹی بہن کی بات سن کر ساجدہ بیگم رحمن نے اس کی طرف ایک قسم کی بے بسی سے دیکھا اور بولیں۔

''ایسا مت کہو ساجی! پتا نہیں رحمن خود کس مشکل میں ہیں ہم سب کو صرف اپنے دکھ، اپنی پریشانیاں ہی سب سے زیادہ اہم لگتی ہیں دوسرے کا درد ہمیں درد ہی نہیں لگتا۔ مجھے لگتا ہے رحمن ہم سے زیادہ تکلیف میں ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کیا کریں۔''

''مگر باجی ذرا سوچیں اس طرح الگ الگ پریشان ہونے سے تو کسی کی بھی تکلیف کم نہیں ہوگی انھیں چاہیے تھا وہ ہمارا

''میں بالکل تیار ہوں ماما ہم لنچ کر کے بازار جائیں گے یا ابھی فوراً''
''تم تو ابھی جاگی ہو۔ تم نے تو ناشتا بھی نہیں کیا پہلے ناشتا کر لو پھر بتاتی ہوں کہ کس وقت چلنا ہے۔'' درشہوار نے اس کے گال کو چھوتے ہوئے کہا۔
''مجھے بھوک نہیں ہے ماما'' صنوبر نے دھیمی مگر اداسی میں لپٹی آواز میں کہا۔
''بھوک نہیں ہے مگر کیوں بیٹے۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا پھر بھی تم نے اس شادی کے لیے ضد کی اور اب جب سے شادی کی بات پکی ہوئی ہے تم ہر روز زندگی سے اپنا رشتا کمزور کرتی چلی جا رہی ہو۔ مجھے تو کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے تم نے زندہ نہ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب تم صرف اس گھڑی اور لمحے کی منتظر ہو جب اپنی زندگی کا چراغ گل کر دینا تمہارا مقصد ہے'' درشہوار پتا نہیں جذبات میں کیا کیا بولتی چلی گئی ایسی باتیں بھی جو ایک ماں کو زیب نہیں دیتیں۔
''ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ میں ایسا کچھ بھی نہیں کر رہی۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ میں اس میں دانستہ کچھ بھی نہیں کر رہی۔ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا جب کھانے کو دل نہ چاہے کوئی بات کرے تو اچھا نہ معلوم ہو چپ رہنے کو دل چاہتا ہے۔ یہ سب تو کسی کے ساتھ بھی اور کبھی بھی ہو جاتا ہے اس میں یہ بات کہاں سے آ گئی کہ میں خود کو مارنے کا کوئی منصوبہ بنا رہی ہوں۔ کسی ایسے وقت اور لمحے کا انتظار کر رہی ہوں۔ آپ مجھے لے کر کچھ زیادہ ہی فکرمندی ظاہر کر رہی ہیں۔ میں ٹھیک ہوں ماما دیکھیں میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے اپنا آپ انھیں دکھانے کی کوشش کی۔ درشہوار سے برداشت نہیں ہوا اور وہ بے ساختہ رو پڑی۔
''پتا نہیں میری بچی تمہارے ساتھ یہ سب کیوں ہوا۔ ہم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو ہمیں اس امتحان سے گزرنا پڑ رہا ہے۔'' درشہوار کی باتوں نے صنوبر کو الجھا سا دیا وہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگی کہ اس کی ماں کو کسی نئے صدمے نے اتنا پریشان کیا ہے یا انھیں اس کی ناخوشی سے ہونے والی شادی نے پھر سے از حد دکھی کر دیا ہے۔
''کیا بات ہے ماما آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔ بتائیں کیا بات ہے کیا ہوا ہے؟'' صنوبر پوچھتی رہی اور درشہوار اسے ایسے سمجھاتی رہی جیسے بچوں کو بہلایا جاتا ہے۔
''کچھ نہیں ہوا تم یہاں بیٹھو۔ کھڑی مت رہو'' درشہوار نے اسے بیڈ پر پکڑ کے بٹھایا اور اپنی آنکھیں رگڑ کے صاف کیں۔
''تمہاری شادی ٹوٹ گئی ہے۔ دو دن بعد جو شادی ہونا تھی وہ اب کبھی بھی نہیں ہو گی۔ میری بیٹی کبھی بھی نہیں۔''
''کیا..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ماما آخر آپ کو ہوا کیا ہے۔ کیوں ایسی عجیب عجیب باتیں کر کے میرا امتحان لیتی رہتی ہیں، میں کب سے تو آپ کو یقین دلا رہی ہوں کہ یہ شادی میں اپنی مرضی سے کر رہی ہوں۔ اور بہت خوش ہوں'' صنوبر جیسے چیخ ہی تو پڑی۔
''تم اگر آرام سے اور بہت حوصلے سے میری بات سنو گی تو میں تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ چیخنا یا جذبات میں آ کر کچھ بھی بولنا تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔'' درشہوار کی بات سننے کے بعد اس کی آنکھوں میں ایک ایسی شانتی سی تیرنے لگی جیسے وہ خود کو دھیرے دھیرے نارمل کر رہی ہے۔
''میں ٹھیک ہوں اب کہیں کیا کہنا ہے آپ کو۔'' جواب میں درشہوار نے وہ اخبار پاس ہی کے وارڈروب سے نکالا اور اسے صنوبر کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''لو خود ہی پڑھ لو مگر بہت اطمینان کے ساتھ۔'' صنوبر نے وہ اخبار ایسے لیا جیسے اسے کوئی ایسی چیز دی جا رہی ہے جس کے اندر کوئی جان لیوا جانور جیسے سانپ وغیرہ چھپایا گیا ہو۔ ڈرتے ڈرتے اس نے اخبار کھولا تو کوارٹر پیج کے اس اشتہار پر درشہوار نے انگلی رکھتے ہوئے کہا'' اسے پڑھو'' صنوبر نے پڑھنا شروع کیا اور پڑھنے کے بعد جو کچھ درشہوار نے دیکھا وہ اس کے لیے کسی بھاری اچنبھے سے کم نہیں تھا۔ پہلے تو صنوبر ایسے منہ بناتی رہی جیسے اسے کوئی چیز اپنے وجود میں اچھلتی کودتی محسوس ہو رہی ہو۔ پھر ایسا لگنے لگا جیسے وہ منہ سے کچھ بھی خارج کرنے کو روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسے ابکائی سی آ رہی تھیں شاید اور..... پھر یوں ہوا کہ صنوبر نے بے تکان ہنسنا شروع کر دیا۔ اور ہنستے ہنستے وہ بستر پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ درشہوار کے ہاتھوں پیروں سے جیسے جان ہی نکل گئی یعنی جو خدشہ اسے روک رہا تھا صنوبر کو کچھ بھی

☆......☆

''ہمیں صنوبر کو ساری صورت حال بتا دینا چاہیے'' سلمان نے درشہوار سے کہا۔

''اس کی طبیعت کہیں یہ سب سن کر کہیں اور بھی خراب نہ ہو جائے'' درشہوار نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ دونوں صنوبر کے کمرے کی راہداری میں کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

''یہ بھی ہو سکتا ہے اس کی طبیعت پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائے۔'' سلمان کی بات سن کر درشہوار نے اسے اجنبیت سے دیکھا۔

''کیا... کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''بس اتنا کہ شاید اس کی طبیعت کی خرابی کی وجہ فارس سے شادی ہی ہے۔ وہ اپنے دل پر جبر کر کے یہ شادی کر رہی تھی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ خوشی سے یہ شادی نہیں کر رہی تھی۔ ممکن ہے اسی دباؤ کی وجہ سے اس کی طبیعت خراب ہوئی ہو۔ وہ چونکہ یہ فیصلہ کر چکی ہے اس لیے اب اس سے پیچھے ہٹنا نہیں چاہتی اور پھر ہٹے بھی کیوں اور کس لیے جس انسان کے لیے وہ اپنی زندگی کو روگ لگا چکی ہے وہ اسے ایسے چھوڑ کر چلا گیا جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی تھی ہی نہیں۔'' سلمان کی بات ختم ہوئی تو درشہوار نے کچھ اس طرح یہ الفاظ ادا کیے جیسے وہ کسی اثر میں ہوں۔

''کہیں تمہارا خیال صحیح نہ ہو۔ تو کیا ہمیں صنوبر کو سب کچھ بتا دینا چاہیے۔؟'' پتا نہیں وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھیں یا سلمان سے پوچھ رہی تھیں سلمان نے یہ سنا اور بولا۔

''پاپا سے مشورہ کرتے ہیں۔ اگر وہ بھی میری اس بات کو تسلیم کرنے پر راضی ہوئے تو ہمیں پھر ایک منٹ اور دیر نہیں کرنی چاہیے صنوبر کو سب کچھ بتا دینا چاہیے۔'' سلمان نے قدم آصف کے کمرے کی طرف بڑھا دیے۔

''رکو.....'' درشہوار نے اسے پیچھے سے آواز دی'' تمہارے پاپا کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کافی متاثر ہوئی ہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو صنوبر کی خوشی انہیں کتنی پیاری رہی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اس فیصلے میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ انہیں ایک فیصد بھی اس بات میں رسک معلوم ہوا تو وہ انکار کر دیں گے اور وقت کے فیصلے کا انتظار کرنے کو کہیں گے۔ میں جانتی ہوں آصف کو اپنے بچوں کے معاملے میں رسک جیسے لفظ کو وہ اپنے قریب بھی نہیں آنے دینا چاہتے اور اس معاملے میں رسک چاہے کتنا ہی کم کیوں نہ ہو ہے تو.....'' درشہوار کی بات سن کر سلمان پھر سے اپنی پرانی پوزیشن پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس نے ڈھیلا ٹراؤزر اور شرٹ پہن رکھی تھی یہ اس کا سونے کا لباس تھا۔

''تو اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ تیار ہو کر آ جائے گی اور آپ سے کہے گی کہ آپ نے جو جیولرز اور بازار جانے کو کہا تھا تو اب چلیے۔ تب آپ کیا کریں گی تب آپ کیا کریں گی؟'' سلمان کی بات سن کر درشہوار کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہویدا ہوئے۔ سلمان ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس حالت میں صنوبر کو بازار لے جانا بھی فضول تھا اور نامناسب بھی جبکہ اسے انکار کرنے کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے تھی۔ درشہوار کو لگا کہ اب سلمان کی بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ اسے صنوبر کو اصل بات اور پوری حقیقت بتا دینا چاہیے۔

''ٹھیک ہے پھر میں صنوبر کو حقیقت بتا دیتی ہوں۔ اس کی شادی ختم ہو چکی ہے اور اس کے گھر کے باہر رحمٰن کے گھر میں کوئی ایسا طوفان برپا ہے جس کا صرف شور ہی باہر کی دنیا کو سنائی دے رہا ہے۔ ہوا کیا ہے۔ یہ تو ہم میں سے بھی کوئی نہیں جانتا۔ تم ایسا کرو اپنے پاپا کے پاس جاؤ اور ان سے کہو رحمٰن کو فون کرتے رہیں شاید کوئی لمحہ کوئی وقت ایسا ہو صحیح بات معلوم ہو سکتی ہو۔''

''ٹھیک ہے'' یہ کہہ کر سلمان آصف کے کمرے کی طرف چلا گیا اور درشہوار صنوبر کے کمرے میں آ گئی۔

صنوبر فریش ہو چکی تھی مگر اس کے چہرے سے اب بھی یوں لگتا تھا جیسے وہ پتا نہیں کب سے بیمار ہے، اس کی ساری خوبصورتی اور شادابی کو کسی مہلک غم نے گھلا کے رکھ دیا ہو۔ درشہوار کو دیکھ کر وہ جیسے زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔

''ہاں وہ تو اسی لیے آفس بھی نہیں گئے۔ یہ جانے بغیر کسی کو بھی فیس کرنا آسان تو نہیں ہے۔ صبح سے فونز کا بھی تانتا بندھا ہوا ہے۔ لیکن ہم کوئی بھی فون نہیں سن رہے سب پر میسج لگا دیا گیا ہے اس وقت انھیں ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ رحمٰن کے کونٹیکٹ میں آنے سے پہلے کچھ بھی بتانا مشکل ہے۔ کئی لوگوں کو تو چوکیدار نے یہ کہہ کر واپس کیا ہے کہ اس وقت صاحب لوگ گھر پر نہیں ہیں۔ گھر تک پہنچ رہے ہیں لوگ۔ اور ہماری بے بسی دیکھو ہم کچھ بھی نہیں جانتے کہ رحمٰن نے ہمیں دوسروں کے سامنے کٹہرے میں کھڑا کر رہا ہے وہ بھی اس طرح کہ ہمارے پاس تو ایک گواہ جتنی باتیں بھی نہیں ہیں کسی کو بتانے کو اور تماشا یہ ہے کہ ہم گواہ نہیں بلکہ اس مقدمے کا دوسرا متاثرہ فریق ہیں۔

''فارس گھر میں گھسا ہوا کیا کر رہا ہے وہ اپنے پاپا کو تلاش کرنے کیوں نہیں گیا۔'' صنوبر کو فارس کی بے حسی پر غصہ آ رہا تھا اور ساتھ ہی اسے یاد آنے لگا کہ اس کا شرجیل تو سب کچھ تھا پر وہ ایسا بے حس نہیں تھا۔ اس کو سوچوں میں پھر سے جاتے دیکھ کر درشہوار نے اسے کہا۔

''آؤ باہر نکلو یہاں سے ناشتا کر لو یا لنچ کر لو۔ آصف کو میں بتا کر آتی ہوں کہ تم بیدار ہو چکی ہو۔''

''کیا پاپا بہت پریشان ہیں؟'' صنوبر کے سوال پر جاتے جاتے درشہوار نے اپنی بیٹی کی طرف پلٹ کر دیکھا تو اسے لگا جیسے یہ تو وہ پرانی والی صنوبر ہے۔ جو ہمیشہ سے اسی طرح سے بات کیا کرتی تھی۔

''ہم صرف تمہارے لیے پریشان ہیں بیٹے۔ تم اگر یہ کہو کہ تم ایک دم ٹھیک ہو تو ہماری پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔'' درشہوار کی بات نے صنوبر کو ایک ایسے احساس سے روشناس کرایا جو اس سے پہلے اس کے دل میں جاں گزیں تھا تو اسے اس کا اس شدت سے احساس نہیں تھا۔ اسے لگا اس کے والدین اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ایک ایسی محبت کہ اس وقت جب دنیا کے سامنے ان کی رسوائی ہو رہی ہے۔ عزت خاک میں مل رہی ہے اور ایسے وقت میں بھی انھیں اپنی اس بیٹی کی فکر ہے جس کی وجہ سے وہ ان مصیبتوں میں گرفتار ہوئے ہیں۔ درشہوار کے پیچھے ہی صنوبر بھی کمرے سے نکل آئی۔

کچن میں سلمٰی کام کر رہی تھی وہ شاید لنچ کا انتظام کرنے میں مصروف تھی۔ درشہوار کچن کے پاس آ کر خاموشی سے کھڑے ہو کر سلمٰی کو کام کرتے ہوئے دیکھنے لگی جیسے وہ دیکھ بھی رہی ہے اور سوچ سمجھ رہی ہے ایسی حالت میں اکثر نظریں جس طرف کو ہوتی ہیں اور سب جو یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں نگاہیں ہیں وہیں دیکھنے والا دیکھ بھی رہا ہے تو یہ ٹھیک نہیں ہوتا سوچوں کی طاقت اتنی زیادہ ہوتی ہے بینائی اس سے معطل ہو کے رہ جاتی ہے اور دکھائی کچھ بھی نہیں دیتا۔ ایسا ہی کچھ اس وقت صنوبر کے ساتھ بھی تھا۔ وہ دیکھ تو سلمٰی کی طرف رہی تھی لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ سوچوں کی چہار طرف سے ہونے والی یلغار نے اس کی دیکھنے کی صلاحیت پر قبضہ کر لیا تھا یا اسے معطل کر دیا تھا۔ وہ کیا سوچ رہی تھی اگر اس وقت کوئی اس سے پوچھتا تو شاید وہ بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ کیا سوچ رہی تھی یہ کہ اس کی زندگی اور قسمت کتنی عجیب ہے کس طرح اسے پے در پے مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کبھی شرجیل کا باپ اسے صنوبر سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرنے کے لیے ملک سے باہر بھیج دیتا ہے اور جب وہ واپس آتا ہے تو صنوبر کو اس کے یوں اس طرح اچانک چلے جانے کی وجہ پتا چلتی ہے اور ان سب دنوں میں وہ کسی اندھے کی طرح یہاں وہاں بھٹکتی رہتی ہے کوئی نہیں بتاتا کہ اس کا شرجیل کہاں چلا گیا ہے۔ پھر جب وہ واپس آتا ہے تو وہ اس کے ملنے کی خوشی میں اسے وہ سب کچھ معاف کر دیتی ہے اور جس نے اسے پہروں تڑپایا اور وہ بھی بے نام و نشاں.... پھر شرجیل اپنے باپ کے، فارس کے اور رحمٰن صاحب کے سامنے مضبوطی سے کھڑا ہو جاتا ہے خاندان کی تباہی یا کوئی بھی اور دھمکی اسے صنوبر سے دور کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ وہ محبت کی وہ مثال بن جانے کو تیار ہو جاتا ہے جہاں اچھے اچھوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر اس پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے اور پھر ایک دن وہ اسے اسی طرح چھوڑ کر چلا جاتا ہے جیسے پہلے گیا تھا۔ وہ اس بے عزتی کے ردعمل میں فارس سے شادی کرنے کو ہاں کر دیتی ہے عین شادی سے دو دن پہلے اسے خبر مل رہی ہے کہ اس کی شادی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے۔ فارس کے باپ نے اسے اپنی وراثت سے بے دخل کر دیا ہے اور شرجیل کا کہیں کچھ پتا نہیں۔ وہ شرجیل کو یہ دکھ بھی نہ دے سکی وہ ردعمل میں چاہتی تھی جس طرح شرجیل نے ایک بار نہیں دو بار اسے اس طرح اکیلا چھوڑ دیا کہ وہ یہ تک نہیں جانتی کہ وہ کہاں گیا ہے اور کیوں گیا ہے کب واپس آئے گا آئے گا بھی یا نہیں۔ بس

بتانے سے وہ درست ثابت ہوا اور صنوبر اسی دورے میں چلی گئی جو اس کی طبیعت کو خراب کرنے کا ایک اشارہ ہوتا ہے۔ وہ شاید اپنے ہوش و حواس سے بےگانہ ہو چکی تھی۔

''یا اللہ اب میں کیا کروں گی۔ آصف تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔ اب کیا کروں۔ میں ماں ہوں اس کی میں ایسا کیوں چاہوں گی۔ مجھے بھی اتنی ہی پیاری ہے میری بیٹی جتنی کہ اسے پیاری ہے۔'' درشہوار اس طرح بول رہی تھی جیسے وہ آصف کے سامنے کھڑی ہوئی صفائی پیش کر رہی ہو۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہونے لگی اسے لگنے لگا کہ اس کی بیٹی اب نارمل نہیں رہی۔ اسے فکر ستانے لگی کہ اگر بےہوشی سے واپس آنے کے بعد وہ اسے پہلے کی طرح کچھ بھی یاد نہیں رہا تو وہ کیا کرے گی۔ کیا پھر سے سب کچھ بتانا ہوگا۔ اور کیا وہ پھر یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ کتنے ہی سوال تھے جو اسے سانپ کی طرح ڈسنے لگے۔ اور وہ بےبسی سے رو پڑی۔ لیکن رونے سے کیا ہونے والا تھا۔ اسے آصف کو جا کے بتانا ہی ہوگا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مجھے مان لینا چاہیے کہ یہ سب میرا قصور ہے۔ میں نے ہی اسے اتنی جلدی وہ منحوس خبر پڑھوائی نہ پڑھوائی تو اسے کم سے کم اس بےہوشی اور اس پراسرار بیماری سے تو بچا سکتی تھی۔ اب اگر آصف نے اسے اس حالت میں دیکھ لیا تو اسے یقین ہو جائے گا صنوبر کو علاج کے لیے بیرون ملک ضرور لے جانا ہوگا۔ پتا نہیں اور کیا کیا سوچ کر وہ اٹھی اور آصف کو بتانے کے لیے جانے لگی۔ ابھی وہ دروازے کا ہینڈل پکڑنے بھی نہیں پائی تھی کہ اسے صنوبر کی آواز سنائی دی اور وہ واپس پلٹی۔ کچھ دیر اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے سے وہ ہوش میں آ گئی۔ درشہوار کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا وہ میری صنوبر کہہ کر اس سے چمٹ گئی۔

''آپ کو میری شادی کے ٹوٹ جانے کا بہت رنج ہوا ہے ماما؟'' جیسے وہ اپنی ماں سے پوچھ رہی تھی۔ درشہوار نے یہ سن کر اسے اپنے بازوؤں سے آزاد کیا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں سب کچھ یاد ہے میری صنوبر؟''

''جی مجھے سب کچھ یاد ہے ماما'' صنوبر کی بات سن کر درشہوار کو تو جیسا ساری دنیا کی سب سے بڑی خبر سننے کو مل گئی تھی یعنی صنوبر اب پوری طرح ٹھیک ہے۔ اور اسے سب معلوم بھی ہے۔

''آپ نے پوچھا نہیں انھوں نے ایسا کیوں کیا ہے؟'' اس کے چہرے کا اطمینان دیکھنے کے بعد درشہوار کو یہ یقین ہونے لگا کہ صنوبر کے دماغ پر اس شادی کی وجہ سے بوجھ ہے وہ یہ بوجھ اتارنا چاہتی ہے مگر اب اسے خود ایسا لگنے لگا ہے کہ اس شادی کا بوجھ اتارنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اور اب شادی ہونے کے علاوہ کوئی اور راستا باقی نہیں بچا، اور اب جو یہ بوجھ خود بخود کسی انہونی کے سے انداز سے ہو گیا ہے تو صنوبر کا سارا بوجھ اعصابی تناؤ ختم ہو گیا ہے اور وہ نارمل معلوم ہو رہی ہے۔

''پوچھنے کے لیے ہم صبح سے مسلسل فون کر رہے ہیں مگر ان لوگوں کے گھر میں تو جیسے ماتم ہو رہا ہے، رحمن کہیں چلا گیا ہے۔ کہاں؟ کوئی نہیں جانتا۔ اس نے موبائل فون بھی بند کیا ہوا ہے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا۔ اپنے آفس میں بھی نہیں ہے۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ فارس مسلسل سو رہا ہے اور اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکل رہا سوائے ناشتا اور کھانے کی حاجت کے۔ تینوں عورتیں اس گھر میں اس وقت بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح ادھر ادھر گھومنے کے علاوہ ایک ہی جگہ ایک ہی کمرے میں ایک دوسرے کا سہارا بننے کی کوشش کر رہی ہیں۔'' درشہوار کی بات ختم ہوئی تو صنوبر کسی گہری سوچ میں چلی گئی۔

''کیا سوچ رہی تھیں؟'' درشہوار اس وقت صنوبر کے اندر کیا چل رہا ہے سب جاننا چاہتی تھی۔

''سوچ رہی ہوں کہ یہ تو کوئی انہونی ہے، فارس نے ایسا کیا ہے جو رحمن انکل نے اتنا بڑا قدم ایسے اٹھایا جیسے وہ اب فارس کی صورت بھی دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔''

''صحیح کہتی ہو تم... کچھ تو ایسا ضرور ہوا ہے جو رحمن جیسے ہوشیار اور تحمل مزاج آدمی نے ایسا عجیب و غریب فیصلہ لیا ہے، صاف لگ رہا ہے اتنا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے اس نے کسی سے پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اسی لیے کسی کو کچھ پتا نہیں اور صبح ہی صبح پھر سے آفس جانے کی طرح گھر سے نکل گیا ہے۔''

''کیا پاپا کو پتا چل گیا ہے اس خبر کا؟'' صنوبر نے دھیمی اور نیچی آواز سے پوچھا۔

گفتگو میں بڑھنے لگی۔ درشہوار سوچ رہی تھی کہ ان باتوں سے آصف آخر کیا جاننا چاہتا ہے۔ صنوبر جیسے کسی سوچ میں گم ہو چکی تھی وہ شاید کوئی خواب سوچ رہی تھی جو سنانے لے قابل ہو اور اسے ٹھیک سے یاد بھی ہو۔

''عموماً خواب یاد نہیں رہتے'' جیسے درشہوار نے بیٹی کی حمایت میں کہا۔ ساتھ ہی اس نے آصف کی طرف دیکھا کہ اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ آصف کیا سوچ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔

☆......☆

پورا دن تقریباً گزر چکا تھا۔ رحمٰن کی اب تک بھی واپسی نہیں ہوئی تھی اور سلمان ابراہیم۔ فارس کو قابو کیے کیے تھک چکا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فوری طور پر یہاں سے نکلے اور اپنی صنوبر کی طرف جا کے یہ دیکھے کہ وہ کیا کر رہی ہے اور ان سب واقعات کے رونما ہونے کے بعد وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔ لیکن وہ مجبور تھا جب تک فارس کے گھر میں سب کچھ نور یٹرن پر نہیں آ جاتا اسے یہیں رہنا ہوگا۔ اسے اپنے ہم زاد کا بھی خیال آیا لیکن پھر اس خواب کو اس نے خود ہی جھٹک دیا۔ پچھلی بار اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس ہمزاد دھیرے دھیرے اپنی شکتیوں کو اپنے قابو میں کرتا جا رہا تھا کہ اگر اسے دو چار بار اور وجود عطا کیا تو ہو سکتا ہے وہ ایک الگ جن بن کر سامنے آ جائے۔ اس کی نیت میں بھی فتور آنے لگا تھا وہ شاید مستقل وجود پانے کے بارے میں سوچتے ہوئے صنوبر پر بھی بری نظر رکھنے لگا تھا اس لیے سلمان نے سوچا کہ اسے ایسے حالات میں وجود عطا کرنا خطرناک ہو سکتا ہے کہیں ایسا نہ ہو وہ اپنی مقصد برابری میں کوئی ایک مصیبت کے بیچ آ جائے۔ پھر اسے کنعان کا خیال آیا۔ ہمزاد کو اب کبھی بھی وجود عطا کرنے کے ارادے سے وہ باز آ گیا۔ پہلے ہمزاد اس کا وفادار تھا اور اس کے اشاروں پر چلا کرتا تھا اب ایسا لگ رہا تھا کہ اگر اسے عدم سے وجود میں لے آیا گیا تو کہیں وہ کوئی مصیبت کھڑی نہ کر دے۔ اسے صابو سے بھی حساب چکتا کرنا تھا جس کی وجہ سے شرجیل کو یہ دنیا چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ پھر بہت ہی ہمیشگی سے ایک خیال اس کے ذہن کے پردے پر طلوع ہوا کہ اگر شرجیل زندہ رہتا تو وہ صنوبر کو پانے کا خواب ہی دیکھ سکتا تھا اسے حاصل تو نہیں کر سکتا تھا اور اب بھی اسے صنوبر کو پانے کی خاطر اسے شرجیل کا ہی روپ دھارن کرنا ہوگا۔ ورنہ صنوبر کو ساری زندگی کے روگ سے نجات دلانا ممکن نہیں ہوگا۔ کنعان نے اس کے لیے بڑی لازوال قربانی دی تھی نہ صرف وہ سردار سے اس کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر جنگ کرتا رہا اور پھر اپنا سب چھوڑ کر، کوئی بھی جن اپنا قبیلہ کسی کے لیے بھی نہیں چھوڑتا مگر کنعان نے یہ بھی کر دکھایا تھا۔ پتا نہیں بابا کیسے ہوں گے اور کیا سوچتے ہوں گے۔ ضرور بے چین اور پریشان ہوں گے اور اس صورت میں تو وہ اور بھی بے چین ہو رہے ہوں گے کہ میں انھیں چھوڑ کر وہ بھی ایک بیابان میں یہاں چلا آیا جہاں آنے میں اس سے ایک دن کی اور تاخیر ہو جاتی تو اس کا سب کچھ لٹ چکا ہوتا۔ صنوبر فارس کی دلہن بن کے اس کی زندگی میں جا چکی ہوتی۔ سوچتے سوچتے اس نے محسوس کیا کہ فارس کا جسم اب اور سونا نہیں چاہتا تھا وہ کسمساہٹ کا شکار ہو چلا تھا اور اب اسے زیادہ دیر قابو رکھنا بھی مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ سلمان نے سوچ لیا تھا کہ اگر فارس نے کچھ بھی گڑبڑ کی تو اسے جان سے مارنے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔

صنوبر کو پانے کا تصور ہی کس قدر فرحت انگیز تھا سارے جسم اور روح میں ایک ایسی شانتی اور مستی سرایت کرنے لگتی تھی جسے دنیا کی کوئی بھی زبان بیان کرنے سے عاجز تھی۔ الفاظ جہاں اپنی قدرت کی بے بسی کا اظہار کریں وہاں سے شروع ہوتا تھا وہ احساس سے جس نے سلمان کے دل میں کو اپنی نرم نرم بانہوں میں سمیٹ رکھا تھا اس احساس سے باہر نکلنا جیسے جنت سے نکالے جانے والے واقعے سے بھی زیادہ دردانگیز سانحہ تھا۔ اب منزل قریب ہے سب سے بڑی رکاوٹ اس نے اپنی ساری شکتیوں کو بروئے کار لا کر سامنے سے ہٹا دی تھی۔ وہ مسرور ہو رہا تھا اس کے من مندر میں جیسے پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ وہ جلد سے جلد اس جنجال پورے سے نکل کر اپنی صنوبر تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی بھی ذی نفس جو چاہتا ہے وہ ایسے ہی کب ہوتا ہے جیسے اس نے چاہا زندگی تو جبر و قدر کی بندشوں کا ایک قید خانہ ہے بالکل ایسا ہی جیسے اس وقت وہ قید تھا فارس کے بے ایمان اور تکلیف دہ جسم میں قید اور صعوبتیں سہتا ہوا۔ اس ساری دلفریبی میں ایک بار بھی کہیں سے اسے یہ آواز سنائی نہیں کہ صنوبر ایک انسان تھی اور وہ ایک جن تھا... جن...

اس کا باؤلا دل کہتا تھا کہ وہ ضرور واپس آئے گا۔ پتا نہیں کب لیکن آئے گا ضرور...... سوچوں سے الجھ رہی تھی کہ سلمٰی نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی صنوبر بی بی؟''

''میری طبیعت......؟؟ مجھے کیا ہوا ہے۔'' وہ ایک مختصر سا سوال کر کے خود سے ہی پوچھنے لگی اسے یاد آ گیا کہ ایک بار اسے سلمٰی نے ہی بتایا تھا کہ اس پر عجیب و غریب قسم کے دورے پڑتے تھے جس کے لیے اسے کسی روحانی علاج والے کو دکھانے کے بارے میں سوچا جاتا رہا تھا اور ہوسپٹل بھی لے جایا گیا تھا لیکن اسے تو کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ وہ بات جیسے اسے ختم کرنا ہی پڑی کہ اس بات کو مزید طول دینے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ لیکن اب سلمٰی نے پھر اسی انداز سے پوچھا تھا۔

''مجھے کیا ہوا تھا سلمٰی؟'' صنوبر کو لگا کہ اس کے اس سوال پر سلمٰی گھبرانے لگی اور جان چھڑانے کو کھانے کے بارے میں بتانے لگی کہ اس نے آج کیا بنایا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

''میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔ گھبراؤ مت میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی'' صنوبر کو تجسس ہونے لگا۔

سلمٰی کو صنوبر کے سوال کا جواب میں بتانا ہی پڑا کہ اس پر پھر اسی نوعیت کے دورے پڑے تھے۔ صاحب اور بیگم صاحبہ لوگ تو بہت پریشان ہیں لیکن ان کی بات کوئی بھی نہیں مان رہا آپ کو پیر معصوم علی شاہ کے مزار پر لے جانے اور تعویز پلانے بہت ضروری ہیں۔ دیکھنا آپ بس دو دن میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' سلمٰی اس کے آگے بھی جانے کیا کچھ کہتی رہی مگر صنوبر تو جیسے الجھ چکی تھی۔ ان دوروں کا کیا مطلب ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے ایسا کیا نام ہے اس بیماری کا۔ کیا میں کسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو چکی ہوں۔ سوچوں کے سمندروں میں ابھرتی ڈوبتی صنوبر اور پتا نہیں کب تک خود سے کیا کیا پوچھتی رہتی کہ اسے اپنے قریب ہی اپنے پاپا کی آواز سنائی دی۔

''کیوں بیٹے کیا یونہی کھڑی رہو گی۔ آؤ بیٹھو کھانا کھاتے ہیں'' وہ چونکی اور اس نے ایک ہمدردانہ نظر اپنے باپ پر ڈالی اس کے پیار بھرے لہجے میں جو مٹھاس بھی اس کا نعم البدل دنیا کی ساری دولت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ کھانا شروع ہوا۔ سلمان بار بار کن انکھیوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ ایک دو بار صنوبر نے نوٹ کیا پھر پوچھ ہی لیا۔

''سلمان تم آج اپنی یونیورسٹی نہیں گئے؟'' سوال غیر متوقع تھا اس لیے وہ یکلخت چونک سا گیا۔ لیکن جواب میں بس ایک چھوٹی سی نہیں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اس کے پاس جس وجہ سے وہ یونیورسٹی نہیں گیا تھا وہ وجہ خود صنوبر ہی تھی لیکن یہ بات کہی تو نہیں جا سکتی تھی۔ کھانا ختم ہوا اور یہ چاروں ایک بڑے سے لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ چاروں جیسے یہ انتظار کر رہے ہیں کہ کوئی اور بات شروع کرے تو خاموشی کا قفل ٹوٹے۔ لیکن سب کے سب یہ سوچ رہے تھے کہ کیا بات کی جائے۔

آصف نے یونہی صنوبر سے پوچھا ''آپ ٹھیک ہو بیٹا صنوبر؟''

''جی پاپا میں ٹھیک ہوں'' مختصر جواب ہی توقع کی جا رہی تھی۔

''کیوں نا ہم رحمٰن صاحب کے گھر جا کے اندر جانے کا گھر میں بیٹھنے کا مطالبہ کریں۔'' سلمان کو انھوں نے دونوں بار باہر سے ہی واپس بھیج دیا تھا۔ سلمان کو ایسا لگا بھی جیسے اندر کوئی گڑ بڑ ہے لیکن یہ صرف کا شبہ تھا شبے کی بنیاد پر کسی کے بھی گھر میں گھسا نہیں جا سکتا تھا۔ آصف نے درشہوار کی بات سنتے ہوئے صنوبر کی طرف دیکھا اور جیسے سنی ان سنی کر دی۔ اچانک اس کے ذہن میں اس سوال کی گونج سنائی دی کہ صنوبر ایک رات پہلے جب یہ کہہ رہی تھی کہ اس نے ہم تینوں سے الگ الگ بات کی تھی اور تینوں نے اسے اسی ایک مسئلے پر سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ فارس سے شادی نہ کرے تو کیا صنوبر کسی بھی تصور کو اتنا اسٹرونگ بنا سکتی ہے کہ اسے سامنے بٹھا کر اس سے بات چیت کر سکتی ہو؟ اس نے صنوبر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''صنوبر بیٹے یہ بتائیں کیا آپ کو خواب نظر آتے ہیں؟'' سوال سن کر درشہوار بھی چونکی تھی کہ یہ عجیب سا ہی سوال تھا۔ خواب تو سب ہی نظر آتے ہیں۔

''جی پاپا'' صنوبر نے پھر اختصار سے کام لیا۔

''اچھا تو پھر تمہیں اگر کوئی خواب یاد ہو تو ہمیں بھی سناؤ'' آصف کی بات سب کر باقی دونوں کی دلچسپی بھی باپ بیٹی کی

دیا۔

''رحمٰن تھا وہ کچھ دیر تک ہمارے گھر آ رہا ہے۔ ابھی وہ اپنے گھر نہیں گیا اس کا کہنا ہے کہ اسے پہلے ہم سے بات کرنی چاہیے کیونکہ اس نے ہمارے ساتھ غلط کیا ہے۔''

''کچھ اندازہ ہوا وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' درشہوار نے کہا۔

''یہ تو اس کے آنے پر ہی پتا چلے گا۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' آصف کو درشہوار کا یہ سوال فضول معلوم ہوا۔

''اگر انھوں نے پھر سے اس رشتے کو بحال کرنے کی بات کی تو آپ لوگوں کا کیا جواب ہوگا؟'' اس قدر اچانک پوچھے گئے اس سوال کے لیے تو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ آصف اور درشہوار دونوں نے وقفے سے صنوبر کی طرف دیکھا۔ صنوبر کو اپنے چہرے پر چھ آنکھوں کی چبھن محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اس نے کچھ گہرے سانس لیے۔ لیکن وہ کچھ نہیں کہہ سکی جیسے الجھنے لگی۔

''میں سمجھ گیا تم سوچ رہی ہو ابھی کچھ دیر پہلے تم سے یہ پوچھا گیا تھا کہ اگر ایسے میں شرجیل آ جاتا ہے تو کیا تم اسے معاف کر کے اس سے شادی کے لیے تیار ہو جاؤ گی۔ اور اب تم سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا تم اس رشتے کو بحال کرنے پر راضی ہو؟ صنوبر تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ ایسے ہی الجھ کے رہ جاتا سچ پوچھو تو قسمت نے تمہاری زندگی کو تماشا بنا دیا ہے میری بہن مگر تم سے میں ایک ہی بات کہوں گا۔ تم جو بھی جواب دو اس میں صرف اپنا فائدہ دیکھنا، یہ دیکھنا کہ تمہارا دل کیا چاہتا ہے۔ اب ویسے بھی تمہیں ماما، پاپا یا لوگوں کی پروا کرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے اب تو سارے شہر میں جو بدنامی ہونی تھی وہ ہو چکی ہے۔ تمہیں اب کسی کی بھی پروا نہیں کرنی جو بھی جواب دو اسے ٹھیک سے سوچ کر دینا میں تو کہوں گا صرف اپنے دل کی بات سنو وہ کیا کہتا ہے۔'' سلمان کی اس لمبی تقریر کو سننے کے بعد درشہوار نے جھٹ سے اٹھ کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور بولی۔

''تم میرے بیٹے اتنے سمجھدار کب ہوئے میں تو سوچتی تھی تم کوئی بہترین بات کہنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ میں یہ جان کر بھی خوشی سے مرنے والی ہوں کہ تم اپنی بہن سے اتنی محبت کرتے ہو۔'' سلمان نے اپنی ماں کو اور زور سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''اب آپ کو مجھ سے کبھی شکایت نہیں ہوگی ماما۔ صنوبر کی زندگی کے ان سارے دکھوں نے مجھے بہت حساس بنا دیا ہے۔ میری بہن آندھیوں میں رکھے چراغ کی طرح جل رہی ہے لرز رہی ہے اور کچھ پتا نہیں چل رہا ہے وہ کب تک ان مخالف ہواؤں کا مقابلہ کر سکے گی۔ پتا نہیں اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے'' سلمان کی بات سن کر صنوبر نے ایک ہچکی لی اور رونے لگی۔ آصف نے جلدی سے اپنی بیٹی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور کہنے لگا۔

''تمہارا جو بھی فیصلہ ہوگا ہمیں اس پر سر جھکانا ہے میرے بچے میں جانتا ہوں تم اس وقت پل صراط کے بیچوں بیچ کھڑی ہو تمہیں سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کہاں سے اترو۔ ایک طرف تمہاری محبت ہے تمہارا شرجیل ہے جسے پانا پہلے ناممکن لگتا تھا اس کی وجہ رحمٰن کا سرفراز کے کاروبار پر ہونے والا قبضہ تھا۔ سرفراز اپنے بیٹے سے ہمیشہ یہی چاہتا کہ وہ اپنی محبت قربان کر کے اپنے خاندان کو بچالے۔ لیکن اب حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں اب رحمٰن سرفراز کو مجبور کرنے اور دباؤ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اب شرجیل بھی زیادہ آزادی سے اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس لیے میرے بیٹے تم بھی پوری آزادی سے فیصلہ کرو کہ تمہیں کیا چاہیے۔'' آصف نے بیٹی کو دلاسا تو دیا مگر اسے یہ ضمانت کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ اگر وہ اپنی محبت کے حق میں فیصلہ کرتی ہے تو کیا شرجیل واقعی واپس آئے گا۔ اس کے بارے میں تو کسی کو کچھ بھی پتا نہیں ہے۔ وہ اگر واپس نہ آیا تو کیا ہوگا۔ تب کیا صنوبر کو ساری زندگی اس کے نام پر گزارنے کا حق دیا جائے گا۔ شرجیل اگر اسے اعتماد میں لے کر اسے بتا کر گیا ہوتا تو وہ اس کے لیے کبھی نہ مانتی وہ محبت کے سب مخالفوں سے اکیلے ہی مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتی۔ مگر اب جبکہ اس کے محبوب نے اسے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ اسے اپنے بارے میں ایک فون ہی کر دیتا بتا دیتا کہ وہ کہاں ہے بھلے ہی ساتھ میں یہ بھی کہہ دیتا کہ صنوبر کسی کو کان و کان خبر بھی نہ ہو کہ میں کہاں ہوں۔ تو میں مرجاتی مگر کبھی کسی کو نہ بتاتی کہ

کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک انسان لڑکی کا ایک جن سے بیاہ ہو جائے اور وہ دو پریمیوں کی طرح ہنسی خوشی زندگی گزار سکیں۔ اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ شرجیل کا روپ پہننے کے بعد بھی وہ شرجیل جیسا بن تو نہیں جاتا تھا۔ فرض کر لیا جائے کہ اگر اسے صنوبر مل بھی گئی تو کیا اسے وہ خوشی بھی مل سکے گی جس کی چاہ میں وہ یہ سب کر رہا تھا کیا صنوبر اس کے ساتھ ایک شادی شدہ زندگی خوشی خوشی گزار سکے گی۔ مخلوق تو خدا کی ہیں وہ دونوں پر جیسے زمین اور آسمان جنہیں اسی خدا نے تخلیق کیا تھا جس نے اسے اور صنوبر کو بنایا تھا۔ ایک دوسرے کے سامنے مگر ایک دوسرے سے اتنا دور کہ چاہ کر ایک دوسرے کو چھو تک نہیں سکتا اسی لیے وہ دونوں کا ملاپ بھی ناممکن تھا۔ ناممکن ہے۔ ایسی باتیں کوئی بھی اس وقت کیسے سوچ سکتا ہے جب زندگی اپنی منزلوں مرادوں سے ہمکنار ہونے والی ہو۔ ایسی بات تو کوئی قصداً بھی سمجھانے کی کوشش کرے تو ذی نفس اس کا منہ توڑ ڈالے سو سلمان نے بھی ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ آنے والا وقت اس کی جھولی میں کیا ڈالنے والا تھا۔ ساری زندگی کی خوشی یا ساری زندگی کا روگ..... اسے کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ اس کا اور صنوبر کا عشق صرف عشق نہیں تھا بلکہ یہ زہر عشق تھا... زہر عشق.....!

☆......☆

''مجھے ہمیشہ ایک ایسا خواب نظر آتا ہے جیسے میں ایک وسیع قید خانے میں پکڑ کر لائی گئی ہوں۔ وہاں سے نکلنا چاہتی ہوں یا نہیں نکلنا چاہتی اس سوال کا جواب نہیں ملتا کبھی اس خواب میں۔ کتنی ہی بار وہ خواب میری آنکھوں میں اترتا ہے اور ہر بار اس کشمکش کو ہوا دے کر رخصت ہو جاتا ہے، میں نے اس خواب کا شرجیل سے بھی ذکر کیا تھا۔'' صنوبر نے خواب سناتے ہوئے رک کر اپنے پاپا کی طرف دیکھا جیسے وہ یہ جاننا چاہتی ہو کہ اسے شرجیل کا ذکر کرنا چاہیے یا اب اس آدمی کا نام لینا بھی اس کے لیے کسی زخم کے اندر اترنے والی نشتر جیسا ہے۔

''تو کیا کہا شرجیل نے؟'' آصف کی آواز کے ٹھہراؤ کو محسوس کر کے شہوار کو لگا جیسے آصف کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح بس یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ جس جنگ میں اسے زبردستی اترنا پڑا ہے وہ کب ختم ہو گی اسے خود یقین نہیں ہے کہ اس جنگ کا کوئی انت ہے۔ اسے لگتا ہے جیسے اب تو یہ جنگ عمر بھر کے لیے ملنے والا ایسا تحفہ ہے جس کے ساتھ جیتے رہنے کی اسے عادت ڈالنی ہو گی۔

''شرجیل نے کہا خواب تو خواب ہوتے ہیں۔ کسی زمانے میں ایسے لوگ ہوا کرتے تھے جو خوابوں کی صحیح صحیح تعبیر و تشریح بتایا کرتے تھے۔ اب نہیں ہوتے ایسے لوگ۔ جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خواب کی درست تعبیر بتا سکتا ہے وہ جھوٹ بول رہا ہوتا ہے اور ہم سب اس وقت جھوٹوں کی دنیا میں اس طرح پھنس چکے ہیں کہ ہمیں وسوسوں کے ساتھ جینا پڑتا ہے۔ کوئی نہیں جس سے ہم زندگی کے اصل معنی معلوم کر سکتے ہوں، ہر ایک کے پاس اپنے ہی معنی ہیں اور جتنے منہ اتنی باتیں۔ بے شمار معنوں کی موجودگی میں بھی زندگی بھٹک رہی ہے اسے اب تک بھی یہ سمجھ نہیں آیا کہ اس کا اصل چہرہ کون سا ہے۔ ہر گام پر ایک آئینہ لگا ہوا ہے اور اس کے آس پاس بہت سارے چھوٹے چھوٹے آئینے لگے ہوئے ہیں مجھو جو بھی ان آئینوں میں اپنی اصل صورت تلاش کر سکتا ہے صرف وہ جانتا ہے کہ زندگی کا اصل چہرہ کون سا ہے۔'' وہ چپ ہوئی تو سلمان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دیکھیں تو ذرا پاپا اس صنوبر کو کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ کتنی مشکل مشکل باتیں کرنے لگی ہے ایسی باتیں جو ہم جیسوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ صنوبر نے ایک نرم سی نظر سلمان پر ڈالی اور اس کے ہونٹوں پر ایک باریک سی مسکراہٹ تیر گئی۔

''تو کیا یہ ممکن ہے شرجیل واپس آجائے اگر تو تم اس سے شادی کرنے کو مان جاؤ گی؟'' عین اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی نے ان کی محویت کو درہم برہم کر دیا۔ آصف نے ایسے لپک کر فون کو پکڑا جیسے ذرا بھی دیر ہوئی تو فون بند ہو جائے گا اور وہ اس خبر سننے سے محروم ہو جائے گا جس میں ان کے سارے مسائل کا حل پوشیدہ ہے۔

فون سنتے ہوئے اس کا چہرہ ایسا ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم میں موجود لہو میں کوئی طغیانی آگئی ہو۔ دوسری طرف جو بھی تھا اس نے آصف کو جیسے کچھ بھی پوچھنے اور سوال کرنے کا موقع ہی نہیں دیا سب کچھ خود ہی کہتا رہا۔ آصف نے فون رکھا تو ان تینوں کے چہرے بے بسی کی علامت بنے ہوئے تھے۔ آصف نے انہیں زیادہ لمبے سسپنس میں نہیں رکھا اور فوراً ہی بتا

جانے وہ کیا کرنے والی تھی کیا کہنے والی تھی۔

''ہاں میں یہی چاہتا ہوں تم فارس سے شادی مت کرو'' سلمان نے اتنی زور سے کہا کہ دوسرے کمرے میں موجود درشہوار کو بھی اس کی آواز سنائی دی۔ اب درشہوار کے لیے اس گفتگو کو سنے بغیر رہنا مشکل ہی ناممکن تھا۔ آصف اپنے کمرے میں جا چکا تھا وہ دھیرے اور دبے پاؤں چلتی ہوئی لاؤنج کے قریب دیوار کے پاس کھڑے ہو کر اپنے دونوں بچوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے لگی۔

''میں نے فارس سے انکار کر دیا۔ شرجیل بھی کبھی واپس نہ آیا تو؟'' سلمان تو سلمان یہ سن کر تو درشہوار کے بھی ذہن کے پرخچے اڑ گئے۔ ایسی بات تو کوئی بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ سلمان منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تب صنوبر کی آواز درشہوار کو سنائی دی۔

''سنو میرے بھائی۔ میں نے ماں باپ کی موجودگی میں تم سے بات کیوں کرنا چاہی۔ میں فارس کو انکار کرتی ہوں اور شرجیل بھی واپس نہیں آتا تو میں چاہتی ہوں تم میرے ساتھ کھڑے رہو گے۔ ہمیشہ میں ساری زندگی شرجیل کے نام پر گزاروں گی مگر آج میرے ماں باپ میری محبت میں مجھے ہر فیصلہ خود کرنے کا اختیار دے رہے ہیں پھر ان سے میرا اکیلا جیون دیکھا نہ جائے گا۔ وہ میری کسی سے بھی شادی کرنا چاہیں گے تب ضرورت ہوگی مجھے تمہاری تم میرے ساتھ کھڑے رہو گے اور ہر دباؤ کے سامنے مجھ سے پہلے خود ڈٹ کے کھڑے رہو گے اور کہو گے کہ صنوبر کی شادی ہوگی تو شرجیل سے ہوگی ورنہ کسی سے نہیں ہوگی۔ بولو کیا تم یہ کرو گے؟'' درشہوار کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لکیریں ابھرنے لگیں۔ اس کی بیٹی جوگ لینا چاہتی تھی اور اسے ماں باپ پر اس معاملے میں بھروسا نہیں تھا کہ وہ اسے جوگن بننے نہیں دیں گے۔

سلمان میرے بیٹے تم اس کی یہ بات مت ماننا وہ پگلی بھی نہیں جانتی کہ کتنا سخت فیصلہ کرنے جا رہی ہے۔ ابھی سلمان نے جواب دیا بھی نہیں تھا کہ درشہوار کو پھر صنوبر کی آواز سنائی دی۔

''موت اور زندگی کا کسی کو پتا نہیں ہے لیکن جو ریت ہے اس کے مطابق ماں باپ ہمیشہ اپنے بچوں کو دنیا میں اکیلا چھوڑ جاتے ہیں۔ خدانخواستہ ایسا ہوا تو تم اپنا وعدہ نبھاؤ گے۔ اپنی بیوی اپنے بچوں اور ایسے ہر مخالف طوفان میں میرے ساتھ کھڑے رہو گے جو مجھے میرے راستے سے ہٹانے یا میری زندگی کو مشکل بنا سکتے ہیں۔ بتاؤ کیا تم ایسا کرو گے؟ نبھاؤ گے اپنا وعدہ؟''

درشہوار وہیں دیوار کے سہارے بیٹھ گئی اور اسے اپنی بیٹی کی زندگی برباد ہوتی نظر آنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر والے کے سامنے پھیلا دیئے اور دعا مانگنے لگی۔ اس سے تو اچھا ہے وہ فارس سے شادی کر لے۔ یہ کس مشکل اور لہولہان کر دینے والے راستے پر چلنا چاہتی ہے۔ ماں باپ کے دنیا سے چلے جانے کے بعد کا بندوبست بھی کرنا چاہتی ہے۔ بھائی کو قابل اعتبار نہیں جانا اس نے بلکہ اسے اپنا سیف گارڈ بنایا ہے۔ تمہاری محبت کو سلام کرتی ہوں میں صنوبر تم عورت کے نام پر ایک ایسی آبرو ہو جو محبت کو زندگی دے کر خود کی زندگی کو دان کر دینا چاہتی ہو۔ درشہوار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بیٹی میں ایسی لگن ایسی شکتی آئی کہاں سے۔ وہ وہی سے سلمان کے انکار کی متمنی تھی۔ اس کی آواز درشہوار کی سماعتوں کو زندگی بھی دے سکتی تھی اور موت بھی۔ اسی وقت آصف اس طرف آ گیا۔ اس نے کو درشہوار کو ایسے دیوار سے چہرہ رگڑ رگڑ کے روتے دیکھا تو وہ ایک دم لرز کر رہ گیا... لپک کر اس کے پاس آیا۔

''کیا بات ہے درشہوار تم اس طرح کیوں رو رہی ہو بتاؤ کیا ہوا ہے۔؟''

''اس نے بھائی کو کیوں روکا ہمیں کیوں نکالا اس کمرے سے جانتے ہو کیوں؟ آصف نے اس کی بات پر نفی میں سر ہلایا۔

''وہ جوگن بننا چاہتی ہے اور بھائی کو اپنا محافظ بنانے کا وعدہ لے رہی ہے'' درشہوار نے کہا اور آصف کو ایک زور کا جھٹکا پڑا وہ فرش پر ڈھیر ہوتا چلا گیا۔ درشہوار کی چیخ صنوبر اور سلمان کے کانوں تک بھی پہنچی۔ سلمان باہر کی طرف لپکا تو صنوبر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سلمان کی آنکھوں میں حیرت اور ہزاروں سوال تھے۔

☆......☆

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے سطر سطر زہر عشق لہو میں دوڑاتے اس ناول کی اگلی کڑی ماہ جنوری میں پڑھیے)

شرجیل کہاں ہے۔ پر اس نے تو.....'' یہ سوچ کر صنوبر کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شرجیل تم مجھے بتا کے جاتے یا جا کے بتا دیتے تو میں اس صورت میں بھی تمہارے نام پر زندگی گزار دیتی اب کیا کروں۔ تمہارے لیے فارس کو منع کرتی ہوں۔ اور تم نہ آئے تو میں ساری دنیا کے سامنے صرف تماشا ہی نہیں بنوں گی بلکہ لوگ مجھ پر ترس کھانے لگیں گے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کہا کریں گے'' دیکھو وہ رہی وہ بے چاری جسے اس کا محبوب دھوکا دے کر چلا گیا اور یہ بے وقوف اب بھی اس کا انتظار کر رہی ہے'' کیا کروں شرجیل کیا کروں... یہی ماں باپ جو آج مجھے فیصلے کا حق دے رہے ہیں چند سال بعد ہی میرے سامنے بیٹھے مجھے سمجھا رہے ہوں گے کہ مجھے اب شادی کر لینی چاہیے اس طرح ساری زندگی میں کیسے گزاروں گی۔ اس وقت میں اپنے انہی ماں کی آنکھوں میں اس پیار کو مدھم پڑتے دیکھوں گی۔ جس کی روشنی سے آج صرف میرا دل ہی نہیں یہ سارا گھر منور ہو رہا ہے۔ وہ سوچتی رہی پر کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔

''بیٹے صنوبر تمہیں رحمن کے آنے سے پہلے فیصلہ کرنا ہوگا ورنہ اس نے بحالی پر زور دیا تو ہمارے پاس اسے دینے کے لیے کوئی جواب نہیں ہوگا۔'' درشہوار اس کے پاس آئی اور محبت سے اس کے گالوں پر پھیلے ہوئے آنسوؤں کو صاف کرنے لگی۔

''میں اگر آپ دونوں سے ایک بات کہوں تو آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے!'' کچھ توقف کے بعد صنوبر نے پوچھا اپنے دونوں ماں باپ سے اور ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کی بیٹی ایسا کیا کہنے والی ہے جس کے لیے اسے ڈر ہے کہ اس کے ماں باپ مائنڈ کر سکتے ہیں۔

''تم بلا جھجک کہو میرے بچے ہم تمہاری ہر بات کو تسلیم کرنے کی کوشش کریں گے۔'' آصف نے کہا۔

''مجھے سلمان کے ساتھ کچھ دیر اکیلا چھوڑ دیں۔ میں اپنے بھائی سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔''

سلمان چونکا اور آصف اور درشہوار کے چہروں پر حیرانی تھی کہ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جو ان کی بیٹی اپنے ماں باپ سے نہیں اپنے بھائی سے کرنا چاہتی ہے۔ آصف نے بنا کچھ کہے خاموشی سے اپنے قدم لاؤنج کے داخلی راستے کی طرف بڑھا دیے۔ درشہوار نے جاتے جاتے اپنے بیٹے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔

''خدا میرے بیٹے کو ہر امتحان میں پاس ہونے کی طاقت دے'' ماں کی یہ بات سن کر سلمان کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں کہ صنوبر نے اسے کسی بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے اس بچے تو ابھی جینے کا قرینہ سیکھا تھا اسے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ وہ کیا کرے گا اگر صنوبر نے اس کے سامنے کوئی مشکل پہیلی رکھ دی جس کا اسے جواب نہ آتا ہو۔ دونوں چلے گئے اور وہ بلند دھڑکنوں کے ساتھ صنوبر کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت اس کا دل اتنے زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ اس کے قریب کھڑا کوئی بھی انسان اس کی دھڑکنوں کی آواز سن سکتا تھا۔ صنوبر نے اسے بیٹھ جانے کو کہا وہ کسی روبوٹ کی طرح کسی حکم کے بندے کی طرح میکانکی انداز سے بیٹھ گیا۔

''تم کیا چاہتے ہو سلمان میں فارس سے شادی کروں یا انکار کر دوں؟'' سوال سن کر سلمان کو یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی وقت پیش نہیں آئی کہ یہ صنوبر کا آخری سوال نہیں ہے۔

''تم اسے پسند نہیں کرتیں تو جب پاپا اور ماما تمہیں انکار کا حق دے رہے ہیں تو تم کیوں ایسے بندے سے شادی کرنے پر خود کو مجبور کر رہی ہو۔'' سلمان نے جیسے پہلا مرحلہ سر کر لیا تھا۔

''میں تمہارا جواب پوچھ رہی ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے یہ نہیں، یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو میں انکار کروں یا ہاں کہوں؟''

سلمان کے ماتھے کی سلوٹیں گہری ہو گئیں اس کی آنکھوں میں ایک انجانی پریشانی نظر آنے لگی وہ سوچنے لگا۔ میں تو سمجھ رہا تھا میں اس کے سوالوں کا جواب دے پاؤں گا۔ لیکن اس کا تو پہلا ہی سوال اتنا مشکل ہے۔ اب کیا کہوں... وہ سوچ میں پڑ گیا اور کچھ دیر بعد جب صنوبر نے اس پھر سے متوجہ کیا تو وہ بولا۔ ''منع کر دو''

''منع کر دوں۔ فارس سے شادی کرنے سے منع کر دوں۔ یہی کہا ہے نا تم نے۔'' سلمان نے گردن ہلائی جیسے ڈرتے ڈرتے وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ جواب غلط تو نہیں ہے۔

''گردن مت ہلاؤ سلمان زور سے با آواز بلند کہو کہ تم کیا کہتے ہو؟'' صنوبر کا یہ روپ اس کے لیے بہت ہی اجنبی تھا

میرے بچو!

اللہ تم سب کو اچھا رکھے۔ میں پچھلے 15 سالوں سے کچھ ادویات پر کام کر رہا تھا جو الحمدللہ اب تیار ہیں ان میں ایک دوا دانتوں کی ہے جو ہر قسم کی دانتوں کی تکلیف میں سود مند ہے اور دوسری دوا ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کی ہے۔ زخم چاہے چوٹ کی وجہ سے ہو یا آپریشن کا زخم یا پھر چھالا یا پیپ سب کو ایک ہفتے میں خشک کرتی ہے اس کے علاوہ چھوٹے بچے اکثر بستر سے گر جاتے ہیں یا کھیل کود میں سر پر چوٹ لگتی ہے، ایسے میں اس دوا کے چند قطرے سوجن نہیں ہونے دیتے اور بچہ ہو یا بڑا سر پر لگنے والی چوٹ کے اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ ادویات 1 سال سے لے کر 100 سال تک کے انسان کو استعمال کروائی جاسکتی ہیں۔ میں نے یہ سب بتانا اس لیے ضروری سمجھا کہ بعض اوقات غلط علاج کی وجہ سے معمولی تکلیف بہت بڑی ہو جاتی ہے اور وقت اور پیسے کے زیاں کے ساتھ ساتھ مریض کو آرام بھی نہیں آتا ایسے میں انسان ہر در کھٹکھٹاتا ہے۔ تم لوگوں کو پتہ ہوگا تو سچی کہانیاں کے دفتر سے یہ ادویات منگوا سکو گے۔

میں کچھ بچوں کا نام لے کر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جو میرا مان رکھتے ہیں اور بہت پابندی سے کچھ کنبوں کی ذمہ داری اٹھا رہے ہیں۔ بنی ارم کراچی، بنی افشاں لندن، بیٹا محسن شمیم پنڈی، بیٹا فہید، بنی فرداہ اور سدرہ لاہور، بیٹا علی ڈنمارک، بیٹا کامران USA، بنی طاہرہ، زینب، فرزانہ کراچی، تم سب اپنے نام صیغہ راز میں رکھنا چاہتے تھے مگر یہ میرا فرض ہے کہ میں تم سب کا شکریہ ادا کروں۔ یقیناً تم لوگوں نے وہ کام کیا ہے جس کے بعد اللہ بندے کو فردوس عطا فرماتا ہے۔ ہمیشہ خوش اور آباد رہو، نماز کی پابندی اور ترجمہ کے ساتھ قرآن کی تلاوت اور خلق خدا کی خدمت جاری رکھو۔ روزِ محشر اپنے چہرے چاند کی طرح روشن پاؤ گے، آمین۔

☐ مریم بنت عائشہ۔ کراچی

○ بابا جی! میرے بچے آپس میں بہت لڑتے ہیں۔ باہر سے بھی شکایت آتی ہے خاص کر لڑکیوں کی جن میں میری بڑی بنی عتیقہ بنت مریم اور عفیرہ بنت مریم ہیں۔ اُن کو دیکھ کر اب بھائی بھی بگڑ رہے ہیں۔ کوئی بات نہیں سنتیں اپنی ہی چلاتی ہیں۔ ابھی چھوٹی ہیں بڑی ہوں گی تو کیا ہوگا...... ڈر لگتا ہے۔ مجھے بھی بہت پریشان کرتی ہیں کام کرواتی ہیں مگر جب تک میں چلاؤں ناں میرا اپنا بھی قصور ہے کہ میں اُن کے ساتھ صحیح نہیں پیش آتی۔ کچھ گھر کے مسائل تھے۔ بچوں پر توجہ نہیں دے سکتی تھی۔ کبھی ڈانٹ دوں تو ساس سسر اُن کے سامنے ہی مجھے ڈانٹ دیتے ہیں۔ جس سے بچوں کو شہ مل گئی اب بچے بگڑ گئے تو سارا الزام مجھ پر کہ ماں صحیح ماحول میں پرورش نہیں کر رہی۔ میری چچا زاد بہن طاہرہ بنت سکینہ کی بیٹی ادیبہ بنت طاہرہ وہ ہر جگہ میری بچیوں کو ڈی گریڈ کرتی رہتی ہے۔ وہ میری بچیوں سے دور رہے۔ میں چاہتی ہوں میری بیٹیاں گھر میں ہی رہیں۔ باہر کھیلنے نہ جائیں۔ یہاں کا ماحول خراب ہے۔ عورتیں اپنی بچیوں کو چھوڑ دوسروں کی بچیوں کی باتیں کرتی ہیں۔ میری بیٹیاں بھی اسی ماحول کا حصہ نہ بنیں۔ برابر میں اوپر

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: C II-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 021-35893121

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کُن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

II 88-C خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



درمیان میں کچھ وقت کے لیے چھوڑ دو پھر دوبارہ شروع کردو یہ دانتوں کو زندگی کی آخری سانس تک اپنی جگہ مضبوط رکھے گی۔ تم دوا دفتر سے منگوا لینا۔

□ رحمت بی بی۔ بلوچستان۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میں نے آپ کا بہت نام سنا ہے۔ بابا جی! جس طرح آپ انسانیت کی خدمت کرتے ہیں' اس کا اجر اللہ آپ کو دونوں جہاں میں دے۔ بابا جی! ہم بھی آج ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ وہ مسئلہ میرے کزن کا ہے۔ بابا جی! کچھ عرصے پہلے اُس نے کاروبار شروع کیا جو بہت اچھا چل رہا تھا مگر اَب بالکل نہیں چل رہا۔ وہ بہت پریشان ہے کیونکہ اُس کا سارا سرمایہ اس کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ بابا جی! آپ ہمیں ایسا تعویذ دیں جس کے کرنے سے کاروبار بہت ترقی کرے۔ ہم آپ کو تمام عمر دُعائیں دیں گے۔ آپ نے اس سلسلے میں ایک بہن کوثر کو بھی تعویذ دیا تھا۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی' شکریہ۔ اللہ حافظ! اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف فرمائیں۔

☆ بیٹی رحمت ......! تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔ بس خیال رہے' نماز قضا نہ ہو۔ حاجت پوری ہونے پر کچھ رقم ضرور خیرات کر دینا۔

□ صفیہ۔ بنوں۔

○ بابا جان! میرا مسئلہ حل کردیں' میں آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔ میری شادی کو 8 سال ہو چکے ہیں اور اَب تک اولاد سے محروم ہوں۔ لوگوں کے رویے اَب مجھے بہت دکھ دیتے ہیں۔ آپ نے میری جیٹھانی کو تعویذ دیا تھا' اُن کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اَب پھر انہوں نے آپ سے تعویذ منگوایا۔ بابا جی! پلیز' مجھے بھی تعویذ تیار کردیں تاکہ میری بھی اولاد ہو سکے۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔ مجھے طریقہ کار سب پتا ہے مگر میری جیٹھانی نے کہا' آپ ہر ایک کو تعویذ نہیں دیتے لٰہذا پہلے اجازت لے لو۔ بابا جی! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں' میری بھی مشکل حل کردیں تاکہ میں اپنے سسرال میں خوش وخرم رہ سکوں۔

☆ بیٹی صفیہ! اللہ سے مدد مانگو' وہ ضرور تمہاری دُعا قبول فرمائے گا۔ میں تعویذ تیار کردوں گا بس خیال رکھنا' تعویذ استعمال کرنے کا بھی خاص طریقہ ہے۔ اس پر عمل لازمی ہے۔ انشاء اللہ' کلامِ الٰہی کی برکت سے ضرور کرم ہوگا۔ خط میں مکمل کوائف ارسال کرنا۔

□ شیریں انجم۔ کراچی

☆ بیٹی شیریں! تمہارا خط شائع کرنا مناسب نہیں۔ میں بارہا یہ بات کہتا ہوں کہ علاج درست سمت میں ہونا بہت ضروری ہے بلاوجہ گولیاں کھانا انسان کی صحت کو برباد کر دیتا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ مجھ سے تعویذ منگوالو معاملہ اب گمبھیر ہو چکا ہے۔ تعویذ منگوانے کا طریقہ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کرلو۔

□ شہلا احمد۔ راولپنڈی۔

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! میری بہن جس کی عمر 40 سال ہے' وہ شادی شدہ ہے' کچھ عرصے سے اُس کی کمر' ہاتھ کی انگلیاں' پیر کی انگلیاں ان سب حصوں میں بہت سخت درد رہتا ہے۔ رات میں سو کر جب صبح اٹھتی ہے تو بستر سے اٹھا نہیں جاتا۔ اُس کا وزن زیادہ ہے اور روز بہ روز بڑھتا جا رہا ہے۔ پیٹ اور کولہے کا حصہ بہت زیادہ موٹا ہے۔ میری بہن بے چاری بہت پریشان ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو لکھ کر بھیجوں' آپ کی دوا سے ضرور فائدہ ہوگا۔ اُس کے جسم میں چربی بہت ہے۔ میری بہن کی ساس بھی بہت زیادہ بیمار ہیں' اپنے لیے تو وہ مر چکی ہیں' لوگوں کے لیے زندہ ہیں۔ میری بہن اپنی ساس کی بہت دیکھ بھال کرتی ہے لیکن میری بہن اپنی جسمانی بیماری کی وجہ سے بہت مشکل محسوس کر رہی ہے۔ بابا جی! آپ میری بہن کے لیے دُعا کریں اور دوا بھی ضرور بتائیں تاکہ میری بہن کو شفا ہو جائے۔

☆ بیٹی شہلا! اللہ تمہیں مکمل صحت عطا فرمائے۔ جسم میں درد وزن بڑھنے کی وجہ سے ہے۔ مناسب ہوگا مجھ سے وزن کم کرنے کی دوا منگوالو۔ انشاء اللہ' مکمل افاقہ ہوگا۔ آئندہ خط جوابی لفافے کے ہمراہ لکھنا تاکہ تفصیل بتائی جاسکے۔

□ صنم۔ کھاریاں

○ بابا جی! آداب! بابا جی! میں اپنے دیور کی

میری چچیاں رہتی ہیں آس پاس کزنز بھی ہیں۔ میں چاہتی ہوں میرے گھر کوئی زیادہ نہ آئے نہ میں کسی کے گھر جاؤں کیونکہ جہاں دو خواتین ہوتی ہیں وہاں غیبت ضرور ہوتی ہے۔ جن سے نیکیاں ضائع اور روزگار تنگ ہو جاتا ہے۔ اس مسئلے پر بھی میری مدد کریں اور کوئی آسان وظیفہ بتائیں تاکہ میرا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کے بہت سارے وظائف پڑھے اور مقاصد بھی حاصل ہوئے ہیں دوسروں کو بھی بتاتی ہوں اُن لوگوں کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم سب کو اپنی امان میں رکھے اور مجھے غیبت جیسی گندی بیماری سے محفوظ رکھے۔

☆ بیٹی مریم! حالات چاہے جیسے بھی ہوں اولاد پر بھرپور توجہ ماں کا فرض ہے۔ تم اللہ سے مدد مانگو کہ وہ تمہیں توفیق عطا فرمائے کہ تم اپنی اولاد کی بہترین تربیت کر سکو۔ بیٹی نماز فجر اور عشاء کے بعد 1-1 بار سورۃ رحمٰن پڑھو اور دعا کرو۔ بچوں پر الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر دم کرتی رہا کرو اللہ انہیں محفوظ رکھے گا۔

□ پروین۔ جیکب آباد

○ بابا جی! میں بہت بدنصیب عورت ہوں۔ پہلی شادی بھی اپنی مرضی سے کی اور ایک بچے کے بعد طلاق ہوگئی۔ گھر میں بھائی بھاوج کا رویہ بہت خراب تھا اس لیے میں نے دوبارہ اپنی مرضی سے دوسری شادی کرلی۔ میرے دوسرے شوہر کے پہلے سے دو بچے تھے اور اُن کی پہلی بیوی اُن کی کزن بھی تھیں۔ شروع میں تو سب ٹھیک رہا لیکن اب اُن کا رویہ مجھ سے بہت خراب ہو رہا ہے۔ میرے بیٹے کو تو بالکل بھی برداشت نہیں کرتے۔ میرے دو بچے اُن سے بھی ہیں' اُن کو بھی وہ پیار نہیں ملتا جو اُن کا حق ہے۔ ساری توجہ پہلی اولاد کی طرف ہے۔ میں کچھ بولتی ہوں تو لڑنے مرنے لگتے ہیں' بہت برا بھلا کہتے ہیں۔ بابا جی! میں بہت غریب گھر سے ہوں' پلٹ کر واپس بھی نہیں جا سکتی۔ اب تو تین بچوں کا ساتھ ہے۔ بابا جی! میں چاہتی ہوں' میرے شوہر ہم لوگوں سے محبت کریں اور کم از کم ایک گھر میرے نام کر دیں۔ وہ بہت پیسے والے ہیں' مجھے کم از کم ایک آسرا ہی ہو جائے۔

بابا جی! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں' میرا مسئلہ بھی حل کر دیں' میں اور میرے بچے بھی آپ کو دعائیں دیں گے۔

☆ بیٹی پروین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بعض اوقات انسان ایک کے بعد ایک غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ بہر حال جو ہوا' سو ہوا' اب تم نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ خیال رہے' جہاں جہاں لفظ ''یٰسین'' آئے' وہاں رُک کر 7 بار سورۃ فاتحہ پڑھو پھر دُعا کرو۔ معاملات میں خاموشی رکھو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔ مجھے 41 دن بعد مطلع کرو۔

□ عظمیٰ کریم۔ کراچی

○ میرے اچھے بابا جان اللہ آپ کو ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ میں جس تکلیف سے گزر رہی تھی وہ میں کسی کو بتا نہیں سکتی مگر آپ کی وجہ سے میری زندگی ہی بدل گئی ہے۔ تین ماہ قبل آپ سے دانتوں کی دوا لی تھی۔ میرے دانتوں سے خون اور پیپ رس رہی تھی ڈاکٹروں پر پیسہ خرچ کر کے گھر کا بجٹ مکمل طور پر ہلا ہوا تھا آپ کی دوا استعمال کرنے کے پانچویں دن خون آنا بند ہو گیا پھر پیپ اور سوجن سب غائب اور اب میں بالکل ٹھیک ہوں بلکہ مجھے لگتا ہے کہ جن دانتوں میں خلا تھا اور کھانے پینے کی چیزیں تکلیف دیتی تھیں وہ بھی ٹھیک ہو گیا ہے۔ بابا جان میں آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں اتنے معمولی ہدیہ والی دوا ایسا کرشمہ کر سکتی ہے مجھے یقین نہیں آتا۔ اب میں چاہتی ہوں کہ مستقل یہ دوا استعمال کروں آپ مجھے ہر ماہ 5 بوتلیں تیار کر دیں۔ میں دفتر سچی کہانیاں سے منگوا لوں گی۔

☆ بیٹی عظمیٰ! شفا تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے ہاں یہ درست ہے کہ دانتوں کی یہ دوا بہت فائدہ مند ہے ہر قسم کی دانتوں کی تکلیف کے لیے اور ہر عمر کے افراد کے لیے بہترین ہے۔ میں پچھلے 15 برس سے السر اور زخموں کی دوا پر کام کر رہا تھا الحمد للہ دونوں تیار ہو گئیں۔ میری بھی خواہش تھی کہ اپنی ذات سے زیادہ سے زیادہ خلق کو فائدہ پہنچا سکوں۔ تو اللہ نے میری دعا قبول کی۔ تم اب دانتوں کا بہت خیال رکھنا اور دوا استعمال کرتی رہو

نجات دے تو شکرانے کے طور پر اُس کی راہ میں ضرور کچھ نہ کچھ نکالنا چاہیے۔

□ راشدہ قمر۔ گجرات

○ بابا جی! میں بہت پریشان عورت ہوں۔ والدین حیات نہیں' بھائی بہن تو آج کل سگے بھی سگے نہیں۔ بزرگوار میرا شوہر بہت پیسے والا آدمی ہے۔ مگر عیاشی میں پڑا ہوا ہے۔ میری 4 بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ سب ابھی چھوٹے ہیں۔ یہ ان کے سامنے شراب بھی پیتا ہے اور مجھے مارتا بھی ہے۔ ماں باپ ہوتے تو شاید اُن کے پاس چلی جاتی میرے سگے بھائی میرے شوہر سے پیسے لیتے رہتے ہیں اسی لیے اُس کی طرف داری کرتے ہیں۔ آپ اللہ والے ہیں میں پڑھتی ہوں لوگوں کے مسئلے حل ہوتے ہیں میرا بھی مسئلہ حل کر دیں میرا شوہر نیک ہو جائے اور مجھ پر ہاتھ اٹھانا چھوڑ دے۔ میں وظیفہ نہیں کر سکتی بچے چھوٹے ہیں تعویذ دے دیں آسان ہوگا۔

☆ بیٹی راشدہ! اللہ تمہارے شوہر کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ صبر' ہمت اور استقامت سے حالات کا مقابلہ کرو۔ بیوی پر ہاتھ اٹھانا نہایت بری حرکت ہے۔ میں تمہارے لیے دو عدد تعویذ تیار کروں گا طریقہ استعمال بھی تحریر کروں گا۔ بس تم معاملات میں خاموشی رکھنا اور بنی مسائل تو رب العزت کی ذات حل کرتی ہے میں تو بہت ادنیٰ سا انسان ہوں بس جو لوگ مستقل مزاجی سے رابطے میں رہتے ہیں اُن کی زندگیوں اور گھروں میں برکت رہتی ہے۔ تم بھی پختہ ایمان کے ساتھ دعائیں کیا کرو ضرور کرم ہوگا۔

□ عروبہ خان۔ کراچی

☆ بنی عروبہ! نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تم صبح و شام نیم گرم پانی میں دو چائے کے چمچے اسپغول گھول کر پی لیا کرو۔ امتحانی کمرے میں داخل ہوتے وقت نصر من اللہ فتح قریب پڑھا کرو۔ بسم اللہ پڑھ کر پرچہ شروع کروگی تو کبھی ناکامی نہیں ہوگی۔ امتحانوں سے فارغ ہو جاؤ تو مجھے پھر خط لکھنا میں دانتوں کا بھی علاج بتا دوں گا۔ مگر ابھی ساری توجہ پڑھائی پر رکھو۔

□ علیمہ۔ کراچی۔

○ بابا جی! السلام علیکم! میرا نام ''علیمہ'' ہے۔ میری والدہ کا نام فہمیدہ ہے اور میری عمر 18 سال ہے۔ بابا جی! دو سال ہوئے مجھے نزلے کی شکایت ہے۔ میں نے ناک کی ہڈی کا آپریشن بھی کروایا اور اب ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ الرجی ہوگئی ہے اور نزلہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ بابا جی! مہربانی فرما کر مجھے حل بتائیے' میں بہت پریشان ہوں۔ بابا جی! میں نے نزلے کی وجہ سے پڑھائی بھی چھوڑ دی ہے اور صرف قرآن پاک ابھی پڑھ رہی ہوں۔ پلیز بابا جی! مجھے دسمبر کے شمارے میں جواب دیں۔

☆ بیٹی علیمہ! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ روزانہ رات کو سونے سے قبل ایک بڑے برتن میں کھولتا ہوا پانی لو اور اُس میں خوب سارا نمک ملا کر بھاپ لو۔ یہ عمل 7-8 منٹ روز کرو۔ نہار منہ ادرک کے لمبے لمبے ٹکڑے نمک کے ساتھ توے پر بھون لو اور یہ 3-4 ٹکڑے بسم اللہ پڑھ کر کھالو۔ انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ اسرار احمد۔ جہلم۔

○ بابا جی! السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں گے۔ میرے بہت سے مسائل ہیں جو میں بیان نہیں کر سکتا لیکن ان میں دو بہت اہم مسائل ہیں جو آپ سے بیان کر رہا ہوں۔ ان کا جواب علیحدہ علیحدہ دیجیے گا۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کے فضل و کرم سے حافظ قرآن ہوں لیکن میں صحیح روانی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔ بابا جی! بات یہ ہے کہ ہمارے محلے کے چند لوگوں نے مجھے بدنام کر دیا ہے' جس کی وجہ سے میں پچھلے رمضان میں بھی قرآن پاک نہیں سنا سکا۔ اب میرا ارادہ ہے کہ اگر مجھے قرآن پاک سنانے کے لیے جگہ نہیں ملی تو میں رمضان میں چالیس دن کے لیے جماعت پر چلا جاؤں گا۔ بابا جی! آپ مجھے ایسا کوئی وظیفہ بتائیں کہ جس کے کرنے سے مجھے جگہ مل جائے اور آپ میرے لیے دُعا کریں کہ اللہ غیب سے کوئی بندوبست فرما دیں۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں' میرے باپ اور میرے چچا حج کے لیے چلے جائیں۔ پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ

شادی اپنی بہن سے کرنا چاہتی ہوں۔ استخارہ کر کے بتائیں کہ یہ رشتہ کیسا رہے گا اور اُن کی ازدواجی زندگی کیسی گزرے گی اور اُن کی شادی کا میری زندگی پر کوئی منفی اثر تو نہیں پڑے گا؟

☆ بنی صنم......! استخارہ حق میں ہے۔ تمہاری زندگی پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا۔ جب تک تم یہ نہیں سوچو گی کہ تم نے اپنی بہن پر احسان کیا ہے اور اُس کو اُس کا بدلہ دینا چاہیے۔ کسی سے کوئی امید مت رکھنا۔ سب خیر رہے گی۔

□ دُریہ علی۔لاہور

○ باباجی میں نے دو ماہ قبل آپ سے تعویذ منگوایا تھا اپنے بھائی کی شادی کے لیے، بھائی شادی پر تیار ہو گئے ہیں میں آپ سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ اب تعویذ کا کیا کرنا ہے۔ اور باباجی امی اور خالہ آپ کو کچھ رقم ارسال کرنا چاہتی ہیں۔ سچی کہانیاں کے نام منی آرڈر کر دیں یا بینک ڈرافٹ بھیجیں رہنمائی فرمائیں۔

☆ بیٹی دُریہ! اللہ تمہیں خوش رکھے تعویذ ابھی جہاں رکھا ہے رہنے دو رشتہ طے ہونے پر تلف کر دینا۔ والدہ سے کہو درود جاری رکھیں اور اللہ کا شکر ادا کریں کہ بیٹے نے ضد چھوڑ دی۔ رقم سچی کہانیاں کے نام منی آرڈر کر دو مجھے آسانی سے مل جاتی ہے۔

□ ارجمند۔گھوٹکی۔

○ پیارے باباجی! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی دے۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پتے میں پتھری ہے۔ ہومیوپیتھک علاج کروا رہی ہوں۔ میں آپریشن نہیں کروانا چاہتی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ آپ کوئی ایسا وِرد یا وظیفہ دیں جس کو پڑھنے سے بغیر آپریشن کے پتھری ریزہ ریزہ ہو کر پتے سے نکل جائے۔ وظیفہ وغیرہ کتنے دن پڑھنا ہے اور کتنی مرتبہ سارا تفصیل سے لکھ دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ باباجی! میری بڑی بہن کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ وہ بھی آپریشن کروانا نہیں چاہتی۔ اُس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتا دیں کہ بغیر آپریشن کے پتے سے پتھری نکل جائے۔ ساری عمر آپ کو دُعائیں دیں گے

☆ بنی ارجمند! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ دن میں جس وقت سہولت ہو ایک ہزار بار یاشافی پڑھ کر پانی کی بڑی بوتل پر دم کر دو اور پھر یہ پانی دن بھر پیتی رہو۔ دن بھر میں تمہارے کم از کم دس گلاس پانی کے ہونا چاہئیں۔ یہ عمل 14 دن کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ بہن سے کہو وہ بھی یہی عمل کرے۔

□ ثمینہ خان۔کراچی

☆ بنی ثمینہ! تمہارا مسئلہ حل نہیں ہوگا مجھے اب محسوس ہوتا ہے شدید رکاوٹیں ہیں اسی لیے تعویذ کے لیے کہا تھا جو شخص تعویذ کے ہدیے کے لیے تیار نہیں وہ زندگی بھر تمہاری ذمہ داری کیسے سنبھالے گا یہ بات تمہیں خود سوچنی چاہیے۔

□ شاہد اللہ۔اٹک

○ باباصاحب! آپ کو بے حساب لوگ خط لکھتے ہوں گے مجھے آپ کہاں یاد رکھیں گے اس لیے آپ کو یاد دلا دوں کچھ عرصہ قبل میرا والد شدید بیمار ہو گیا تھا وہ ادھر کراچی میں مزدوری کرتا تھا۔ چھت سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسپتال لے کر گئے ٹیسٹ کروائے ڈاکٹر نے کہا دماغ میں سوجن ہے آہستہ آہستہ ٹھیک ہوگی۔ مہنگی دوائیں بار بار دی تھی۔ کبھی والد صاحب ٹھیک کبھی بیٹھے بیٹھے بے ہوش پھر دوست نے آپ کا بتایا آپ نے مجھے دوا بھجوائی تھی باباصاحب اللہ کا بڑا احسان ہے کہ دوا کے استعمال کے بعد سے والد صاحب ٹھیک ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر کی دوا چھوڑ دی کیونکہ بہت مہنگی تھی اور فائدہ بھی نہیں تھا۔ والد صاحب اب بالکل ٹھیک ہے کیا دوا کا استعمال جاری رکھیں یا روک دیں؟

☆ بیٹے شاہد! اللہ کا شکر ادا کرو کہ اللہ نے تمہارے والد کو صحت کلی عطا فرمائی یہ درست ہے کہ والد کے سر کے اندرونی حصے پر سوجن تھی میں نے جو دوا دی تھی وہ اندرونی چوٹوں اور بیرونی زخموں کو دونوں میں ٹھیک کرتی ہے اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے مجھے اپنی کوششوں میں کامیاب کیا۔ تم اب دوا کا استعمال ترک کر دو اور کچھ رقم خیرات کر دو۔ جب اللہ غم اور دکھ سے

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرایئے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

ہے۔ اُن کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتا دیں۔ آپ استخارہ کر کے بتائیں کہ میرے لیے جگہ کا بندوبست ہو جائے گا کہ نہیں؟ میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

☆ بیٹے اسرار! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ روزانہ سورۃ یٰسین کی باآوازِ بلند تلاوت کیا کرو۔ والد سے کہو اللہ سے دُعا کیا کریں کہ وہ اپنے گھر ضرور بلائے۔

□ فاطمہ۔ میرے والا

☆ بیٹی فاطمہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تمہارے شوہر درست کہتے ہیں مگر بیٹی! والدین بہت قیمتی سرمایہ ہیں۔ تم اُن سے ملنے ضرور جایا کرو اور کھڑے کھڑے جایا کرو۔ شوہر کو ساتھ مت لے جاؤ۔ بیٹی! والدین کی خبر گیری کرنا تمہارا فرض ہے۔ بھائی یا بھاوج کے رویے کی وجہ سے جانا ترک مت کرو تاکہ زندگی میں تمہیں ہمیشہ اطمینانِ قلب رہے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 71-71 بار سورۃ فاتحہ پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ثمن شیرازی۔ بہاولپور

○ بابا جان میرا بیٹا چھ ماہ قبل آپریشن سے ہوا ہے۔ ویسے تو سب ٹھیک ہے مگر میرا زخم بہت دکھتا ہے بچے کو بہت مشکل سے دودھ پلا پاتی ہوں۔ ڈاکٹر کو کئی بار دکھایا کہتی ہے سب ٹھیک ہے۔ بابا جان پلیز کوئی دوا دے دیں جس سے میں جلدی سے نارمل ہو جاؤں۔

☆ بیٹی ثمن! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے تمہارا زخم اوپر سے ٹھیک ہو گیا ہو گا مگر اندر سے تو ابھی کچا ہی ہو گا۔ مجھے تمہاری تکلیف کا اندازہ ہے جلد از جلد مجھ سے دوا منگوا لو 10 دن میں انشاء اللہ اندر سے خشک ہو جائے گا۔ معلومات کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر سکتی ہو۔

□ فہد مبارک۔ U.K

○ بابا جی میں پاکستان سے آپ سے رابطے میں ہوں۔ آپ ہی کی بدولت یہاں لندن پہنچا ہوں۔ آپ نے درست کہا تھا کہ زندگی یہاں بہت مشکل ہے ابھی تو بہن کے گھر پر ہوں مگر جلد ہی اپنا بندوبست کرنا ہو گا۔ جو بات آپ نے کہی تھی وہی میرے والد کہتے رہے کہ اپنے ملک میں رہ کر محنت کرو اس وقت تو بس دھن سوار تھی چند مہینوں میں ہی اصلیت پتہ چل گئی اماں کہہ رہی تھیں کہ میں آپ سے پوچھ لوں کہ تعویذ پہنے رہوں یا اُتار دوں میں تو چاہتا ہوں کہ پہنے رہوں مگر آپ جو کہیں گے وہ کروں گا۔ میری کامیابی کے لیے بھی دعا کریں اور اگر دوسرا تعویذ ضروری ہو تو بتا دیں۔ آپ کا بیٹا فہد دعاؤں میں یاد رکھیں۔

☆ بیٹے فہد! جو چاہتے تھے وہ پا لیا اب یہ مت سوچو کہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح اب فیصلے کو اپنے حق میں بہترین ثابت کرو۔ مجھ سمیت سب کے اندازے غلط ثابت کرو گے تو خوش رہو گے۔ بیٹے زندگی کہیں بھی سہل نہیں ہاں پردیس میں ذرا زیادہ سختی جھیلنی پڑتی ہے مگر محنت کرنے والے ہی سرخرو ہوتے ہیں۔ تعویذ اب اُتار دو جس مقصد کے لیے دیا تھا وہ پورا ہوا۔ دوسرا تعویذ تیار کر دوں گا مگر ماہ صفر کے بعد منگوانا۔ انشاء اللہ سب خیر ہوگی۔

□ ناہید خانم۔ حیدرآباد

○ بابا جی! آداب! میں کافی عرصے بعد آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہو رہی ہوں۔ بابا جی! اَب سے چار سال پہلے میرے شوہر نے قرض لے کر پلاسٹک مولڈنگ کی مشین خریدی تھی ایک سال تک تو کاروبار چلا مگر اُس کے بعد سے مشین بالکل بند پڑی ہے۔ گھر میں بہت پریشانی ہے۔ آپ کے تعویذ کی برکت سے میرے شوہر کو بینک سے لون ملا اور انہوں نے جگہ کرائے پر لے کر مشین سیٹ کر لی مگر ابھی تک کام شروع نہیں ہوا۔ کوئی نہ کوئی رکاوٹ آ جاتی ہے۔ میں بہت پریشانی میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ شوہر الگ پریشان ہیں۔ گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ برائے مہربانی آپ استخارہ نکال کر بتائیں کہ شوہر کا یہ کام ٹھیک ہے اور کسی نے کچھ کروایا تو نہیں ہے؟ کیونکہ ہمارے گھر میں بہت سکون اور محبت تھی مگر دو تین سال سے پتا نہیں کیا ہو گیا؟ برائے مہربانی دسمبر کے شمارے میں مجھے جواب دے دیں کہ گھر اور کاروبار میں برکت ہو اور قرض جیسی لعنت سے نجات مل جائے۔ میرے شوہر بہت پریشان ہیں۔ بچے الگ خاموش رہتے ہیں۔ میرے شوہر کے کاروبار میں برکت کے لیے

اپنے شوہر کو بلوا لو اور اپنے گھر چلی جاؤ۔ ساتھ رہو گی‘ خیال کرو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا ورنہ شوہر کو تمہارے بغیر رہنے کی عادت ہو جائے گی۔ بیٹی......! سمجھداری سے چلو‘ گھر بنانا بہت مشکل ہے اور ٹوٹنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔

☐ علی شیر۔ سکھر

○ بابا جی! میں اکثر آپ سے رابطے میں رہتا ہوں۔ مسئلہ وہی ہے میری بیوی کی نافرمانی کا۔ اب تو دو بچے بھی ہو چکے ہیں مگر وہ کسی طور بھی نباہ کرنے کو تیار نہیں۔ آپ مجھے جیسے سمجھاتے رہے‘ میں ویسے ہی چلتا رہا‘ ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی مگر بے فائدہ۔ وہ اب بھی اپنی ضد پر قائم ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا اور بچے بھی تم ہی رکھو۔ بابا جی! اب بتائیں‘ اِن حالات میں‘ میں کیا کروں؟ گھر والوں کے سامنے بہت شرمندگی ہوتی ہے اور اب تو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ جن بچوں کی خاطر یہ سب برداشت کر رہا ہوں‘ وہی اِن حالات میں بہت سہمے ہوئے رہتے ہیں۔ اُن کے چہرے پیلے ہیں اور بچوں والی کوئی شرارت اُن میں نہیں۔ بابا جی! میں نے ہمیشہ آپ سے مدد چاہی‘ آپ نے جیسے کہا‘ ویسے ہی کیا‘ اب بتایئے کیا کروں کہ اب تو میرے اعصاب بھی جواب دے رہے ہیں۔

☆ بیٹے.....! تم نے اپنی جانب سے مکمل کوشش کر لی‘ اب مناسب یہی ہے کہ اپنی بیوی کو فارغ کر دو۔ زندگی ایک بار ہی ملتی ہے‘ اِس کو تباہ مت کرو‘ پُرسکون ذہن کے ساتھ بچوں کی تربیت کرو۔ دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں جو کسی کی اولاد کو اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتے ہیں۔ تم نے ہر طرح سمجھا کر دیکھ لیا‘ نرمی سے بھی اور سختی سے بھی لہٰذا اب تم پر کوئی بوجھ نہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ دو لوگ اکثر ساتھ نہیں چل پاتے تو عزت سے الگ ہو جانا ہی بہتر ہے۔ اُس کا حق مہر ادا کر دو۔ جو زیور اُس کو دے چکے ہو‘ واپس مت لو۔ عزت کے ساتھ معاملے کو نمٹا دو‘ بس اب یہی بہتر ہے۔ یَا قَھَّارُ کا بہت ورد کیا کرو۔ اللہ ہر اپنا کرم ضرور فرمائے گا۔

خصوصی دُعا کروائیں۔

☆ بیٹی ناہید! اللہ تمہارے مالی مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی سورۃ الواقعہ روز نمازِ عشاء کے بعد پڑھ کر حاجت طلب کرو۔ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کیا کرو۔ اللہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☐ ص م۔ نارووے۔

☆ بیٹی! میں تمہارے ہر خط کا جواب بہت پابندی سے دے رہا ہوں مگر جانتا ہوں کہ ہمارے ہاں ڈاک کے انظام کی صورتِ حال کیا ہے۔ بہرحال دل میں کسی قسم کا وہم بھی مت لانا۔ تم تو میری بہت اچھی بیٹی ہو۔ فون کرکے خط کی بابت دریافت کرلیا کرو۔ تم سے کوئی بھی ناراض نہیں ہوسکتا۔ کبھی کبھی فون میں بھی مسئلہ ہوجاتا ہے۔ اصل میں سارا مسئلہ فاصلوں کا ہے۔ تم محبت کرنے والی ہو لہٰذا سب تم سے محبت کرتے ہیں۔ بے فکر ہوکر فون کرلیا کرو۔ خوش رہو! آباد رہو!

☐ سرفراز خان۔ میرپور خاص

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ جیسے اچھے لوگوں کا سایہ اللہ پاک ہمارے سر پر بہت دیر تک رکھے۔ بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پڑھائی میں بہت کمزور ہوں۔ مجھے کوئی ایسا تعویذ دیں کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکوں۔ پیارے بابا! میرے لیے دُعا کرنا۔

☆ بیٹے سرفراز......! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح رَبِّ زِدنِی علماً کی پڑھو اور دُعا کرو۔ نہار منہ چھ سات بادام ضرور کھایا کرو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔

☐ علی مہر۔ سیہون

○ بابا جی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میرا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے وہ یہ کہ میری بس ایک بیٹی کے سوا کوئی اولاد نہیں۔ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں اور یہ خط میں کسی دوسرے سے لکھوا رہا ہوں جب سنا کہ آپ ''سچی کہانیاں'' میں لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں تو سوچا میں بھی اپنا مسئلہ آپ کو بتادوں۔ میری شادی کو بہت عرصہ ہوچکا ہے۔ آپ ہم پر احسان کرکے تعویذ دیں کہ بیٹا ہوجائے اور ہم کو یہ بھی بتائیں کہ آپ سے تعویذ کیسے حاصل کریں؟ ہم کو تو آپ کا ایڈریس بھی معلوم نہیں۔ بس آپ اپنے کرم سے ہمیں کوئی آسان وظیفہ بتائیں اور ایک تعویذ بھی دیں کہ ہمارا مسئلہ حل ہوجائے بس آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں آپ کو ہمیشہ دُعائیں دیتا رہوں گا۔

☆ بیٹے مہر......! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تم مجھے جوابی لفافے پر واضح پتا لکھ کر خط ارسال کردو تاکہ میں تمہیں تعویذ لینے کا طریقہ بتایا جاسکے۔ خط میں اپنا نام مع والدہ اور بیوی کا بھی مکمل نام لکھو۔

☐ عرفانہ۔ ننڈو آدم۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! سدا خوش رہیں! میرا مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً ایک سال پہلے میری شادی ہوئی تھی لیکن شوہر پتا نہیں کس مزاج کا ہے کہ میں اُسے سمجھ نہیں سکی۔ میں تو اُس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہوں اور یہ مجھ میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتا نہ ہی خود سے کوئی بات کرتا ہے۔ میں کروں تو جواب دے گا ورنہ نہیں۔ جیب خرچ کے نام پر ایک روپیا نہیں دیتا۔ میری ضرورت میری امی پوری کرتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں یہ بھی مجھ سے محبت کرے میری ہر بات مانے اور میرے بغیر ایک منٹ نہ رہے۔ اب میں پانچ مہینے سے اپنے میکے میں ہوں لیکن یہ فون تک نہیں کرتا۔ ملنا تو بہت دور کی بات ہے بہن طعنے دیتی ہے کہ پتا نہیں کب اپنے گھر جائے گی؟ بابا جی! میں بہت بےزار ہوں خودکشی حرام نہ ہوتی تو اَب تک کرچکی ہوتی۔ پیارے بابا جی! کوئی ایسا تعویذ دیں کہ یہ میرے بغیر رہ نہ سکے اور اپنی غلطی تسلیم کرکے مجھے لے جائے۔

☆ بیٹی عرفانہ......! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 3 تسبیح سورۃ الناس کی پڑھ کر اپنے اوپر دم کرلیا کرو۔ شوہر سے ضرورت کے تحت بات کرو مگر اپنے فرائض خوش اسلوبی سے پورے کرو۔ تمہیں خود اپنے سسرال چلے جانا چاہیے۔

احمق

ایک سیاسی لیڈر نے ایک رسالے کے ایڈیٹر سے فون پر کہا۔

''مجھے کسی نے کہا ہے کہ آپ نے اپنے رسالے میں مجھے احمق اور جاہل لکھا ہے۔''

''نہیں جناب!'' ایڈیٹر متانت سے بولا۔ ''کسی اور رسالے میں لکھا ہوگا۔ میں اپنے رسالے میں ایسی باتیں شائع نہیں کرتا جو قارئین پہلے سے جانتے ہوں۔''

مرسلہ: ڈاکٹر شہباز۔ حیدرآباد

بونس

''اچھا تو گویا تم نے محبت کی اور دھوکا کھایا۔ اس کے ساتھ ساتھ نقصان بھی اٹھایا؟''

''نہیں میں نے محبت تو کی لیکن میرے خیال میں نہ تو میں نے دھوکا کھایا اور نہ ہی میں نقصان میں رہا۔''

''وہ کیسے؟''

''رضیہ نے میری منگنی کی انگوٹھی اور میرے دیے ہوئے تحفے واپس کیے تو غلطی سے ان میں دوسروں کے دیے ہوئے کچھ تحفے بھی شامل کر دیے۔''

مرسلہ: صبیحہ امتیاز۔ سیالکوٹ

محبت

شیکسپیئر نے ''ہیلمٹ'' میں لکھا ہے کہ محبت انسان کو پاگل کر دیتی ہے۔ محبت دماغ کا ایک خلل ہے کہ اگر کوئی انسان اس خلل میں مبتلا ہو جائے تو اس کا علاج مشکل ہے۔

سارے خواب، سارے چہرے، سارے مناظر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک چہرہ آنکھوں میں منجمد ہو جاتا ہے۔ ''محبوب کا چہرہ''

مرسلہ: نائلہ غضنفر۔ کراچی

مونالیزا کی مسکراہٹ کا راز

مونالیزا دنیا کی مشہور ترین پینٹنگ ہے جس کی مسکراہٹ پر کتابوں کی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

حال ہی میں مونالیزا کے سائنسی مشاہدے کے بعد سائنسدانوں کا خیال ہے کہ مونالیزا نے جب تصویر بنوائی تھی اس وقت حال ہی میں اس کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی تھی اس لیے اس کے ہونٹوں پر کھلنے والا تبسم دراصل ایک نئی نویلی ماں کی تھکاوٹ اور سرشاری کے ملے جلے جذبات تھے۔ مونالیزا کے اسرار سے پردہ ہٹانے کے لیے کینیڈا کے ادارے نے جدید ترین آرٹ استعمال کر کے تصویر کی سخت مصوری کی تکنیک، عمر رسیدگی اور رنگوں اور وارنش کا بغور جائزہ لیا اس سے پتا چلا کہ اس نے ایک قسم کی ٹوپی بھی پہنی ہوئی ہے جسے اس زمانے میں نئی ماں بننے والی خواتین پہنا کرتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس شفاف ٹوپی کے رنگ معدوم ہوتے چلے گئے اور اب یہ نظر نہیں آتی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ مونالیزا نے ایک لڑکے کو جنم دیا تھا۔

مرسلہ: احسن شہزاد۔ لاہور

کارنامہ

ایک شخص نے چار ڈاکوؤں کو پستول دکھا کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس کی تحویل میں آنے کے بعد اس شخص نے ڈاکوؤں سے کہا۔ ''اچھا ہوا کہ آپ میں سے کسی نے پستول کے بارے میں نہیں پوچھا کہ وہ بھری ہوئی ہے یا خالی ہے؟''

ایک ڈاکو حیرت سے بولا۔ ''تو کیا پستول خالی تھی؟''

''نہیں! پستول تو بھری ہوئی تھی مگر کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ ''پستول اصلی ہے یا نقلی؟''

دوسرے ڈاکو نے تعجب سے پوچھا۔ ''تو کیا پستول نقلی تھی؟''

اس شخص نے کہا۔ ''ہاں! وہ نقلی تھی۔''

تیسرے ڈاکو نے کہا۔ ''مگر تم نے کہا تھا کہ پستول بھری ہوئی تھی۔''

''ہاں! پستول تو بھری ہوئی تھی...... مگر پانی سے۔'' اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مرسلہ: ایم افضل آزاد۔ ساہیوال

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

عدل

عباسی خلیفہ منصور دوسری شادی کا ارادہ رکھتا تھا اس کی پہلی بیوی نے اس سے کہا کہ ایک سے زیادہ شادیاں جائز نہیں ہیں۔ خلیفہ نے اس کی تسلی کے لیے امام ابوحنیفہ کو بلوایا اور ان سے دریافت کیا۔

''مسلمان کے لیے کتنی بیویاں جائز ہیں۔''

امام نے کہا۔ ''چار۔''

خلیفہ کی پہلی بیوی پردے کے پیچھے بیٹھی تھی۔ خلیفہ نے اس کی طرف دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔

''حضرت ابوحنیفہ کی رائے سن لی؟''

امام ابوحنیفہ بولے۔ ''مگر خلیفہ منصور کے لئے ایک سے زیادہ شادیاں جائز نہیں۔''

خلیفہ نے دریافت کیا۔ ''یا امام کیوں؟''

امام نے کہا۔ ''تم نے جس انداز سے اپنی بیوی کی جانب دیکھا اور جس لہجے میں گفتگو کی ہے اس سے ہم قیاس کرتے ہیں کہ تم اس کے ساتھ عدل نہیں کرتے۔ لہٰذا ہمارا یہ حکم ہے اور تم اسی پر قناعت کرو۔''

مرسلہ: فرح عالم۔ اسلام آباد

جیتنے کا گر

نپولین جب مشہور جرمن فاتح فریڈرک کے مزار پر گیا تو اس نے مزار کے سرہانے فریڈرک کی شہرہ آفاق تلوار آویزاں دیکھی۔ جب نپولین واپس جانے لگا تو اس کے افسر نے کہا جناب عالی! یہ شمشیر بھی ساتھ لیجیے اس کو حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے فاتحین نے کوشش کی اور ناکام رہے۔

نپولین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا جو سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ ''میرے پاس اپنی تلوار موجود ہے جو دوسروں کی تلوار پر نظر رکھتے ہیں انہیں ہارنا پڑتا ہے۔''

مرسلہ: ممتاز اقبال اعوان۔ لاہور

کرشماتی صفات والا انسان

کم پیک (Kim Peck) غیر معمولی دماغی صلاحیتوں کا حامل معذور شخص ہے پیدائش کے وقت اس کا سر عام بچوں کی نسبت تین گنا بڑا تھا۔ اس سے پتا چلا کہ وہ ایک ایسی بیماری کا شکار ہے جس میں وہ اپنے ہاتھ پاؤں تک نہیں ہلا سکتا مگر قدرت نے اسے حیرت انگیز یادداشت دی ہے۔ ساڑھے چار سال کی عمر میں اس نے انسائیکلو پیڈیا کی آٹھ کتابیں زبانی یاد کر لی تھی۔ وہ ایک لفظ چند سیکنڈ دیکھتا اور پھر کبھی نہ بھولتا یوں اب تک نو ہزار کتابیں اس کے دماغ کے ''کمپیوٹر'' میں فیڈ ہو چکی ہیں۔ وہ اپنی دونوں آنکھوں سے بیک وقت دو مختلف تحریریں پڑھ سکتا ہے اسے اس وقت پندرہ مختلف موضوعات پر عبور حاصل ہے۔

دنیا میں کوئی بھی شخص اتنی حیرت انگیز دماغی صلاحیتوں کا مالک نہیں ہے۔

مرسلہ: مختار بانو۔ کراچی

گلوبل ویلج

دنیا اتنی چھوٹی ہو کر رہ گئی ہے
امریکہ میں ہوتے الیکشن
براہِ راست اپنی دیوار سے دیکھ رہا ہوں
شاعر: خضر حیات۔ روڈہ تھل۔ خوشاب

صحبت کا اثر

پاگل خانے کا ڈاکٹر حیران ہو کر نرس سے وجہ پوچھنے لگا کہ "یہ پاگل چھت سے کیوں لٹک رہا ہے؟"
نرس نے بتایا۔ "یہ اپنے آپ کو بلب سمجھ رہا ہے۔"
"لیکن اس طرح تو یہ پاگل نیچے گر جائے گا۔ اتار دو اسے۔"
"مگر ڈاکٹر۔" نرس نے احتجاج کیا۔
"اس کے اترنے سے تو کمرے میں اندھیرا ہو جائے گا۔"
مرسلہ: محمد اسماعیل بروہی۔ نواب شاہ

کھلاڑی

فٹ بال کے دو کھلاڑی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔
پہلا: "میں نے ایک بار اتنی اونچی فٹ بال پھینکی کہ پورے چار گھنٹے بعد واپس آئی۔"
دوسرا: "یہ تو خیر کوئی بات نہیں، میں نے ایک دفعہ اتنی اونچی فٹ بال پھینکی کہ پورے تین دن بعد واپس آئی اور اس فٹ بال کے ساتھ ایک پرچی بھی تھی جس پر لکھا تھا۔ "یہ فٹ بال آئندہ چاند پر نہ آئے۔""
مرسلہ: مور شاہد حسین۔ قمر شہداد پور

نظم

کسی اَن دیکھی خواہش کو
مری جاں
جب سے ہم نے دل میں پالا ہے
اُسی دن سے
کسی حسرت زدہ لمحے نے
ہم کو مار ڈالا ہے
شاعر: مقصود وفا

وقت

اس کے پاؤں کی آہٹ سنی نہیں جا سکتی۔
ایک ایسی زمین ہے، جس میں محنت کے بغیر کچھ پیدا نہیں ہوتا۔
ایسی شے نہیں، جو قوت اور دولت سے خریدی جا سکے۔
اسے ضائع کرتے وقت یہ یاد رکھو کہ وہ بھی آپ کو ضائع کر رہا ہے۔
زندگی کی قیمتی دولت ہے جس نے اسے کھویا اس نے ساری دنیا کھو دی۔
اس کا غلام بن جانا بہترین دانائی ہے۔
مرسلہ: نگہت منیر۔ ادکاڑہ

سید جمال الدین افغانی

سید جمال افغانی انیسویں صدی میں اسلامی دنیا کی ایک اہم شخصیت تھے۔ آپ افغانستان کے ایک گاؤں سعد آباد میں 1838ء میں پیدا ہوئے۔ سید جمال الدین افغانی نے مصر میں مسلمانوں کے اتحاد کے لیے "پان اسلام ازم" کے نام سے ایک تحریک شروع کی۔ سید جمال الدین افغانی آخری عمر میں سلطان ترکی کی دعوت پر قسطنطنیہ گئے وہیں آپ نے 1897ء میں سرطان کے مرض کی وجہ سے انتقال فرمایا۔ آپ کو ترکی کے شہر استنبول میں امانتاً دفن کیا گیا۔ 1939ء میں افغانستان کے بادشاہ نے ترکی کی حکومت سے درخواست کی کہ سید جمال الدین افغانی کی میت کو افغانستان بھیج دے۔ لہٰذا ان کی میت کو کابل بھیج دیا گیا۔ جہاں آپ کا ایک بڑا خوب صورت مقبرہ ہے۔
مرسلہ: عامر بشیر۔ سعودی عرب

حیرت کدہ

جاپان میں ایک ایسا تھرمامیٹر ایجاد کیا گیا ہے جسے جسم کا درجہ حرارت ناپنے کے لیے منہ میں نہیں رکھنا پڑتا بلکہ یہ مریضوں کے جسم سے تین میٹر کے فاصلے سے چار سیکنڈ میں درجہ حرارت بتانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے "ریڈیو تھرمو" کا نام دیا گیا ہے اور یہ انسانی جسم یا کسی دوسری چیز سے نکلنے والی انفرا ریڈ یعنی بالائے بنفشی شعاعوں کی توانائی ناپ کر درجہ حرارت بتاتا ہے۔
مرسلہ: غیاث الدین۔ پشاور

بچ جاؤں گا

ایک بے تحاشا موٹا آدمی تین منزلہ عمارت سے نیچے گر گیا۔ تین گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد جب اسے ہوش آیا تو ڈاکٹر سے کہنے لگا۔

''ڈاکٹر صاحب! کیا میں بچ جاؤں گا؟'' تو ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''جی ہاں! آپ تو بچ گئے ہیں مگر آپ کے نیچے آکر تین آدمی مر گئے ہیں۔''

مرسلہ: حنیفہ بیگم۔ کراچی

سنہری باتیں

☆ ناں سے بات شروع ہو تو دامن ہی نہیں دل بھی تنگ ہو جاتا ہے۔ پھر نہ دل میں جگہ ملتی ہے نہ دامن میں۔

☆ نقصان' وہ نہیں جو آپ کو ذاتی دکھ سے بٹھا دے۔ نقصان وہ ہے جو آپ کو کسی کی نظر سے گرا دے۔

☆ شارٹ کٹ کتنا بھی صاف کیوں ہو اس کا میلا پن آنکھوں اور دل سے کبھی نہیں جاتا۔

☆ مکاری اور عیاری سے کسی کو راستہ دکھایا جائے تو اس کے نشان اپنے ہی گھر تک ضرور آجاتے ہیں اور ڈھیر سارے آنسوؤں اور دکھوں کو ساتھ لاتے ہیں۔

☆ رویوں میں اندھیرا آئے تو صرف اس کو کوسنے مت بیٹھ جایئے' ممکن ہے آپ کے ایک چراغ جلانے سے کسی کے اندر کی کچھ تاریکی کم ہو جائے۔

☆ قسمت کے کھلنے کا انتظار نہ کریں بلکہ آگے بڑھ کر دستک دیں۔

مرسلہ: شائستہ انور۔ اسلام آباد

ہم ہونے' تم ہونے کہ......

ایک بستی کے سب باشندے بھنگ کے عادی ہو گئے' امام مسجد نے یہ خرابی دور کرنے کے لیے سوچا کہ جمعہ کے دن اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ بھنگ کے نقصانات کیا ہیں۔ انہوں نے خطبے سے پہلے بھنگ کی خرابی اور نقصانات بتائے۔ ساتھ ہی اللہ کے عذاب سے بھی ڈرایا۔

نمازی جو بھنگ کے عادی تھے۔ خاموشی سے سنتے رہے۔ امام صاحب جب خاموش ہوئے تو ایک شخص نے سوال کیا۔ ''کیوں جناب! کیا بھنگ اسی بوٹی کا نام ہے جسے خرگوش بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔'' یہ سوال سن کر امام صاحب نے اپنی پگڑی سے ایک پڑیا نکالی اور اس شخص کی طرف پھینکتے ہوئے بولے۔

''بے وقوف' اس بوٹی کا نام بھنگ نہیں ہے' جسے خرگوش بڑے شوق سے کھاتے ہیں' بلکہ اس بوٹی کو بھنگ کہتے ہیں' جو اس پڑیا میں ہے۔''

مرسلہ: منشی محمد عزیز میمن۔ لڈن وہاڑی

آخری چراغ

اس بستی کے سارے چراغ ایک جیسے ہیں
تم اپنے دل کا آتش کدہ بجھنے نہ دینا
کہ یہ مقدس مٹی کا آخری چراغ ہے

شاعر: رسا چغتائی

ایسا بھی ہوتا ہے

☆ کبھی کبھی خود بھٹکا ہوا مسافر دوسروں کو راستہ دکھانے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ دراصل وہ خود اپنے راستے کی درست سمت کا کھوج لگانے کے لیے ایسا کرتا ہے۔

☆ میرے دوست نے مجھے وہ بات بتائی جو میں نے کہیں اکیلے میں خود کلامی کے انداز میں کہہ ڈالی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی میں نے بات سے پوچھا کہ وہ میرے دوست تک پہنچی کیسے' بات بولی! تمہاری طرف سے ملنے والی آزادی کے ذریعے۔

☆ جب خوف کی پرچھائیاں گہری ہو جائیں تو ہم دلیری کی دھوپ تاپنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس کے لیے حوصلہ کے سورج کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔

☆ کبھی کبھی ہم فاصلوں سے لڑ پڑتے ہیں۔ حالانکہ یہ ہمیں آگے بڑھنے کی ترغیب بھی دے رہے ہوتے ہیں۔

مرسلہ: محمد اسامہ۔ کراچی

اجیا معین..................کراچی

تم ہی نے ہم کو سنایا نہ اپنا دُکھ ورنہ
دعا وہ کرتے کہ ہم آسماں ہلا دیتے
تمہیں بھلانا ہی اول تو دسترس میں نہیں!
جو اختیار بھی ہوتا تو کیا بھلا دیتے؟

شاہانہ احمد..................حیدرآباد

ہر ایک شخص چلے گا ہماری راہوں پر
محبتوں میں ہمیں وہ مثال ہونا ہے

ایم افضل آزاد..................ساہیوال

عجب رنگ محبت کر رہا ہے
وہ میرے دل سے ہجرت کر رہا ہے
تمہارے پیار کا زخمی سپاہی
محبت کی حفاظت کر رہا ہے

زاہد کولاچی..................نواب شاہ

سچ کہوں کیا دیا محبت نے
تم کو بے چینیاں ملال مجھے

سلمان عمرانی..................سجاول

چاند ہے رات ہی کی دنیا تک
خواب ہے ذات ہی کی دنیا تک
وہ محبت جو روح میں اُتری
تھی خیالات ہی کی دنیا تک

علی رضا عمرانی..................ٹھٹھہ

لے دے کے محبت کی جگہ درد نے لے لی
اب ٹوٹ کے رویا ہوں تو آرام بہت ہے

تنویر فاطمہ..................کراچی

محبت کا اثر ہونے لگا ہے
ترا چہرہ قمر ہونے لگا ہے
اندھیرا بڑھ رہا ہے سانپ بن کر
سفر نا معتبر ہونے لگا ہے

افضال حسین بابر..................کراچی

ڈوبتے ہم نہ محبت کے بھنور میں ہرگز
گر پتا ہوتا ہمیں درد کی گہرائی کا

نسیم شفیق..................اسلام آباد

مرے خدا تو مرا اضطراب جانتا ہے
گزر رہے ہیں جو جاں پر عذاب جانتا ہے
تمام عمر جو سوچا تجھے خبر اس کی
تمام عمر جو دیکھے وہ خواب جانتا ہے

یاسمین عمران..................وزیرآباد

چلا ہے مجھ میں جہاں تک مجھے ضرورت تھی
قدم اٹھاتا ہوا شخص میرے پاؤں کے ساتھ

عاصم خان نیازی..................سوات

میرا دشمن بھی مرے دل میں اتر سکتا ہے
اپنے اندر کوئی دیوار اٹھاتا نہیں میں
یہ بلندی تو مجھے عشق نے دی ہے ورنہ
اپنے سر پر کوئی کہسار اٹھاتا نہیں میں

صفیہ سلطانہ..................جیکب آباد

کیسے منظر سے ہٹائے گی مجھے یہ دنیا
میں کہیں ذہن کہیں دل پہ رقم ہوتا ہوں

کوثر سعید..................لاہور

آدمی تھا، خدا بنا دیا ہے
عشق نے کیا سے کیا بنا دیا ہے
کوئی سچ پر چلے، چلے نہ چلے
ہم نے تو راستہ بنا دیا ہے

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:

پتا:

کوپن برائے

تیر نیم کش

جنوری 2017ء



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

مقصود احمد بلوچ .... حیدر آباد
میں اپنے ہاتھ سے بھی کھو نہ جاؤں
تمہاری کھوج جنگل ہو گئی ہے
تمہارے بعد کچھ بدلا نہیں ہے
سنا ہے شام پاگل ہو گئی ہے

رضوانہ کوثر .... لاہور
جانے کس نیند میں سوئے ہیں مرے شہر کے لوگ
دن نکلنے پہ بھی بیدار نہیں ہے کوئی

منشی محمد عزیز مے .... لڈن وہاڑی
ظلم ہو تیغ ہو تیشہ کہ ڈھال مت چھینو
کبھی کسی سے کسی کا کمال مت چھینو
ابھی بجھاؤ نہ کینڈل نہ کیک کاٹو ابھی
کچھ اور دیر میرا پچھلا سال مت چھینو

خضر حیات .... روڈہ تھل خوشاب
آئینے ایسے بجھے ہیں سب کے چہرے چھن گئے
اب کسی سے بھی کسی کی کچھ شناسائی نہیں
اس فراوانی سے توبہ الاماں اس قحط سے
روشنی ہی روشنی ہے اور بینائی نہیں

ریاض حسین تبسم چوہان .... فیصل آباد
مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے
یا شاید مجھ کو ایسا لگ رہا ہے

ڈاکٹر شہباز .... حیدر آباد
میں کیسے پھرتا بھلا حوصلہ جوان لیے
کہ زندگی نے بہت مجھ سے امتحان لیے

ابوہریرہ بلوچ .... بورے والا
آئے نہ یارو ہم کو بھی آداب رخصتی
وہ جا چکا تو بعد میں ہم چشم نم ہوئے

جواد انور .... اسلام آباد
دفن ہوں مصلحت کے بوجھ تلے
حوصلہ مجھ میں ہے چٹانوں کا
بوریوں میں اناج بھرنے سے
پیٹ بھرتا نہیں کسانوں کا

محمد قاسم بلوچ .... ٹوبہ ٹیک سنگھ
یہ رحمت بھی تو رفتہ رفتہ زحمت ہو ہی جاتی ہے
تسلسل غم سے غم سہنے کی عادت ہو ہی جاتی ہے
مسیحا ہو اگر تم سا ضرورت کیا ہے مرہم کی
کہ کانٹوں سے بھی زخموں کی جراحت ہو ہی جاتی ہے

سعادت علی خان .... لیہ
طلسم خواب زلیخا و دام بردہ فروش
ہزار طرح کے قصے سفر میں ہوتے ہیں

حنا اشتیاق .... کراچی
تمہیں خبر ہی نہیں ہے کہ کوئی ٹوٹ گیا
محبتوں کو بہت پائیدار کرتے ہوئے

محمد وسیم .... روڈہ تھل خوشاب
جان دینے کی اجازت بھی نہیں دیتے ہو
ورنہ مر جائیں ابھی مر کے منا لیں تم کو

سید عبادت کاظمی .... رحیم یار خان
ہجر کے ساحل پہ کس کے منتظر بیٹھے ہو تم
اس سمندر سے بھلا کب لوٹتی ہیں کشتیاں

''آپ تکلف نہ کریں۔ اگر کھانا نہ کھایا ہو تو میں منگواؤں؟'' میں نے کہا۔

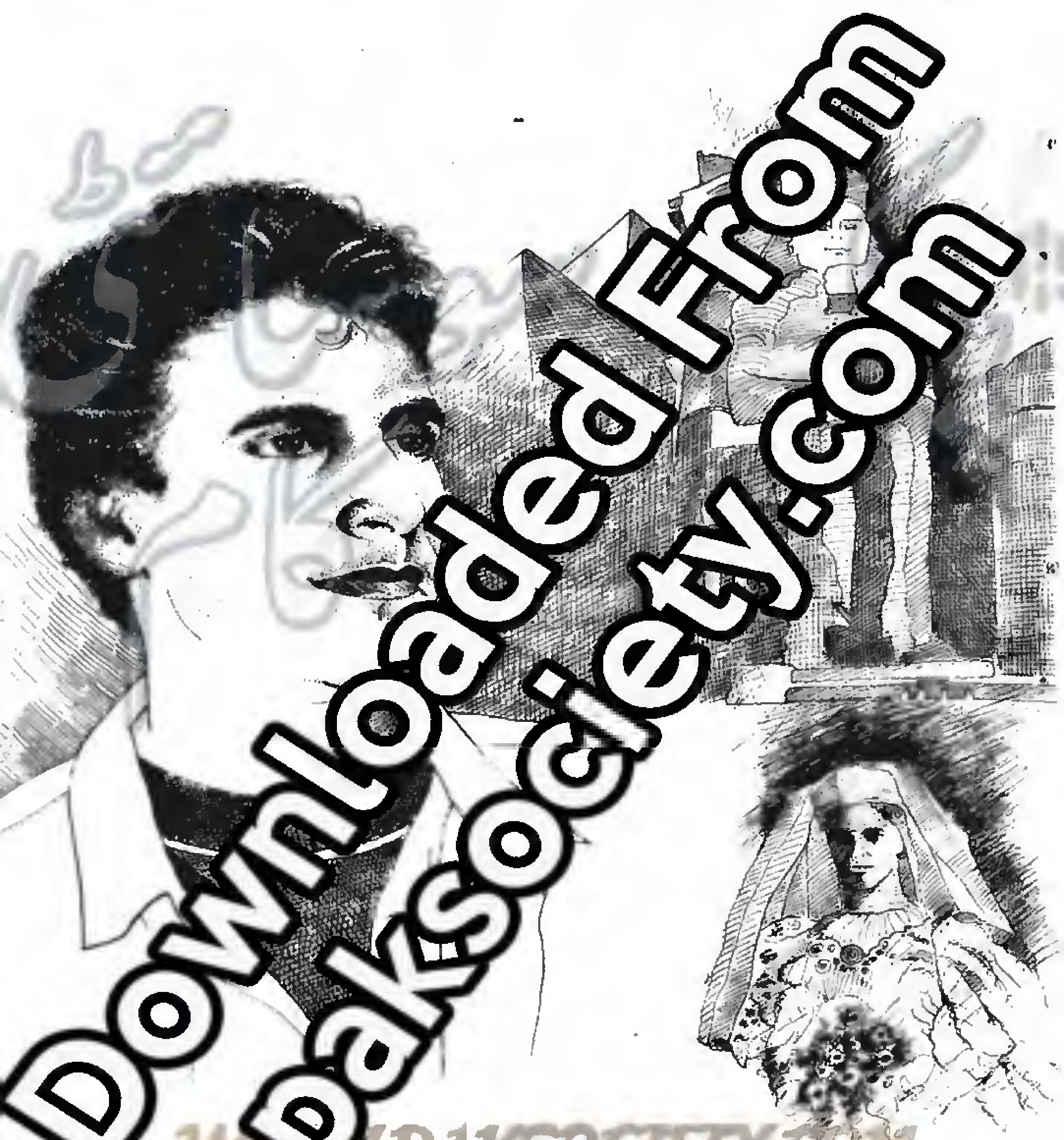
''دوبارہ شکریہ ادا کروں گا۔ کھانا کھا چکا ہوں۔ اصل میں اگر کسی کے پاس کوئی فن ہو اور اتفاق سے اسے کچھ ایسے کام کے لوگ نظر آجائیں جو اس کے لیے ایک تعمیر مستقبل ہوں اور وہ ان کے لیے سونے کی کان ہو تو پھر ہر تکلف بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔''

''آپ شاید عین اطربین الاتفاق الحنہ کے مصنف ہیں۔'' مرزا ساحر سے نہ رہا گیا اور نو وارد چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

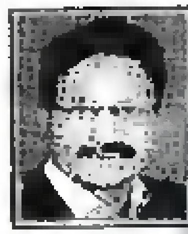
''میں سمجھا نہیں۔''

''جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہ ہم بھی نہیں سمجھے۔ آپ اتنے مشکل الفاظ بول رہے ہیں۔''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی لیکن وہ







لکڑی کی ملکہ

جاوید راہی

فراعنہ کی سرزمین سے اُس گم شدہ ملکہ کی داستان‘ جسے حاسدین نے لکڑی کا بنا دیا تھا

ستارہ ہوٹل کوئی بہت معیاری ہوٹل نہیں تھا لیکن یہاں کے کھانے لاجواب ہوتے تھے خاص طور سے صاحبِ ذوق حضرات کے لیے کچھ چیزیں تو کمال کی ہوتی تھیں اور میں اور مرزا ساحر اکثر یہاں آجاتے تھے۔ پہلے یہ ہوٹل اتنا صاف ستھرا اور کشادہ نہیں تھا لیکن جوں جوں اس کے کھانوں کی شہرت ہوتی ہوٹل کے مالکان نے بھی اس کا معیار بڑھانا شروع کر دیا۔ آس پاس کی جگہیں خریدی گئیں اور انہیں بہت عمدگی سے بنایا گیا۔ یہاں تک کہ ہوٹل ایئرکنڈیشنڈ ہو گیا۔

اس وقت بھی باہر دھوپ ہو رہی تھی اور اندر کا ماحول خنک تھا۔ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ایک عمر رسیدہ شخص ہم پر نازل ہو گیا۔ کوئی ساٹھ پینسٹھ سال عمر ہو گی۔ عربی طرز کا لباس پہنے ہوئے تھا جو میلا کچیلا اور کسی حد تک بوسیدہ تھا۔ گلے میں ایک موٹی سی مالا پڑی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر جھکا۔

”بہت غیر معیاری حرکت کر رہا ہوں لیکن اگر آپ لوگ مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دے دو تو خوشی ہو گی۔“

ہم دونوں ہی نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

ساحر کہنے لگا۔ ”کھانا کھاؤ گے، جاؤ دوسری میز پر بیٹھو، کھانا وہیں آجائے گا۔“

”میں کھانا کھا چکا ہوں۔ صرف تھوڑا سا وقت لوں گا تم سے۔“ اس نے کہا۔ ساحر اس سے بات کر رہا تھا لیکن میری زبان بند ہو گئی۔ اس کی وجہ اس کے ہاتھوں میں پڑی انگوٹھیاں تھیں۔ ہیروں اور قیمتی پتھروں کے بارے میں، میں اتنا کیسے جانتا ہوں یہ بعد میں بتاؤں گا اس وقت اتنا کہہ سکتا تھا کہ وہ انگوٹھیاں سب ملا کر کوئی ایک ڈیڑھ کروڑ کی مالیت کی تھیں اور اس میں ذرہ برابر کوئی شک کی بات نہیں تھی۔ مجھے جب یقین ہو گیا کہ انگوٹھیوں کی مالیت کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے تو میں نے غور سے اس شخص کا چہرہ دیکھا اس کے لباس نے بے شک ہمیں عجیب سے احساس کا شکار کر دیا تھا لیکن جب میں نے اس کے چہرے پر غور کیا تو وہ مجھے ایک سنجیدہ اور بارعب سی شخصیت کا مالک نظر آیا۔

ساحر کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا ”تشریف رکھیے۔“

”شکریہ“ وہ بیٹھ گیا۔

جواب نہیں دیا۔ مرزا نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ پھر بولا۔

''ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔''

''مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں ایک اہم کام تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں جس کا میں تمہیں منہ مانگا معاوضہ دوں گا۔ حیران مت ہونا بالکل اتفاق سے مجھے تمہارے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ تم میرا کام کر سکتے ہو اور ان دنوں تم مالی پریشانیوں کا شکار بھی ہو۔ اگر میرا کام کرنا پسند کرو تو آج شام یا زیادہ سے زیادہ کل تک مجھ سے اس پتے پر مل لو۔ اگر تم کل تک میرے پاس نہ آئے تو میں سمجھوں گا کہ تم میرے ساتھ کام کرنے پر تیار نہیں ہو۔ پھر میں کسی دوسرے شخص کو تلاش کروں گا۔''

''واہ۔ پتا کیا ہے؟'' مرزا ساحر نے کہا اور اس نے اپنے لباس سے ایک سادہ سا کارڈ نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس پر ایک شاندار علاقے کا پتا لکھا ہوا تھا۔

''اگر آج آنا چاہیں تو کس وقت؟''

''شام کی چائے میرے ساتھ پی لینا۔ تقریباً چھ بجے۔''

''ہم آئیں گے۔'' میں نے کہا اور وہ فوراً اُٹھ گیا پھر رسمی سلام دعا کیے بغیر واپس مڑا اور ریسٹوران سے باہر نکل گیا۔

''یہ سارے ڈرامے ہماری تقدیر میں ہی لکھے ہیں؟ کیا شے تھی یار یہ؟'' مرزا نے کہا۔

''جو کچھ بھی تھی معمولی شے نہیں تھی۔ جو کچھ اس نے ہمارے بارے میں بتایا اسے تم معمولی کہہ سکتے ہو؟''

''ہاں۔ بات تو چکرا دینے والی ہے لیکن اس دور میں بڑے بڑے شعبدے جنم لے رہے ہیں۔ کیا سوچ رہے ہو تم اس کے بارے میں۔''

''یار میں تو بہت متاثر ہوا ہوں۔''

''اس کا حلیہ تو بتاتا ہے کہ وہ درگاہ پر مجاوری کرتا ہوگا۔''

''بیوقوف آدمی۔ درگاہ کی مجاوری معمولی بات نہیں ہوتی۔ تم نے اس کے ہاتھوں کی انگلیوں پر غور نہیں کیا تھا؟''

''کیا تھا ان انگلیوں میں؟''

''تم جانتے ہو مجھے اعلیٰ پتھروں اور ہیروں کی کافی شناخت ہے۔ اس نے بلا مبالغہ کوئی دو کروڑ روپے کی قیمت کی انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں۔'' مرزا کو زور کا پھندا لگ گیا۔ پانی کے کئی گھونٹ پینے کے بعد اس نے کہا۔

''یار کچھ کم کر دو۔''

''یہ تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور مرزا ساحر سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''خیر۔ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔''

☆......☆

جس کوٹھی کا اس نے پتا دیا تھا وہ اپنی شان آپ تھی۔ ہم ڈرتے ڈرتے گیٹ سے اندر داخل ہو گئے تھے۔ خوبصورت لان پر میزیں اور کرسیاں پڑی تھیں اور وہ اس فقیرانہ حلیے میں یہاں موجود تھا۔ اس نے ہمارا خیر مقدم کیا بیٹھنے کی پیشکش کی پر بولا۔ ''ہم چائے کے بعد باتیں کریں گے۔''

چائے بھی بے حد پر تکلف تھی کم از کم میں اس پر بڑا شرمندہ ہوا۔ ریسٹوران میں ہم نے سوچا تھا کہ یہ شخص شاید ہم سے کھانے کے بارے میں درخواست کرے لیکن اس وقت صرف چائے کے سلسلے میں میز لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔

چائے کے بعد وہ بولا ''تھوڑے سے علم سیکھے ہیں میں نے۔ جن کا مظاہرہ میں نے تمہارا ماضی بتا کر کیا تھا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ مجھے تمہاری تلاش ہے۔ میرے علم نے نشاندہی کی تھی کہ تم دونوں ہی میرے کام آ سکتے ہو اور میں نے آخر تمہیں تلاش کر لیا۔''

''آپ کا نام عجیب ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ شاید مگر میں اس کی وضاحت نہیں کروں گا۔ تم نے دنیا کے بہت سے ممالک دیکھے ہیں۔''

''ہاں۔ ہم دونوں آوارہ گرد ہیں۔''

بالکل سنجیدہ تھا۔ اس دوران ہم کھانا ختم کر چکے تھے۔ اس نے کہا۔

''میں نے ایک علم کی بات کہی تھی آپ نے دوبارہ اس کے بارے میں پوچھا ہی نہیں۔''

''اوہو۔ آپ اپنے کسی علم کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ کیا آپ آہن خور ہیں، کیلیں، بلیڈ اور لوہے کی دوسری چیزیں کھاتے ہیں۔'' مرزا نے پھر اس کا مذاق اُڑایا۔

''نہیں۔ میرے پاس ایک انوکھا فن ہے۔ میں آپ کو اس کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔''

''بتایئے۔''

''میں چہرہ شناس ہوں۔ انسان کی پیشانی دیکھ کر اس کی پوری زندگی میں جھانک لیتا ہوں۔ میں کھانا کھا رہا تھا کہ اتفاق سے آپ پر نگاہ پڑ گئی اور آپ کے بارے میں جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔''

''کیا جانا آپ نے ہمارے بارے میں'' مرزا نے پھر کوئی مزاحیہ جملہ کہنا چاہا تھا کہ اس سے پہلے میں بول پڑا۔

''یہ صاحب۔'' اس نے مرزا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''بچپن میں ماں باپ سے محروم ہو گئے۔ ان کے والد ایک اچھے خاصے تاجر اور کھاتے پیتے آدمی تھے لیکن وہ اور ان کی بیگم ایک حادثے میں چل بسے۔ ان کے والد کا کاروبار ان کے چچا سنبھالتے تھے۔ ان کی چچی ایک لالچی خاتون تھیں۔ انہوں نے ان کی دولت پر قبضہ کرنے کیلئے انہیں زہر دے دیا، ان کی زندگی تو بچ گئی لیکن یہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ ہسپتال میں تھے کہ نکل بھاگے اور پھر مارے مارے پھرتے رہے۔ دنیا کے کئی ملکوں میں گئے اور ان کا ذہنی توازن ٹھیک ہو گیا۔ اس دوران ان کے چچا ان کی ساری دولت ختم کر چکے تھے۔ انہوں نے انہیں معاف کر دیا اور پھر ایک سمندری جہاز پر نوکری کر کے ملک سے نکل گئے۔ آپ سے ان کی ملاقات ایک دوسرے ملک میں ہوئی جہاں یہ ایک مصیبت میں پھنس گئے تھے وہاں سے آپ لوگوں کی دوستی ہو گئی اور آپ دونوں مشترک زندگی گزارنے لگے اور اب آپ کے بارے میں۔''

اس نے میرا ماضی دہرانا شروع کر دیا۔ ہم دونوں سکتے کے عالم میں اسے سن رہے تھے اور ہماری عقل ضبط تھی۔ مجھ سے زیادہ مرزا ساحر متاثر تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ پھر خود ہی بولا۔

''اپنی زندگی کے کسی اہم لمحے کے خاص واقعے کے بارے میں پوچھنا چاہیں تو۔۔۔''

''میں اپنی بیوی کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ کر کہاں گئی۔'' مرزا نے خود کو سنبھال کر کہا۔ ''اور میرے دونوں بچے اب کہاں ہیں؟''

وہ مرزا کو دیکھنے لگا اور پھر بولا'' آپ کی کبھی شادی نہیں ہوئی۔''

''اور بچے۔۔۔؟'' مرزا بولا اور وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

''آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟'' میں نے کہا۔

''اغران غربی۔''

''سبحان اللہ۔'' مرزا نے خیالی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

''آپ لوگ سنجیدہ ہونا پسند کریں گے۔'' اس بار اس نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔

''آپ ہمیں ہمارے مستقبل کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔''

''نہیں۔'' وہ دوٹوک بولا۔ ''مستقبل کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ اس کے راز کوئی نہیں جان سکتا۔''

''اور یہ جو نجومی حضرات، بلکہ حشرات ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں اور ماضی، حال اور مستقبل کے تمام مسئلے چٹکیوں میں حل کر دیتے ہیں۔ ان ے بارے میں کیا خیال ہے۔؟''

''پیٹ کی تکلیف کا شکار ہیں بے چارے۔ پیٹ روٹی مانگتا ہے اور جو کچھ کرتے ہیں پیٹ بھرنے کے لیے کرتے ہیں اور کچھ نہیں۔''

''گڈ۔۔۔ آپ کا نام عجیب ہے۔ اغران غربی۔ اس کا مطلب کیا ہے؟'' مرزا ساحر ہی اس طرح کے سوالات کر سکتا تھا۔ اس نے اس سوال کا

''اور اب میں تمہارا آخری جواب سننے کا شدت سے منتظر ہوں۔'' یہ کہہ کر اغران غربی خاموش ہوگیا تھا۔ ساحر بھی اب سنجیدہ نظر آرہا تھا، ہم دونوں ہی اپنے طور پر سوچ رہے تھے پھر تھوڑی دیر کے بعد ساحر نے کہا۔

''تمہاری اس پرکشش آفر کے بدلے میں ہم زندگی داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہیں۔'' ساحر نے میری طرف دیکھے بغیر ہی یہ الفاظ کہے تھے چنانچہ اغران غربی نے میری طرف دیکھ کر میری بھی رضامندی جاننا چاہی اور میں نے بھی ساحر کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں اغران غربی تمہاری اس پیشکش کو قبول کرتے ہیں۔ اب ہمیں آگے کا پروگرام بتاؤ۔''

''آگے کا پروگرام یہ ہے دوستو کہ تم آج ہی اپنے پاسپورٹ میرے حوالے کرو گے ساتھ ہی ساتھ اپنے اکاؤنٹ کھولنے کی کارروائی پوری کرلو، ہمیں جلد از جلد یہ کام مکمل کرلینے ہیں۔ سفر کا سامان اور باقی تمام تیاری میرے ذمے، بس آپ سے جو کام کہا گیا ہے اسے پورا کرلیں اور میرا خیال ہے اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔''

''ٹھیک ہے، ہم چلتے ہیں۔'' ہم دونوں نے اُٹھتے ہوئے کہا اس کے بعد اغران غربی سے اجازت لے کر اس کوٹھی سے باہر نکل آئے۔ ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھتے ہوئے ساحر نے کہا۔

''یار قسمت سے ایک اچھا موقع ہاتھ آیا ہے، تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے تم سے پوچھے بغیر ہی اغران کے سامنے رضامندی دے دی۔''

''نہیں۔ نہیں، تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ میں تم سے پوری طرح متفق ہوں۔'' میں نے کہا۔ اس کے بعد ہم دونوں اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ میں نے اپنے سامان سے پاسپورٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''تم ایسا کرو کہ اپنا اور میرا پاسپورٹ لے کر اغران کے پاس چلے جاؤ، میں بینک جاکر فارم وغیرہ لے آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ساحر نے کہا اور ہم اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوگئے۔

چند ضروری کارروائیوں کے بعد اکاؤنٹ کھل گیا اور ساتھ ہی ساتھ اغران غربی کا فون بھی موصول ہوا تھا۔

''دوستو! ہمارا کام ہوگیا ہے، تم لوگوں کے ویزے لگ گئے ہیں اور تمام تیاریاں مکمل ہوگئی ہیں اور سنو تم دونوں اپنے اکاؤنٹ بیلنس چیک کرسکتے ہو حسب وعدہ طے شدہ رقم کا ایک تہائی معاوضہ تمہارے اکاؤنٹس میں ٹرانسفر کردیا گیا ہے۔''

ہم دونوں حیران رہ گئے تھے، ابھی تو بینک منیجر نے فون کرکے اکاؤنٹ نمبر بتائے تھے اور ابھی رقم بھی ٹرانسفر ہوگئی، بہرحال دوسری طرف سے پھر کہا گیا ''اپنے معاملات سے فارغ ہوکر آپ لوگ کل شام تک میری کوٹھی پہنچ جائیں۔ میرے ساتھ کچھ وقت گزاریں تاکہ سفر کی کچھ معلومات آپ کو سمجھائی جاسکیں، اس کے بعد آپ لوگ سفر کا آغاز کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ساحر نے کہا اور پھر فون بند کردیا۔ اس کے بعد ساحر نے بینک منیجر کو فون کرکے بیلنس چیک کیا تھا اور اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ ہم دونوں نے ضروری سامان پیک کیا اور وقت مقررہ پر اغران غربی کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ اغران غربی نے ہمارا شاندار استقبال کیا تھا۔ چند ضروری باتوں کے بعد اس نے کہا۔

''اہرام مصر کے علاقوں سے آپ تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں، ایک مخصوص علاقے تک پہنچنے کے بعد آپ اونٹوں کے ذریعے خپس کی پہاڑیوں کی جانب سفر کریں گے۔ ان کے آس پاس ہی ہماری منزل ہے۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' ساحر نے کہا وہ اب بہت زیادہ متاثر نظر آرہا تھا۔

اغران کافی دیر تک ہم دونوں کو مختلف باتیں سمجھاتا رہا تھا۔ پھر ایک پرتکلف ڈنر کیا گیا اور ہم دونوں کو آرام کے لیے ایک کمرہ مہیا کردیا گیا جہاں

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماءِ راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

''مصر گئے ہو کبھی؟''

''ہاں جا چکے ہیں۔''

''گویا وہاں کے ماحول سے واقفیت رکھتے ہو۔''

''کسی حد تک۔''

''کبھی کسی مقبرے میں خزانے کی تلاش میں گئے۔''

''نہیں۔''

''حالانکہ تم دولت پرست ہو۔''

''وہ کون نہیں ہوتا۔''

''مصر کے مقبروں میں تو بہت کچھ ملتا ہے۔''

''زندگی نہیں ملتی۔''

''مطلب۔''

''ہمارا موقف ہے کہ دولت کے حصول کی کوشش ضرور کرو، لیکن زندگی کی قیمت پر نہیں۔ پہلے زندگی بعد میں اور کچھ اور یعنی دولت وغیرہ۔''

''وغیرہ سے کیا مراد ہے؟''

''عشق، عورت۔'' ساحر بہت منہ پھٹ تھا۔ اغران غربی مسکرا دیا۔

''خیر۔ وہ تمہارے ذاتی معاملات ہیں۔ میں تمہیں اپنے کام کی نوعیت بتا دوں۔ مصر کے فرعونی مقبرے سے مجھے ایک ممی درکار ہے۔ اصل میں جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ مجھے پراسرار علوم سے دلچسپی ہے اور میں اس پر بہت سے تجربات کر چکا ہوں۔ میں نے دنیا بھر کے آثار قدیمہ کی سیر کی ہے اور وہاں سے بہت سا علم حاصل کیا ہے۔ ان دنوں بھی میں کچھ تجربات کر رہا ہوں اس مقصد کے لیے مجھے بس ایک ممی درکار ہے۔''

''گویا ایک حنوط شدہ لاش۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ اس کو ممی کہتے ہیں۔''

''اس کام کے لیے تو مصر جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' ساحر بولا

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ممی بنانا کون سا مشکل کام ہے، آج کل۔''

''بڑی لچھے دار باتیں کر رہے ہو تم۔'' اغران نے کہا۔

''ویسے آپ ممی کس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں؟''

''تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔'' ویسے اتنا میں تمہیں بتا ہی دوں کہ وہ ممی کسی مرد کی نہیں بلکہ ایک عورت کی ہے۔''

''اچھا۔'' مرزا ساحر نے حیرانی طاری کرتے ہوئے کہا۔

''مرزا تھوڑا سا سنجیدگی کا موڈ طاری کر لو۔'' میں نے ذرا برہمی سے کہا اور مرزا خاموش ہو گیا تھا۔ اغران غربی نے پھر کہا۔

''اگر آپ دونوں کام کے لیے تیار ہو جاتے ہیں تو پھر مجھے آپ کے پاسپورٹ درکار ہوں گے۔''

''ایک منٹ، ایک منٹ ہر کام کا کوئی نہ کوئی معاوضہ ہوتا ہے۔'' ساحر نے کہا۔

''منہ مانگا معاوضہ ملے گا۔'' اغران غربی بولا اور ہم دونوں کچھ دیر کے لیے گنگ ہو گئے۔ زندگی میں بڑے خواب تھے، بڑے کام کرنے تھے اور اب شاید ان کو پورا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ مرزا کچھ بولے میں نے ایک بڑی رقم بولی لیکن جواب ہم دونوں کی توقع کے برخلاف تھا۔

''تم لوگ اطمینان رکھو میرا کام پورا ہونے کی صورت میں تمہیں اس سے تین گنا رقم کی ادائیگی ہو جائے گی۔'' ہم دونوں ہی حیرت کے سمندر میں غوطے لگا رہے تھے۔ پھر مرزا ساحر نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''کس طرح؟''

''کیا تمہارا کوئی بینک اکاؤنٹ ہے؟''

''جی نہیں۔''

''کوئی بات نہیں، تم دونوں اپنے اپنے بینک اکاؤنٹ کھلوا لو، ایک تہائی رقم کام پورا ہونے سے پہلے تمہارے اکاؤنٹ میں برابر بھیج دیا جائے گی اور پھر جیسے ہی کام پورا ہوگا بقیہ رقم بھی تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جائے گی۔''

''یہ بھی مناسب ہے۔'' مرزا نے کہا۔

ہوئے اس کے اندر داخل ہوسکیں۔ قریب جا کر دیکھا تو وہ بہترین مسکن ثابت ہوا۔ غار زیادہ طویل نہیں تھا۔ اندر سے پندرہ فٹ لمبا ہوگا اور اس طرح وہ کھوکھلی پہاڑی ایک کمرے کی سی شکل اختیار کر گئی تھی۔ ہم نے تمام سامان اندر پہنچایا اور دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لیے غار کے دہانے پر ایک قنات تان دی پھر اندر کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ کچھ لوگ پہلے بھی اسی جگہ قیام پذیر ہوتے رہے ہیں کیونکہ سگریٹ کے پیکٹ، خوراک کے خالی ڈبے اور اس قسم کی دوسری ناکارہ چیزیں ادھر بکھری ہوئی تھیں میں نے سوچا کہ کیوں نہ باہر کا جائزہ لیا جائے چونکہ سورج غروب ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا چنانچہ ہم نے ساربانوں سے کہا۔

''ہم آس پاس کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ تم لوگ سامان وغیرہ لگاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' انہوں نے کہا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ ہر طرف غار اور گڑھے کھدے ہوئے نظر آ رہے تھے اور یقیناً ماہرین آثار قدیمہ اور مہم جوؤں کی کوششوں کا نتیجہ جو جگہ جگہ کھدائی کر کے ناکام ہو کر واپس چلے گئے تھے۔ ساحر اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''ان گڑھوں اور غاروں سے ہمیں کافی مدد مل سکتی ہے۔''

''مجھے امید نہیں کیونکہ بیشتر گڑھے ایسے ہیں جنہیں معمولی گہرائی تک کھود کر ناکامی کی صورت میں چھوڑ دیا گیا ہے۔''

''نہیں پارٹنر ایسی سرنگیں بھی نظر آ رہی ہیں جو پہاڑیوں کے اندر کافی گہرائی تک چلی گئی ہیں اور ہو سکتا ہے ان ہی میں سے کوئی سرنگ کسی مقبرے کے دروازے تک پہنچتی ہو۔''

''اور اس مقبرے میں ایک غار ہمارا منتظر ہو جس میں کسی مصری شہزادی کی حنوط شدہ ممی بھی ہو جسے ہم اغران غربی کی خدمت میں پیش کر سکیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''کیوں۔ تمہیں اس امر پر تعجب کیوں ہے؟''

''اس لیے کہ اگر بالفرض محال کوئی سرنگ اہرام کے دروازے پر نکلتی ہے تو سرنگ کھودنے والوں نے ہمارے لیے وہاں کچھ نہ چھوڑا ہوگا۔'' مرزا خاموش ہی گیا ہم ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ معاً ہماری نظر ایک ایسے گڑھے پر پڑی جو بہت گہرا اور خاصا چوڑا تھا اور تازہ کھدا ہوا تھا۔ مرزا متجسس نظروں سے گڑھے کو دیکھنے لگا پھر بولا۔

''یہ گڑھا حال ہی میں کھودا گیا ہے۔ میرے خیال میں اندر اُتر کر دیکھا جائے شاید کوئی مطلب کی بات معلوم ہو جائے۔''

''ہم باری باری گڑھے میں اتر گئے۔ نیچے پہنچے تو ایک جانب زمین کے اندر کی طرف سیڑھیاں جاتی ہوئی نظر آئیں۔ ہم حیرت سے اس زمین دوز زینے کو دیکھنے لگے۔ جس کی سیڑھیاں زمین کھود کر ترتیب دی گئی تھیں۔ ساحر کا اصرار تھا کہ اندر داخل ہو جائے، میرے ذہن میں بھی تجسس سر اُبھار رہا تھا چنانچہ ہم سیڑھیاں عبور کرنے لگے۔ زینہ طویل نہیں تھا کچھ دیر بعد ہم ایک لمبی اور تاریک سرنگ میں پہنچ گئے، سرنگ کافی کشادہ تھی۔ ہم دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے سرنگ تاریک ہوتی جا رہی تھی اور دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے مرزا سے کہا۔

''واپس چلو پارٹنر! بغیر روشنی کے آگے بڑھنا مہلک ثابت ہوسکتا ہے۔''

مرزا ذرا ضدی قسم کا آدمی تھا مگر اس وقت شاید وہ بھی واپسی کی سوچ رہا تھا اس لیے فوراً آمادہ ہوگیا اور ہم لوگ باہر نکل آئے۔

پڑاؤ پر پہنچے تو ملازموں نے انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ جگہ صاف کر کے بستر لگا دیے گئے تھے کھانا وغیرہ بھی تیار ہو چکا تھا ہم سب نے مل کر کھانا کھایا اور جلد ہی بستر پر دراز ہو گئے کیونکہ علی الصبح کام کا آغاز کرنا تھا۔

میں نے اور مرزا نے مل کر طے کیا تھا ہم دونوں میں سے ایک ایک رات کی ڈیوٹی دے گا چنانچہ میں غار سے باہر آ گیا تھا۔ رات زیادہ نہیں گزری تھی

خوبصورت بستر لگے ہوئے تھے پھر مقررہ وقت پر اغران غربی ہمارے پاس پہنچ گیا۔
''آپ لوگ تیار ہو جائیں، بس روانگی کا وقت آن پہنچا ہے۔''
''ٹھیک ہے، ہم پانچ منٹ میں باہر آجاتے ہیں۔''
ٹھیک پانچ منٹ کے بعد ہم کوٹھی کے بیرونی گیٹ پر اپنے سامان کے ساتھ موجود تھے۔ ہمارا سامان ایک شاندار گاڑی میں رکھا گیا اور ہم گاڑی میں بیٹھ کر ائیرپورٹ روانہ ہو گئے۔
پھر جہاز سے مقررہ مقام تک کا سفر طے ہوا اس کے بعد زمینی سفر طے کر کے ہم اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں سے تھپس کی پہاڑیوں کا سفر کرنا تھا۔ یہاں ہمیں مطلوبہ سامان اور دو ساربان حاصل کرنا تھا جو مشکل ثابت نہ ہوا۔ پھر اس وقت صبح کے چار تک کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی مگر جب سورج چڑھا اور دھوپ کی تمازت بڑھی تو جسم سے چنگاریاں نکلتی محسوس ہونے لگیں، ایسی قیامت کی گرمی تھی کہ خدا کی پناہ، بادِ سموم کے جھونکے بدن کو جھلسائے دے رہے تھے۔ ہر طرف ریت کا سمندر موجزن تھا اور تاحد نگاہ کوئی جھاڑی یا درخت دکھائی نہیں دیتا تھا جس کے سائے میں پناہ گزین ہو کر کچھ دیر آرام کر لیا جاتا، ٹھہر کر دم لینے کی کوشش کرتے تو حالت اور خراب ہو جاتی اور یوں لگتا گویا آسمان سے آگ کی بارش اور تیز ہو گئی ہو، خدا خدا کر کے شام ہوئی اور سورج کا غیض وغضب ماند پڑ گیا۔ سورج کی حکمرانی ختم ہوتے ہی ہماری جان میں جان آئی، صحرا میں غروب آفتاب کا منظر بڑا دلکش تھا لیکن اس خستہ حالی میں قدرت کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہونے کی فرصت کسے تھی۔ ہم تو کسی مناسب جگہ پڑاؤ ڈالنے کا سوچ رہے تھے لیکن ریگستان میں مناسب جگہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ چاروں جانب ریت ہی ریت پھیلی ہوئی تھی، چنانچہ جہاں تھے وہیں رک گئے، ساربانوں نے اونٹوں سے سامان اتارا اور خیمے نصب کر دیے گئے۔
ریگستان کا دن جتنا قیامت خیز اور اذیت ناک ہوتا ہے رات اتنی ہی فرحت بخش اور سحر انگیز ہوتی ہے۔ اغران غربی اپنے خیمے میں تھا، میں اور ساحر رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ بڑا رومان پرور ماحول تھا، بھرپور چاندنی میں تاحد نگاہ تک پھیلی ہوئی ریت عجیب منظر پیش کر رہی تھی، بارہ بجے ایک ساربان نے ہمارے لیے قہوہ بنوا کر بھجوایا تھا، قہوہ پینے کے بعد ہم اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔
☆......☆
ایک ہفتے تک وہ جاں گسل سفر جاری رہا اور آٹھویں دن ہزار دقتوں اور پریشانیوں کے آخر کار ہم تھپس کی چٹانوں کے قریب پہنچ گئے۔ اونچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ ہمیں دور ہی سے نظر آ گیا۔ وہ سہ پہر کا وقت تھا، میں نے کہا۔
''میرا خیال ہے کہ اگر ہم تیزی سے سفر کریں تو سورج غروب ہونے سے پہلے وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔''
''نہیں مالک! بظاہر یہ پہاڑیاں بہت قریب محسوس ہو رہی ہیں لیکن یہ کم از کم ایک دن کی مسافت پر ہیں۔''
''بالکل ٹھیک کہا صحرا میں دور کی چیز بھی قریب دکھائی دیتی ہے، بہتر ہے کہ ہم یہیں پڑاؤ ڈالیں اور علی الصبح سفر کا آغاز کر کے چٹانوں تک پہنچ جائیں۔'' ساحر نے کہا۔
ساربانوں نے اونٹ روک کر خیمے لگائے اور ہم لوگ کھانا وغیرہ تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ رات آرام سے گزری، صبح تازہ دم ہو کر اٹھے اور حسب معمول طلوع آفتاب سے قبل سفر کا آغاز کر دیا۔ اغران نے فاصلے کے بارے میں درست کہا تھا یوں لگتا تھا جیسے جیسے ہم بڑھ رہے ہیں تھپس کی پہاڑیاں پیچھے کی طرف ہٹتی جا رہی ہیں۔ آخر دو پہر ڈھلنے کے بعد مختصر قافلہ پہاڑی سلسلے کے نزدیک پہنچ گیا۔ ہم پڑاؤ ڈالنے کے لیے کسی مناسب جگہ کا انتخاب کرنے لگے، اچانک کچھ فاصلے پر ایک غار نظر آیا جس کا دہانہ اتنا بڑا تھا کہ تین گھڑ سوار برابر چلتے

میں یہیں کہیں گر کر تباہ ہو جائے گا اور اس کی تباہی کے بعد جو تابکاری اثرات پھیلیں گے ان سے ہماری زندگیوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔''

ابھی مرزا کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ وقفتاً وہ شعلہ فشاں گول سی چیز بالکل راکٹ کی طرح پرواز کر کے ہماری طرف بڑھی، ہمارا درمیانی فاصلہ کافی تھا لیکن لمحے بھر میں شعلے ہمارے قریب پہنچ گئے، ہم پوری طرح شعلوں کی زد میں تھے اور اس گول سی چیز کا انداز ایسا تھا گویا ہم پر حملہ آور ہونا چاہتی ہے۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تیزی سے ساحر کو ایک جانب دھکا دیا اور خود دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ شعلوں میں لپٹی ہوئی وہ چیز ہمارے سروں کے اوپر سے گزر کر دور تک چلی گئی تھی۔ اگر وہ لمحہ ضائع ہو جاتا تو ہم جل کر راکھ ہو گئے ہوتے۔

''بھاگو......!'' مرزا نے کہا اور ہم اُٹھ کر اپنی کمین گاہ کی طرف بھاگے۔

''میں نے ایسا عجیب منظر آج تک نہیں دیکھا۔'' مرزا سانس بحال کرتے ہوئے بولا۔

''عجیب تر کہو اور اب تمہارا نظریہ غلط ہو گیا ہے کہ وہ کوئی چھوٹا سا تجرباتی مصنوعی سیارہ ہے۔''

''پھر کیا ہے؟''

''تم نے نہیں دیکھا کہ وہ کیا شے تھی؟''

''نہیں یار تم نے اتنی زور سے دھکا دیا تھا کہ کچھ دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا، بہرحال بتاؤ وہ کیا چیز تھی؟''

''وہ ایک کھوپڑی تھی۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کھوپڑی۔۔۔؟''

''ہاں انسانی کھوپڑی۔''

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' مرزا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ وہ انسانی کھوپڑی تھی اور آگ کے شعلے اسی سے بلند ہو رہے تھے۔''

''تمہیں مغالطہ ہوا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ کھوپڑی راکٹ کی طرح فضا میں پرواز کرتی پھرے اور اس سے آگ کے شعلے نکلیں، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ سیارے کی شکل انسانی کھوپڑی جیسی طرز کی بنائی گئی ہو۔''

''میری بات کا یقین کرو وہ سو فیصد کھوپڑی تھی، اس کے دانت، ناک اور آنکھوں کے سوراخ میں نے واضح طور پر دیکھے ہیں۔'' مرزا کسی سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا

''یقین نہیں آتا یہ سائنس کا دور ہے جو بھی تمہاری بات سنے گا ہنسے گا۔''

''دیکھو مرزا، سائنس ابھی کائنات کے ایک ہزارویں حصے کا بھی احاطہ نہیں کر پائی ہے، یہ کائنات ریت میں ڈوبی ہوئی ہے، ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ یہاں کیا ممکن ہے اور کیا نہیں، آج بھی بے شمار اسرار و رموز ایسے ہیں جن کی سائنس کے پاس کوئی توجیہہ نہیں ہے، سائنس دان وہاں بے بس نظر آتے ہیں اور ان کا علم ناکافی ہے۔''

مرزا ساحر قائل سا ہو کر خاموش ہو گیا، گو ہم گفتگو میں مصروف تھے لیکن ہمارے کان اس آواز پر لگے ہوئے تھے، مگر اس کے بعد وہ آواز سنائی نہیں دی تھی اور بقیہ رات خیر و خوبی سے گزر گئی تھی۔ حتیٰ کہ دن نکل آیا، ساربان ساری رات خوف سے بیٹھے کانپتے رہے تھے۔ آخر کار صبح ہو گئی۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ اس خوفناک مقام پر ایک لمحہ بھی رکنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ ایسے دہشت زدہ تھے کہ انہیں میری کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ میں نے انہیں لالچ بھی دیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے انہیں لالچ بھی کوئی ترغیب نہ دے سکا۔ دونوں نے صاف انکار کر دیا۔ آخر جب میں نے بہت اصرار کیا، بھاری لالچ دیا اور تحفظ کا یقین دلایا تو ان کا ارادہ کچھ متزلزل ہوا، وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے پھر معمر ساربان بولا۔

''مالک! ہم اس ہولناک مقام پر قیام نہیں کر سکتے، خواہ آپ ہمیں کتنا ہی بڑا لالچ دیں، ہمیں آپ

گیارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے کہ یکا یک ایسی ہولناک چیخ اور لرزہ خیز چیخ فضا میں گونجی کہ چٹانیں تک لرز اٹھیں، ایسی ہولناک آواز میں نے آج تک نہیں سنی تھی۔ اسے کسی صورت میں انسانی آواز نہیں کہا جاسکتا تھا۔ چیخ کی بازگشت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ دو فلک شگاف چیخیں اور ابھریں، وہ بے شک انسانی آوازیں تھیں۔ دراصل دونوں ملازم اس چیخ کی آواز سن کر خود بھی چیخ پڑے تھے۔ ان کی آنکھیں مارے خوف کے حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں اور وہ پتے کی طرح لرز رہے تھے۔ مرزا بھی حیران اور قدرے خوف زدہ تھا، ہر چند کہ وہ دلیر آدمی تھا لیکن چیخ اتنی بھیانک تھی کہ اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو جائے، مرزا تیزی سے میرے قریب آیا اور بولا۔

''کیا ہوا، کیسی ہولناک چیخ تھی یہ؟''

''میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آیا کہ یہ کیسی چیخ تھی اور اس کا مخرج کہاں ہوگا۔''

''یقیناً یہ بدروحوں کی چیخ تھی، ہم نے سن رکھا ہے کہ ان پہاڑوں میں ایسی ہی بدروحیں گھومتی پھرتی ہیں۔'' ایک ملازم نے کہا۔

''تم لوگ فکر مت کرو، ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، تم لوگ آرام سے لیٹ کر سو جاؤ۔'' میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا پھر میں مرزا کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''کیا کہتے ہو تم کیسی چیخ تھی یہ؟''

''میں اس پر اپنی رائے محفوظ رکھتا ہوں اور بعد میں تمہیں بتاؤں گا۔'' میں خاموش ہو گیا تھا۔ ملازمین مقامی ہی تھے، خوف سے وہ ایک جگہ دبکے رہے تھے۔ بہر حال ماحول پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ ہم لوگ اندر آ گئے تھے۔ پھر میں اور ساحر جاگتے ہی رہے تھے جبکہ دونوں ساربان اپنی اپنی جگہ لیٹ گئے تھے لیکن ان کی بے چینی سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں بے حد خوف زدہ ہیں اور ان کو بھی اس خوف کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ مرزا نے کہا۔

''چلو پھر باہر چلتے ہیں۔'' مرزا نے کہا اور ہم دونوں ایک بار پھر باہر نکل آئے۔ باہر کے ماحول پر سکوت، سناٹا چھایا ہوا تھا، میں نے کہا۔

''اس وقت تم نے کہا تھا کہ تمہاری رائے محفوظ ہے کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ یہ سب کیا تھا؟''

''کچھ نہیں، ایک صوتی دھوکہ۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی آج کل سائنس کا دور ہے، ہر طرف بے شمار ایجادات ہو رہی ہیں، کہیں مصنوعی سیارے بنائے جا رہے ہیں، کہیں کمپیوٹر، مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کسی مصنوعی سیارے کی آواز تھی جو کسی فنی خرابی کے باعث ادھر آ گئی۔''

''ہو بھی سکتا ہے۔''

''ماحول کی پراسراریت تمہارے اوپر بھی اثر انداز ہو رہی ہے میرے دوست، بہر حال میں نے تمہیں اپنی رائے بتا دی ہے۔''

''اچھا میرے سائنسدان، چل تیری بات مانے لیتے ہیں۔''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ہی ایک بار پھر شور کی آوازوں کے ساتھ ہی ایک جگہ سے شعلے بلند ہونے لگے، عجیب وغریب انداز تھا ان شعلوں کا، ہم لوگ خاصے متاثر ہو گئے تھے۔ پھر ایک اور عجیب منظر دیکھا، ان شعلوں کے درمیان فٹ بال کے برابر کوئی گول سی چیز فضا میں معلق ہے، دوری کے سبب اس کی حیثیت کا تعین نہیں کر سکا تاہم یہ ضرور دیکھ رہا تھا کہ شعلے درحقیقت اس گول سی شے میں سے نکل رہے تھے۔ گول سی چیز بار بار فضا میں بلند ہوتی اور واپس زمین تک جا پہنچتی۔ ساحر نے کہا۔

''پارٹنر میں اب بھی اپنے پہلے نظریے پر اٹل ہوں۔ میرے خیال میں یہ ابتدائی مراحل کا کوئی تجرباتی سیارہ ہے اور مصر جوہری توانائی کے استعمال میں ابھی نوآموز ہے، چنانچہ اناڑی پن کے سبب کل پرزوں میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔''

''ممکن ہے تمہارا قیاس درست ہو۔'' میں نے بدستور شعلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر یہ مصنوعی سیارہ ہے اور خراب ہو گیا ہے تو ذرا سی دیر

ثابت ہو۔"

مرزا نے گردن ہلائی اور ہم گڑھے میں اُتر گئے، میں نے ریت پر پڑا ہوا ہاتھ اُٹھایا، جیب سے رومال نکال کر اس کی گرد جھاڑی اور بغور جائزہ لینے لگا، مرزا کی نظریں بھی اس پر جمی ہوئی تھیں، اس نے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاتھ سو فیصد انسانی ہے لیکن اس کی انگلیاں اور ناخن کتنے خوفناک ہیں۔"

"ہوسکتا ہے اس دن یہ کسی ریت میں دبا ہوا ہو، ہوا کے تھپیڑوں کی وجہ سے یہ ریت اس کے اوپر سے ہٹ گئی ہو۔" میں نے کہا، مرزا کی آنکھیں چمکنے لگیں اس نے کہا۔

"میں اس ہاتھ کی حیثیت جان گیا ہوں دوست، یقیناً کسی ممی کا ہاتھ ہے۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے، فراعین تو اپنے مردوں کی حفاظت کے لیے انہیں مسالا لگا کر رکھتے تھے تاکہ وہ خراب نہ ہوں۔"

"لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سرنگ میں ایک سے زیادہ ممیاں موجود ہوں اور کوئی جانور اس ہاتھ کو منہ میں دبا کر یہاں تک لے آیا ہو۔"

میں اس نکتے پر غور کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مرزا نے بڑے پتے کی بات کہی تھی اور ایسا ہونا عین ممکن تھا، میں نے پوچھا۔

"تمہارا ارادہ سرنگ میں داخل ہو کر ممی کو تلاش کرنے کا ہے۔"

"بالکل میرا نظریہ بالکل درست ہے اور اگر اس وقت ہم نے اس پر عمل کرنے میں پس و پیش سے کام لیا تو یہ نہ ہو کہ ہماری ساری عمر پہاڑیوں کی خاک چھانتے ہوئے گزر جائے اور کچھ حاصل نہ ہو۔"

"مجھے سرنگ کے اندر داخل ہونے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہمارے تھیلوں میں خشک خوراک اور پانی سمیت ضرورت کا ہر سامان موجود ہے، کامیابی نصیب ہوئی تو قسمت ورنہ واپس آجائیں گے۔"

ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ہم سرنگ میں داخل ہوگئے۔ انسانی ہاتھ میں نے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا لیکن جیب چونکہ اس کی نسبت چھوٹی تھی اس لیے اس کا خوفناک پنجہ باہر آرہا تھا۔ سرنگ خوب کشادہ تھی اور ہم کسی دشواری کے بغیر آگے بڑھ رہے تھے مگر کچھ دیر بعد سورج کی روشنی نہ رہی اور سرنگ میں تاریکی پھیل گئی اور ہمیں تارچ روشن کرنا پڑی، کچھ اور آگے بڑھے تو دم گھٹنے لگا لیکن کچھ لمحوں بعد یہ کیفیت زائل ہوگئی۔ شاید کسی طرف سے ہوا کی معقول آمد کا انتظام تھا۔ کچھ دور چل کر اچانک مجھے کچھ تبدیلی کا احساس ہوا۔ میں نے تارچ کی روشنی اِدھر اُدھر پھینکی تو معلوم ہوا کہ تازہ کھدی ہوئی سرنگ ختم ہوگئی ہے اور ہم ایسے حصے میں چل رہے ہیں جو پہاڑوں کو کھوکھلا کر کے بنایا گیا ہے۔ یہ امر ہمارے لیے باعث اطمینان تھا کیونکہ قدیم سرنگ کی دریافت سے کامیابی کے امکانات روشن ہوگئے تھے اور ہم کسی بھی وقت اہرام مصر کے دروازے پر پہنچ سکتے تھے۔ قدیم سرنگ شیطان کی آنت ثابت ہوئی، ہم بہت دیر چلتے رہے مگر منزل کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا، یوں لگتا تھا جیسے طویل ترین سرنگ کبھی ختم نہیں ہوگی اور زندگی ختم ہو جائے گی۔ یکا یک ہم دونوں چونک پڑے اور دونوں کے منہ سے حیرت بھری چیخ نکلی۔ ساحر اس کامیابی پر خوشی سے رقص کرنے لگا، سرنگ دراصل ختم ہوگئی تھی اور سامنے کسی فرعون کے مقبرے کا بلند و بالا پھاٹک نظر آرہا تھا جس کے دیو ہیکل کواڑوں پر دلکش نقش و نگار بنے ہوئے تھے، پھاٹک کے دونوں پٹ بھڑے ہوئے تھے لیکن کوئی کنڈا یا قفل نظر نہیں آرہا تھا۔

"پھاٹک کھولنے اور بند کرنے کا کوئی خفیہ سسٹم ہوگا۔" ساحر نے خیال کیا۔

"ہوسکتا ہے دونوں پٹ محض بھڑے ہوئے ہوں، لیکن یہ بات طے ہے کہ ہم نصف کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔"

"سو فیصد کہو، سو فیصد۔" وہ اکڑ کر بولا۔ "اور سرنگ میں داخل ہونے کی تجویز میری ہی تو تھی۔" "یہ

کی پریشانی کا احساس ہے، چنانچہ اس سلسلے میں یہ ہو سکتا ہے کہ یہاں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک بستی ہے، آپ یہاں سے منتقل ہو کر اس بستی کے قریب پڑاؤ ڈالیں اور وہیں سے اپنی مہم جاری رکھیں، اس صورت میں ہم آپ کا ساتھ دے سکتے ہیں ورنہ ہمیں رخصت کی اجازت دی جائے۔''

میں نے ساحر سے مشورہ کیا اور ساربانوں کی بات تسلیم کر لی گئی کہ اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ ہمارے لیے تکلیف وہ امر یہی تھا کہ اصل مقام سے کافی دور چلے جائیں گے۔ ساربان ہماری رضا مندی سے خوش ہو گئے انہوں نے جلدی جلدی سامان سمیٹا اور ہم لوگ قریبی بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ساربانوں کے بیان کے مطابق ہمیں ڈیڑھ میل کے سفر کے بعد بستی کی مسجد کے مینار نظر آنے لگے تھے، ہم نے بستی سے کچھ فاصلے پر ایک پوشیدہ سی جگہ ڈیرے ڈال دیئے۔ ضروری امور سے نمٹ کر ہم ساربانوں کی معیت میں بستی پہنچے تھے۔ شورک نامی بستی ڈھائی ہزار نفوس پر مشتمل ایک صاف ستھری بستی تھی۔ لوگ ملنسار اور مہمان نواز تھے۔ بستی کے قلب میں چند دکانوں اور ایک قہوہ خانے پر مشتمل بازار تھا۔

ہم نے قہوہ پیا اور بستی کا چکر لگانے کے بعد اپنے ٹھکانے پر واپس آ گئے۔ اس دن ہم نے آرام کیا اور اگلے روز علی الصبح ضروری سامان کے ساتھ پہاڑیوں کی جانب روانہ ہو گئے۔ گزشتہ روز ہم نے سرسری طور پر جائزہ لیا تھا لیکن آج ایک ایک جگہ کو بغور دیکھا، تاہم کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی، سوائے اس کے کہ ہر طرف گڑھے اور سرنگوں کے دہانے دکھائی دے رہے تھے۔ جو یقیناً فراعین کے مقبروں کی تلاش میں کھودے گئے تھے، ساحر ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''ان گڑھوں اور سرنگوں میں داخل ہونا بے سود ہو گا کیونکہ بقول تمہارے جن لوگوں نے کھدائی کی ہو گی وہ یا تو ناکام و نامراد واپس لوٹے ہوں گے یا کامیابی کی صورت میں ایک ایک تنکا سمیٹ کر لے گئے ہوں گے۔''

''تمہارا مطلب ہے ہمیں اپنے طور پر کھدائی کرنی چاہیئے۔'' میں نے پوچھا۔

''یقیناً۔''

''لیکن اس کام کے لیے بہت سے مزدوروں کی ضرورت ہو گی، ہم دو آدمی سینکڑوں فٹ کی گہرائی کیسے کر سکتے ہیں اور پھر اس بات کا تعین کون کرے گا کہ ہمیں کس مقام پر کھدائی کرنا چاہیئے جہاں سے کوئی مقبرہ برآمد ہو جبکہ اس کا امکان بھی ہے کہ سینکڑوں فٹ کھدائی کے بعد بھی نتیجے میں کچھ حاصل نہ ہو۔''

''پھر کیا ہونا چاہیئے؟'' ساحر نے پوچھا۔

''سوچ سمجھ کر کام لیا جائے، پہلے جامع منصوبہ بنے گا اس کے بعد کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے اس گڑھے کے نزدیک پہنچ گئے جہاں دو روز قبل داخل ہوئے تھے اور جس کے اندر ایک کشادہ سرنگ نظر آتی تھی، اچانک مجھے خیال آیا کہ گزشتہ شب پراسرار شعلوں کا مرکز یہی مقام تھا، ساحر نے بھی میرے نظریے سے اتفاق کیا اور ہم تیزی سے گڑھے کی طرف بڑھنے لگے۔ گڑھا ٹیوب ویل کی طرح وسیع تھا مگر زیادہ گہرا نہیں تھا، میں نے گڑھے کے اندر نظر ڈالی اور چونک پڑا۔ سرنگ کے دہانے کے قریب کہنی سے کٹا ہوا ہاتھ پڑا تھا جو نہایت بدوضع اور کریہہ المنظر تھا۔ اس کی انگلیاں پتلی اور مڑی تڑی اور کسی حد تک استخوانی تھیں جن کے ناخن لمبے اور بہت تیز دکھائی دیتے تھے، کلائی پر سکڑی سمٹی بدوضع کھال موجود تھی، لیکن وہ ہاتھ صدیوں پرانا معلوم ہوتا تھا، میں نے ساحر کی طرف دیکھا وہ بھی متحیر نظروں سے اس مکروہ ہاتھ کو دیکھ رہا تھا، کچھ دیر بعد وہ کہنے لگا۔

''یار اس روز یہ ہاتھ اس گڑھے میں موجود نہیں تھا۔''

''میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اس دن یہ ہاتھ یہاں نہیں تھا، بہتر یہ ہے کہ اس گڑھے میں اتر کر ہاتھ کی ماہیت و اصلیت معلوم کی جائے۔ ہو سکتا ہے یہ سوکھا ہوا ہاتھ ہماری کامیابی کی راہ میں معاون

نہیں تھا۔ دفعتاً ایک موڑ پر راہداری ختم ہوگئی اور اب ہماری نظروں کے سامنے ایک منقش دروازہ نظر آرہا تھا۔ اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں اور مرزا اندر داخل ہوگئے۔ دراصل کئی گھنٹے اس اجاڑ اور ویران مقام پر گھومتے رہنے کی وجہ سے خوف و دہشت کے اثرات زائل ہوتے جارہے تھے یہ جگہ پہلے سے مختلف تھی اور جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب ہم اصل مقبرے میں پہنچ گئے ہیں اور منزل زیادہ دور نہیں ہے ہم چلتے رہے چلتے رہے اور بے شمار ایوانوں اور غلام گردشوں سے گزرتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ میں نے گھڑی دیکھی ہمیں سرنگ میں داخل ہوئے پورے پانچ گھنٹے گزر چکے تھے اور بلاشبہ اس دوران ہم نے میلوں کا سفر طے کر لیا تھا، ہاتھ پیر جواب دے گئے تھے اور تھکن کا شدید احساس ہورہا تھا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہ اہرام زمین کے اندر کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم خوف زدہ تو نہیں تھے لیکن یہ دیکھ کر جسم میں سنسنی دوڑ جاتی تھی کہ جگہ جگہ انسانی ڈھانچے پڑے ہوئے تھے ان کے سامان سے پتا چلتا تھا کہ وہ ہماری طرح مقبروں اور قدیم نادر اشیاء کی تلاش میں یہاں تک پہنچے اور کسی ناگہانی آفت کا شکار ہوگئے۔

ہمیں فکر میں مبتلا کر دینے والی یہ بات تھی کہ ان کی موت کا کیا سبب رہا ہوگا کہ اتنی آسانی سے خود کو اجل کے حوالے کر دیا اور مقبرے سے باہر نہ نکل سکے۔ دو ڈھانچے تو تازہ معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کی ہڈیوں پر کئی جگہ گوشت چپکا ہوا تھا اور ان سے تعفن بھی پھوٹ رہا تھا۔ مقبرے کے اندر بھٹکتے ہوئے مزید دو گھنٹے گزر گئے۔ اب ہم میں چلنے کی سکت نہیں رہی تھی مگر جیسے تیسے آگے بڑھ رہے تھے، اچانک ہمیں ایک خوفناک حقیقت کا علم ہوا اور زمین گویا پیروں تلے کھسکتی ہوئی محسوس ہونے لگی، واقعہ یہ تھا کہ ہم گھوم پھر کر اسی مقام پر واپس آپہنچے تھے جہاں سے چلے تھے، بہرحال مایوس ہو کر بیٹھ گئے، دونوں نے فیصلہ کیا کہ زندگی کی آخری سانس تک حوصلہ نہیں ہاریں گے اور جدوجہد جاری رکھیں گے مگر سوال یہ تھا کہ واپسی کیسے اور کس راستے سے ہو، پتا ہی نہیں تھا کہ ہم کس طرف جارہے ہیں اور واپسی کے لیے کس طرف کا رخ اختیار کرنا چاہیے۔ ہر مقام شناسا اور ہر جگہ جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی، سب کچھ ہی ایک جیسا لگ رہا تھا، پھر اچانک ایک روشنی سی نظر آئی جیسے کوئی شمع روشن ہوا اور ایک آواز اُبھری۔

''دوستو!''

''ارے یہ کیا، یہ تو اغران غربی کی آواز ہے۔''

''ٹھیک پہچانا تم نے، اس روشنی کے پیچھے پیچھے چلتے رہو، تمہیں تمہاری منزل ضرور ملے گی۔''

میں اور ساحر اس آواز کے سحر میں ڈوبے ہوئے تھے، ہم نے روشنی کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے ہم کافی دور نکل آئے تھے، اس کے بعد اغران غربی کی کوئی آواز نہیں اُبھری تھی۔ بہرحال ہم چلتے رہے، پھر اچانک ہی ہر طرف تیز روشنی پھیل گئی۔ اچانک ہی ایک آواز سنائی دی یہ ہو بہو وہی آواز تھی جو ہمیں چٹانوں کے درمیان سنائی دی تھی اور پھر ایک کھوپڑی جو شعلوں میں گھری ہوئی تھی اور جس نے ہم پر حملہ بھی کیا تھا، وہی کھوپڑی اس وقت ہمارے آگے پیچھے گھوم رہی تھی، یوں لگتا تھا جیسے وہ ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کر رہی ہو، اچانک ہی میں نے محسوس کیا کہ میرے کوٹ میں رکھا ہوا ہاتھ متحرک ہوا ہوا اور پھر اس ہاتھ نے ایک زوردار تھپڑ کھوپڑی پر رسید کیا تھا۔ وہ کھوپڑی دور جا گری تھی، پھر اونچی ہوئی اور ہمارے آگے ایک جگہ گم ہوگئی۔ ہم اور تیز چلنے لگے اور جلد ہی یہ راستہ دوسری جانب گھوم گیا، لیکن جوں ہی ہم مڑے ایک خوفناک اور حیرت انگیز منظر نگاہوں کے سامنے آگیا، ہم ایک پھاٹک نما دروازہ دیکھ رہے تھے جس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے دوسری جانب ایک وسیع حجرہ تھا اور حجرے کے وسط میں ایک سیاہ تابوت رکھا تھا، کھوپڑی بھی اندر موجود تھی اور انتہائی غیض و غضب کے عالم میں معلوم ہوتی تھی، وہ فضا میں پرواز کرتی ہوئی تابوت کے چکر کاٹ رہی تھی اور اس کے قریب پہنچنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی جبکہ کئی ہاتھ اسے

کہہ کر وہ پھاٹک کی طرف بڑھا لیکن نزدیک پہنچتے ہی اچھل کر پیچھے ہٹ گیا، میں نے ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھ کر دیکھا، پھاٹک کی دہلیز پر ایک عجیب انسانی ڈھانچہ پڑا ہوا تھا، عجیب اس لیے کہ اس کے جسم پر جدید طرز کا لباس تھا، بس ہاتھوں اور چہرے سے اس کے پنجر ہونے کا پتا چلتا تھا، مرزا حیرانی سے بولا۔

''عجیب معاملہ ہے یہاں ڈھانچے بھی لباس پہنتے ہیں۔''

''یہ ہماری طرح کسی مقبرے کی تلاش میں یہاں آیا ہوگا اور کسی حادثے کا شکار ہو کر مر گیا۔ میرے خیال میں اسے فوت ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا یہی وجہ ہے کہ جسم گل سڑ کر ختم ہو گیا اور لباس چونکہ مصنوعی ریشے کا ہے اس لیے لباس پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا ہے۔''

''خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ بیچارے غریب نے کن حالات میں دم توڑا ہوگا۔'' میں نے ڈھانچے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''دوست یہاں ہم ڈھانچوں پر تحقیق کرنے کے لیے آئے ہیں کیا؟''

''نہیں تو بالکل نہیں۔''

''تو پھر کیا خیال ہے آگے بڑھیں۔''

''بالکل آگے چلتے رہو۔'' میں نے کہا اور آگے بڑھ کر پھاٹک کے پاس پہنچ گیا، پھاٹک کو زور سے دھکا دیا اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ واقعی اس کے پٹ بھڑے ہوئے تھے۔ پھر ایک زوردار آواز کے ساتھ یہ پٹ کھلتے چلے گئے اور ہم اندر داخل ہو گئے تھے۔ اب ہمارے سامنے ایک وسیع ہال تھا جس کی چھت اور دیواریں پتھروں کو تراش کر بنائی گئی تھیں اور اس میں جگہ جگہ ستون نظر آرہے تھے لیکن اس وسیع ہال میں کہیں بھی کوئی چیز رکھی نظر نہیں آرہی تھی۔ ہر طرف سناٹا اور ویرانی تھی، کوروح فرسا ویرانی نے ہم پر کسی قدر وحشت طاری کر دی تھی، بہرکیف ہم اندر داخل ہو گئے اور ٹارچ کی روشنی میں اطراف کا جائزہ لینے لگے۔ ہال کی بلند و بالا سنگی دیواروں میں چاروں طرف محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ جن کی دوسری طرف کشادہ اور طویل راہداریاں تھیں، ہم محراب سے گزر کر ایک راہداری میں آگے بڑھے جس کے دونوں جانب بے شمار حجرے بنے ہوئے تھے اور ان کے دروازے بند تھے لیکن حسب سابق کوئی قفل وغیرہ نظر نہیں آتا تھا۔

''ایک دروازے کو کھول کر دیکھنا چاہیے۔'' ساحر نے مشورہ دیا۔'' ہو سکتا ہے کوئی تابوت یا اس دور کی کوئی اور شے دستیاب ہو جائے۔''

میں نے ایک دروازے پر ہاتھ رکھا اور وہ باآسانی کھل گیا۔ اندر بھیانک تاریکی کا راج تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ڈالی، خالی کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ دوسرے حجرے بھی اسی طرح خالی تھے جیسے کسی نے جھاڑ و دے کر خوب اچھی طرح صفائی کی ہو، ہاں اگر کچھ تھا تو وہ وحشت ناک سناٹا اور ویرانی تھی جو روح کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''شاید وہ لوگ سب کچھ نکال کر لے گئے۔''

''کون لوگ؟'' ساحر نے چونک کر پوچھا۔

''وہی جو کھدائی کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہوں گے۔''

''ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، کیا واپس چلیں؟''

''جب یہاں تک آئے ہیں تو کچھ اور آگے بڑھ کر دیکھتے ہیں۔''

ہم آگے چل دیئے اور بہت دیر تک چلتے رہے، سرنگ یا راہداری زمین کے اندر ہی اندر نجانے کہاں تک چلی گئی تھی اور سانپ کی طرح بل کھائے ہوئے تھی۔ مرزا کہنے لگا۔

''قدیم مصر کے معماروں اور فن تعمیر کے ماہروں کے فن کی داد دینا پڑتی ہے کہ سنگلاخ چٹانوں کے درمیان کس مہارت سے یہ راہداریاں اور مقبرے وغیرہ تعمیر کیے گئے ہیں۔''

میں نے مرزا کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ چلتے چلتے ٹانگیں شل ہو گئی تھیں اور منزل کا کوئی تعین

انتہا نہ رہی جب صرف آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم مقبرے کے بڑے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہ وہی پھاٹک تھا جہاں سے بھول بھلیوں کا آغاز ہوا تھا، پھاٹک سے نکل کر ہم سرنگ میں داخل ہوئے اور کچھ دیر بعد باہر سے آتی ہوئی سورج کی روشنی دکھائی دی، خوشی سے ہم دونوں کی چیخیں نکل گئیں اس منحوس مقبرے سے ہم بخیر و خوبی نہ صرف باہر نکل آئے تھے بلکہ کامیاب و کامران لوٹے تھے، ہمارے پاس تابوت تھا جس میں مطلوبہ ممی موجود تھی۔

کافی وقت کے بعد تازہ ہوا میسر آئی تھی، تابوت رکھ کر ہم زمین پر لمبے لمبے لیٹ گئے اور پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھرنے لگے اور جب خوب ستا لیے تو تابوت اٹھایا اور پڑاؤ کی طرف چل پڑے، مرزا نے کہا۔

''ارے یہ کیا، وہ ہاتھ کہاں گئے؟'' میں بھی حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن ہاتھوں کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا، بہر حال تابوت لے کر ہم پڑاؤ تک پہنچ گئے، ساربان بڑی بے چینی سے ہمارے منتظر تھے ہمیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہماری طرف لپکے اور ان میں سے ایک کہنے لگا۔

''آقا! ہم آپ کے لیے پریشان ہو گئے تھے آپ کو گئے ہوئے کافی وقت گزر گیا تھا۔''

ہم نے انہیں مختصر واقعات بتائے اور پوچھا ''تم نے کسی کو خبر تو نہیں کی کہ ہم لوگ غائب ہیں۔''

''نہیں ابھی تک تو نہیں کی۔''

''ٹھیک ہے، ہمارے غسل کا بندوبست ہو سکتا ہے۔''

''جی ابھی لیجیے۔'' ساربانوں نے غسل کا بندوبست کر دیا، ہم دونوں خوب نہائے، صاف ستھرا لباس پہنا اور کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر تابوت کی جانب متوجہ ہوئے۔ ساربان غور سے بار بار تابوت کی طرف دیکھ رہے تھے اور بے چین نظر آ رہے تھے آخر جب نہ رہا گیا تو معمر ساربان نے پوچھا۔

''آقا، یہ تابوت کیسا ہے؟''

''اسے ہم ہزاروں برس قدیم ایک مقبرے سے نکال کر لائے ہیں، جیسا کہ کچھ دیر قبل تمہیں بتایا ہے خیر تم جلدی سے بڑا ہتھوڑا لے کر آ جاؤ، اسے کھول کر دیکھتے ہیں۔''

ساربان ہتھوڑا لے آیا، مرزا بہت بے صبری کا مظاہرہ کر رہا تھا اور جلد از جلد تابوت کو کھول لینا چاہتا تھا، اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پوری قوت سے تابوت کے قفل پر ہتھوڑا برسانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں مرزا پسینے سے شرابور ہو گیا اور ہانپنے لگا لیکن قدیم وضع کا قفل ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس کے بعد میں نے ہتھوڑا سنبھالا اور قفل پر ضربیں لگانے لگا لیکن میں بھی تھک کر چور ہو گیا دونوں ساربان باری باری زور آزمائی کر چکے مگر قفل جوں کا توں تھا۔ مرزا کہنے لگا۔

''کیوں نہ اس تالے کو بارودی مواد سے توڑا جائے۔'' میں نے اس تجویز کو پسند کیا تھا اور پھر یہی کیا گیا، بارودی مواد سے قفل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا جبکہ اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ تابوت کو کوئی نقصان نہ پہنچے چنانچہ تابوت حسب توقع صحیح سلامت رہا۔ مرزا میں اب تاب کہاں تھی وہ تیزی سے آگے بڑھا اور تابوت کا ڈھکن کھول دیا۔ تابوت کھلتے ہی یوں لگا جیسے اندر سے چاند طلوع ہو رہا ہو، تابوت کے اندر ایک نہایت خوبصورت ممی موجود تھی جس سے مخصوص ادویات کی عجیب خوشبو نکل رہی تھی۔ مرزا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا، وہ پر مسرت لہجے میں بولا۔

''دوست خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم اغراض غربی کے لیے ممی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔'' میں نے مرزا کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی، میں تو ممی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا، میں نے بیسویں صدی کی عورت کو اتنا خوب صورت نہیں پایا تھا وہ بلا کی حسین تھی اور شاید اپنے دور کی خوبصورت ترین عورت رہی ہوگی، مجھے ایسا لگ رہا تھا گویا وہ مردہ نہیں ہے بلکہ محو خواب ہے کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھولے گی اور قیامت خیز انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوگی۔

تابوت تک پہنچنے سے روک رہے تھے۔ یہ عجیب و غریب پراسرار ہاتھ کہنیوں تک تھے اور بڑی تڑی انگلیوں کے نوکیلے ناخنوں سے کھوپڑی کو نوچ رہے تھے۔ حیران کن امر یہ تھا کہ آگ کے شعلے پراسرار ہاتھوں پر اثر انداز نہیں ہو رہے تھے جبکہ ہم خاصی دور ہوتے ہوئے بھی شعلوں کی تپش محسوس کر رہے تھے۔

کھوپڑی بہت دیر تک تابوت کے گرد چکراتی رہی لیکن اس کے قریب پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکی کیونکہ وہ تمام ہاتھ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے، کھوپڑی ناکام ہی ہو کر باہر نکل آئی، میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ دیکھ سکتی تھی یا نہیں لیکن مجھے محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں کے خوفناک سوراخ ہم پر مرکوز تھے۔ کھوپڑی نے ایک بار پھر ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت کئی ہاتھ آگے بڑھے اور انہوں نے کھوپڑی اور ہماری درمیان ایک دیوار سی بنالی۔ کھوپڑی بہت مشتعل نظر آرہی تھی پھر اس نے بے بس ہو کر راہ فرار اختیار کر لی اور جس طرف سے آئی تھی اسی جانب چیختی چنگھاڑتی ہوئی چلی گئی، ہاتھ اب بھی اس کے تعاقب میں تھے۔

کھوپڑی کے جاتے ہی مقبرے میں ہولناک تاریکی پھیل گئی، ہماری ٹمٹاتی ہوئی ٹارچ کی روشنی بالکل ماند پڑ گئی تھی اور وہی قبر کا سناٹا چھا گیا تھا میں اور مرزا حیران و ششدر کھڑے تھے مرزا کی پر تحیر آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی وہ کہہ رہا تھا۔

''وہ خواب تھا کہ فریب نظر؟''

''خدا ہی بہتر جانتا ہے، اس طلسم خانے میں جو نہ پیش آئے وہ کم ہے۔'' یہ کہہ کر ٹارچ کی مدہم روشنی کا رخ میں نے حجرے کی جانب کر دیا وہاں تابوت اسی جگہ اور اسی حالت میں موجود تھا، مرزا کہنے لگا۔

''دوست...... میرے نظریے کے مطابق اس تابوت میں کوئی ممی موجود ہے ہزاروں برس قدیم کسی فرعون کی ممی۔''

''شاید......'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا، بہرطور قریب سے چل کر دیکھتے ہیں۔''

منقش دروازے سے گزر کر ہم لوگ حجرے میں داخل ہو گئے، جہاں تابوت کے سوا اور کوئی چیز موجود نہیں تھی، تابوت بالکل سیاہ اور بہت لمبا تھا اور اس کے کنڈے میں ایک وزنی اور مضبوط قفل لٹک رہا تھا میں کئی سنٹ تک تابوت کا جائزہ لیتا رہا میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مرزا بول پڑا۔

''دوست ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں بلا شبہ یہ تابوت اسی دور سے تعلق رکھتا ہے اور تم دیکھو کتنی عجیب بات ہے جب ہم تھک کر مایوس ہو گئے تھے تو ہماری رہنمائی کی گئی اور اب ہم اس کے پاس موجود ہیں۔''

''مگر سوال یہ ہے کہ ہم اس تابوت کو باہر کیسے لے جائیں گے۔؟''

''تم تو میری ہمت بڑھا رہے تھے اب خود مایوس ہو گئے ہو۔''

اچانک میں چونک پڑا اور حقیقت حال کچھ واضح ہونے لگی، ہم سے کچھ قدم کے فاصلے پر وہی شمع روشن ہو گئی تھی جو اس ہنگامے میں کہیں گم ہو گئی تھی، اس شمع کو دیکھ کر ہم دونوں کی ہمت بندھی اور پھر اچانک ہی ایک آواز ابھری۔

''دوستو! آپ بالکل صحیح جگہ پہنچ گئے ہیں۔ فکر نہ کریں یہ شمع اور پراسرار ہاتھ آپ کی بھرپور مدد کریں گے۔''

ہم دونوں بری طرح چونک پڑے تھے، میں نے مرزا سے کہا۔

''مرزا میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہمیں ہمت کرنی چاہئے۔'' اور پھر ہم نے اس تابوت کو اٹھانے کی کوشش کی، خاصا وزنی تابوت تھا لیکن پھر یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کہیں سے اچانک ہی کچھ ہاتھ نمودار ہوئے تھے اور انہوں نے تابوت اٹھانے میں ہماری بھرپور مدد شروع کر دی۔ اس سارے ہنگامے میں کافی وقت صرف ہو چکا تھا۔ بہر حال ہم تابوت اٹھائے چلنے لگے، شمع ہماری رہنمائی کر رہی تھی، پھر اس وقت ہماری مسرت کی

ممی کا پورا جسم پٹیوں سے بندھا ہوا تھا بس چہرہ اور گردن کا کچھ حصہ کھلا ہوا تھا، میں نے اپنی انگلی اس کے رخسار پر رکھ دی اور ذرا سا دبایا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا اس کا جسم گوشت پوست کا نہیں تھا بلکہ وہ تو لکڑی کا کوئی مجسمہ معلوم ہو رہی تھی میں متعجب نگاہوں سے تابوت میں رکھی ہوئی ممی کو گھورنے لگا، مرزا حیرانی سے میری جانب دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا بھئی، تم اس قدر حیرت زدہ کیوں ہو؟''

''ویسے تو ہر بات ہی پراسرار ہے لیکن تم اسے ہاتھ لگا کر دیکھو، یہ تو لکڑی کا کوئی مجسمہ لگتی ہے۔''

''لکڑی کا مجسمہ؟''

''ہاں۔''

''مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے، یہ بڑی مہمل سی بات ہے کہ ایک لکڑی کی ممی کو حنوط کر کے تابوت میں رکھ کر مقبرے میں دفن کیا جائے۔''

''مجھے تفصیلات کا علم نہیں، لیکن ایک کام کیا جاسکتا ہے کہ کسی مصریات کے ماہر سے اس کا راز معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔''

''آپ کا خیال درست ہے آقا، محمود داؤدی اس سلسلے میں سب کچھ جانتے ہوں گے۔ آپ کو ان سے ملاقات کرنی چاہیے۔''

''محمود داؤدی؟''

''وہ بہت عالم فاضل انسان ہیں، ان کی عمر ایک سو بیس برس کے لگ بھگ ہے، دنیا کے بیشتر علوم پر دسترس رکھتے ہیں اور قدیم مصر پر ان کا تجربہ اور معلومات بہت وسیع ہیں اور وہ قدیم مصر کے ایک ایک لمحے کا حال جانتے ہیں۔''

مرزا نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔''تم انہیں جانتے ہو؟''

''انہیں کون نہیں جانتا، وہ مشہور ہستی ہیں اور اس بستی میں ہی رہتے ہیں۔''

''تو ہمیں ابھی اور اسی وقت ان سے ملنا ہے، تم ہمیں ان کے پاس لے چلو اور تمہارا ایک ساتھی یہاں اس تابوت کے پاس رہے گا اور یہ اس کی حفاظت کرے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ساربان فوراً تیار ہوگیا، ہم نے دوسرے ساربان کو تابوت کے قریب ٹھہرنے کی ہدایت کی اور تابوت کا ڈھکن بند کر کے ساربان کی معیت میں بستی کی طرف روانہ ہوگئے۔

☆......☆

محمود داؤدی کا مکان آبادی کے وسط میں تھا اور خاصا خوش نما نظر آتا تھا، اطلاع ملنے پر ہمیں فوراً بلالیا گیا۔ محمود داؤدی اس وقت کتب خانے میں تھے اور مطالعے میں غرق تھے ہم نے دیکھا کہ سر اور داڑھی کے بالوں کے ساتھ ساتھ بھنوؤں اور پلکوں کے بال بھی سفید تھے اور بلا شبہ سوا سو برس کے نظر آتے تھے مگر مضبوط اور صحت مند جسم کے مالک تھے ہمیں دیکھتے ہی وہ پذیرائی کے لیے اُٹھے اور حلیم و شیریں لہجے میں کہنے لگے۔

''میں اجنبی مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔''

انہوں نے ہم سے معانقہ کیا پھر عزت و احترام سے بٹھایا اور ملازم کو قہوہ لانے کی ہدایت کی، میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

''حضرت آپ کی بہت تعریف سنی ہے، اس لیے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور ہم قدم بوسی کے لیے حاضر ہوگئے۔''

''میں کیا اور میری تعریف کیا، میں تو پیارے نبیؐ کا ادنیٰ غلام ہوں، تمام دلچسپیاں ختم کردیں، اب تو ذات مقدسہ کی تعلیم و تشریح پر حقیر خدمات انجام دے رہا ہوں، بہر کیف آپ حضرات اپنی آمد کا مقصد بیان کیجیے۔''

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ قدیم مصری تاریخ پر مکمل عبور رکھتے ہیں اور دور فراعین کے ایک ایک لمحے سے واقف ہیں۔''

''زیادہ مبالغے سے کام نہ لو، ہاں اس ضمن میں تھوڑا بہت علم رکھتا ہوں، میرے پاس مصریات پر تقریباً ڈیڑھ سو قدیم و جدید کتابیں موجود ہیں جو مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہیں اس کے علاوہ جوانی کے زمانے

بادشاہ کی سواری قریب پہنچی تو حسینہ نے دلفریب تبسم کے ساتھ فرعون کی طرف دیکھا اور مودبانہ لیکن غرور آمیز انداز میں نازک کلائی اٹھا کر سلام کیا۔
فرعون ایک تجربہ کار شکاری تھا اس نے حسن وشباب کے اس مرقع کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس نے فوراً ایک مصاحب سے پوچھا۔
''یہ حسینہ کون ہے؟''
''یہ شہزادی شریس ہے، عالی مرتبت۔''
''شہزادی۔ کہاں کی شہزادی''
''وہ بہت بڑی ساحرہ ہے خداوند عالم اور خود کو شہزادی کہلواتی ہے۔''
''کیا وہ علم سحر سے واقف ہے؟''
''وہ اس فن میں طاق ہے ذات اقدس۔'' مصاحب نے جواب دیا'' وہ مشہور کاہن کی بیٹی ہے۔''
''مگر وہ مر چکا ہے؟''
''بجا ارشاد فرمایا۔ یہ اپنے باپ کی جگہ گدی نشین ہوئی ہے۔''
فرعون سوچ میں ڈوب گیا پھر ایک دوسرے مصاحب کی طرف اشارہ کر کے بولا۔
''یہ حسینہ ہمارے محل کی زینت بننے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔''
''حکم کی تعمیل ہو گی شہنشاہ معظم۔'' نائب نے جواب دیا۔
فرعون شریس کی نظر کا ایسا گھائل ہوا تھا کہ فوراً واپسی کا حکم دیا اور شریس کا انتظار کرنے لگا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے، فرعون بے چینی سے اپنی خوابگاہ میں ٹہل رہا تھا، شریس اس کے دل ودماغ پر بُری طرح مسلط ہو گئی تھی، اس پری جمال نے بادشاہ کا سکون غارت کر دیا تھا۔ اسے اپنے مصاحب پر غصہ آرہا تھا جو ابھی تک شریس کو لے کر نہیں پہنچا تھا۔ اس نے اپنے مشیر خاص کو طلب کیا اور حکم دیا کہ فوراً معلوم کیا جائے کہ اس کا نمائندہ کہاں ہے اور اس نے ابھی تک ہمارے حکم کی تعمل کیوں نہیں کی۔
نصف شب کے بعد اس کے مشیر نے باریابی کی اجازت چاہی، فرعون نے اسے اندر بلالیا، مشیر گھبرایا ہوا تھا۔ ڈرتے ڈرتے بولا۔
''حضور میں بدنصیب اس خبر کو لانے کا باعث بن رہا ہوں کہ آپ کے قاصد کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کے ایک سو ٹکڑے شہر کے باہر کوڑے کے ڈھیر پر پڑے ہیں۔''
''کیا؟'' فرعون غیض وغضب کے عالم میں چیخ پڑا۔'' اسے کس نے قتل کیا؟''
''کچھ پتا نہیں چلتا عالم پناہ۔''
''کیا بکتا ہے؟'' فرعون غصے سے شیر کی طرح دھاڑا۔'' ہماری سلطنت میں ایسا کون ہے جو ہم سے برتر ہو اور ناقابل شکست سمجھا جائے۔ اگر یہ اس شریس کی حرکت ہے تو ہم اسے سزا دیں گے۔ تم اسی وقت ایک فوجی دستہ تیار کرو اور شریس کی قیام گاہ تک جاؤ، اس کے محل میں آگ لگا دو اسے مسمار کر دو اور شریس کو پابہ زنجیر کر کے ہمارے حضور میں پیش کرو۔''
''جو حکم خداوند عالم، لیکن ۔۔۔''
''حکم کی فوری تعمیل کی جائے۔'' فرعون اور غضبناک ہو گیا۔'' تم ساحرہ سے خوفزدہ ہو گیا؟''
''نہیں شہنشاہ معظم۔'' مشیر نے کہا اور الٹے قدموں واپس جانے لگا۔
''ٹھہرو! بادشاہ نے نرم لہجے میں کہا وہ خود چند قدم چل کر مشیر کے پاس پہنچا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
''ہم اپنا سابقہ حکم واپس لیتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ حسین شریس ہمارے خلوت کدے میں داخل ہو تو ملول اور سنجیدہ نظر آئے۔ ہم خود اس کے پاس چل رہے ہیں۔ فوراً شاہی سواری تیار کرائی جائے۔''
مشیر بادشاہ کی تلون مزاجی سے واقف تھا، اس نے اسی وقت شاہی رتھ جڑوا دیا اور فرعون شریس کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ شریس اس وقت محو خواب تھی، خدام نے بادشاہ کی آمد کی اطلاع دی تو اس کے ہونٹوں پر سحر انگیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس

میں گائیڈ کے فرائض بھی انجام دیتا رہا ہوں۔"

محمود داؤدی کی گفتگو حوصلہ افزا تھی، چنانچہ میں نے شروع سے آخر تک تمام واقعات ان کے گوش گزار کر دیئے، میں نے دیکھا کہ محمود داؤدی کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں انہوں نے پر اشتیاق اور پر تجسس لہجے میں کہا۔

"اوہ... تو گویا تم وہ لکڑی کی ممی دریافت کر چکے ہو؟"

"ہم نے جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ تابوت حاصل کیا ہے اور اب اس سلسلے میں کچھ جاننے کیلئے بے چین ہیں۔"

محمود داؤدی کہنے لگے "اگر تم مقبرے میں داخل ہونے سے پہلے مجھ سے ملاقات کر لیتے تو مصیبتوں میں گرفتار نہ ہوتے، مقبرے تک پہنچنا بہت آسان ہے۔ میں تمہارے بیان کردہ مقبرے اور ممی کا ذکر پرانی کتابوں میں پڑھ چکا ہوں، تم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ لفظ بہ لفظ درست معلوم ہوتا ہے۔ تم نے وہاں بے شمار ستون دیکھے ہوں گے وہ ستون رہبری کا کام کرتے ہیں منزل تک پہنچنے کے لیے ان ستونوں کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔"

"ہمیں افسوس ہے کہ اس سے قبل آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔" میں نے تاسف کا اظہار کیا "بہر طور ابھی آپ نے فرمایا کہ قدیم کتابوں میں اس مقبرے اور ممی کی تفصیل پڑھ چکے ہیں، چنانچہ اگر ہمیں بھی تفصیلات سے آگاہ فرمائیں تو بے حد شکر گزار ہوں گے۔"

بزرگ کی آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں پھر وہ کہنے لگے۔ "وہ ملکہ شریس کی ممی ہے اب سے تین ہزار قبل مسیح قبل فرمانروائے وقت فرعون مائیس نے اپنے سحر کے ذریعے اسے لکڑی کا بنا دیا تھا بلکہ شریس چونکہ رعایا میں مقبول تھی چنانچہ فوری ردعمل سے بچنے کے لیے اس نے ملکہ کی موت کی خبر مشہور کر دی اور رسوم کے مطابق حنوط کر کے اسے مقبرے میں رکھ دیا۔" میں اور مرزا حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، محمود داؤدی پھر گویا ہوئے۔

"فرعون مائیس ایک تلون مزاج حکمران تھا، تاریخ میں جابجا ایسے واقعات ملتے ہیں جب وہ کسی پر سخت ناراض ہوا اور پھر اس کو انعام و اکرام سے نواز دیا۔ یا کسی پر بہت زیادہ مہربان ہو گیا لیکن کسی روز اچانک اسے تختہ دار پر لٹکا دیا۔ بادشاہ کی اس فطرت کے باعث وزراء، امراء خوفزدہ ہی رہا کرتے تھے کہ نامعلوم کس وقت کیا کر بیٹھے۔ مائیس کو دور فراعین کا عیاش اور رنگین مزاج حکمران تسلیم کیا گیا ہے۔ جنس کے معاملے میں وہ نہایت کمزور کردار کا مالک تھا۔ قدیم مصری حکمرانوں کی تاریخ میں اسے دیوانہ کہا گیا ہے اس نے کافی عمر تک شادی نہیں کی اس کا وطیرہ تھا کہ جو خوبصورت عورت دیکھتا یا اپنے مصاحبین سے جس لڑکی کی تعریف سنتا اسی رات اسے اپنے عیش کدے میں اٹھوا لیتا اور شب بھر خوشہ چینی کے بعد انعام و اکرام سے نواز کر اسے واپس گھر بھیج دیتا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے ایک عورت کی دوسری بار کبھی خواہش نہیں کی۔ اس کے شبستان میں ہر رات ایک نئی جوانی جلوہ گر ہوتی۔ رعایا اپنے حکمران کی اس بدعادت سے بہت خوفزدہ تھی مگر کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ تھی، اس کا دستور تھا کہ روزانہ شام کے وقت اپنے شاہی رتھ میں شہر کے گشت کو نکلتا، مصاحبین اور جی حضور قسم کے لوگ ساتھ ہوتے اور فرعون کو جو عورت پسند آتی اس کی طرف صرف اشارہ کر دینا کافی ہوتا اور اسی رات وہ فرعون کی آرام گاہ میں پہنچا دی جاتی۔

ایک روز بادشاہ حسب معمول مصاحبین کے جلو میں شہر کے گشت کو نکلا تو مقابل سے ایک بے حد خوبصورت بگھی آتی نظر آئی، بگھی میں اعلیٰ نسل کے سولہ گھوڑے جتے ہوئے تھے جن کی راسیں کسی باوردی کوچوان کے ہاتھ نہیں تھیں بلکہ ایک حسین و جمیل اور نازک اندام عورت گھوڑوں کو ہانک رہی تھی وہ حسن وشباب کا بے مثال امتزاج تھی، اس کے بالوں کی سیاہ لٹیں پیشانی اور رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ وہ بڑی تمکنت سے اپنی جگہ بیٹھی تھی اور پر وقار انداز میں مسکرا کر ادھر ادھر دیکھتی جا رہی تھی۔

''اوہ...... شادی۔'' فرعون مضطرب نظر آنے لگا، ''دراصل ہم نے کبھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا۔''

''اب غور فرمالیں، شہنشاہ معظم، میری رائے میں آپ کو کسی سے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شرلیس نے جواب دیا۔

''ہاں ...... ہمیں سوچنے دیجیے۔'' فرعون اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

شرلیس بادشاہ کی کیفیت دیکھ رہی تھی وہ اس کی اندرونی کشمکش سے واقف تھی ادھر فرعون نے جلد فیصلہ کرلیا اور شرلیس کی کلائی تھام کر جذباتی لہجے میں بولا۔

''ہم نے محسوس کیا ہے کہ واقعی آپ سے محبت کرنے لگے ہیں۔ ہم آپ کو اپنی ملکہ بنانے کے لیے تیار ہیں اور کل ہی شادی کی رسوم انجام پائیں گی۔ ہم انتظار نہیں کرسکتے۔'' یہ کہہ کر فرعون نے اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا اور رخصت ہوگیا۔

اتنا کہہ کر محمود دادی رک گئے تھے اور ہم دونوں محویت سے سب کچھ سن رہے تھے۔ اس نے پھر کہنا شروع کردیا۔

''یہ کہانی گوئی کا انداز بھی خوب ہے، لگتا ہے ہم وہیں کہیں ان کرداروں کے درمیان موجود تھے۔ بہر حال دوسرے دن ان دونوں کی شادی کی رسومات ادا کی گئیں اور شرلیس باضابطہ طور پر فرعون کی دلہن بن گئی پھر اس کے بعد عیاش فرعون کی داستان یوں ہے کہ کچھ ہی عرصے کے بعد فرعون کا دل ملکہ سے بھر گیا اور وہ کسی نئی عورت کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا۔ اس کے مصاحبین نے اس کو بہترین راہ دکھائی۔ اس نے محل کے خفیہ حصے میں مصاحبین سے رابطہ قائم کیا اور انہوں نے شہنشاہ کو نوخیز کلیاں فراہم کرنا شروع کردیں۔ ظاہر ہے ان کے انعام واکرام کا سلسلہ جو ملکہ سے شادی کے بعد ختم ہوگیا تھا ایک بار پھر شروع ہوگیا تھا۔ ملکہ ساحرہ تھی اور یوں بھی تمام امور پر نظر رکھتی تھی۔ چنانچہ اسے بادشاہ کی رنگینیوں کا علم ہوگیا۔ اس نے فرعون سے شکایت کی جس کے جواب میں فرعون نے اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرعون کا ہاتھ لکڑی کا ہوگیا، جب اسے احساس ہوا کہ اس نے کیا غلطی کردی ہے تو فرعون نے اس سے معافی مانگی اور اس کا ہاتھ واپس گوشت پوست کا ہوگیا۔ لیکن فرعون نے اس سے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ فرعون نے اپنے مشیر دن سے مشورہ کیا۔ جنہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ خود جادو سیکھ لے۔ فرعون نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور جادو سیکھنا شروع کردیا۔ اب وہ بہترین جادو سیکھتا جارہا تھا۔ ادھر ملکہ نے فرعون سے بدلہ لینے کی خاطر ایک سپاہی سے تعلقات بڑھانا شروع کردیئے اور وہ اس کے بہت قریب آگیا۔ ملکہ نے اسے اپنی جانب راغب کرنا شروع کردیا کہ وہ بادشاہ بننے کے قابل ہے لیکن فرعون نے مکمل علم سیکھ لیا تھا اور پھر ایک دن فرعون نے موقع پاکر دھوکے سے ملکہ کو لکڑی کا بنا دیا۔ ملکہ کی موت کا مشہور کر کے بادشاہ نے اسے پورے جاہ و جلال کے ساتھ دفنا دیا۔ پورے ملک پر بادشاہ کی حکومت تھی۔ لیکن ملکہ کا وفادار سپاہی ان سب باتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے بادشاہ کے خلاف لوگوں کو جمع کیا اور وقت کے کاہن اعظم کے پاس پہنچا وہ کاہن بھی بادشاہ کے خلاف تھا، کاہن نے اس سپاہی کو بتایا کہ بادشاہ کی موت صرف ایک تلوار سے ممکن ہے وہ تلوار ایک خاص جگہ سے مل سکتی ہے، بڑے جتن کیے گئے اور وہ تلوار حاصل کرلی گئی۔ پھر سپاہی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بادشاہ پر شب خون مارا اور تلوار کی مدد سے اس کی گردن تن سے جدا کردی۔ بس اس کے بعد سے بادشاہ کی روح اب بھی ملکہ کے پیچھے ہے اور اس سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔ لیکن اب تم لوگوں نے اس ملکہ کی لاش کو حاصل کرلیا ہے تو اس کی بھرپور حفاظت کرنا ہوگی۔ تم وہاں اس لاش کے پاس مناسب حفاظت کا بندوبست کرکے آئے ہوتا۔''

اچانک ہی ہمیں خیال آیا کہ وہاں تو صرف ایک ساربان موجود تھا، ہم دادی سے اجازت لے کر جلدی سے اس جگہ پہنچے جہاں وہ ساربان اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔ تابوت کا ڈھکن کھلا ہوا تھا اور

نے حکم دیا کہ بادشاہ کو عزت و احترام کے ساتھ یہیں پہنچا دیا جائے۔ فرعون خوابگاہ میں داخل ہوا تو اس کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی اپنی آرام گاہ بھی اتنی نفیس اور آراستہ نہیں تھی بادشاہ کو دیکھ کر شریس نے ایک قیامت خیز انگڑائی لی، وہ ادائے ناز کے ساتھ چھپر کھٹ سے اٹھی اور بادشاہ کی پذیرائی کیلیے باوقار انداز میں آگے بڑھی، دوسرے ہی لمحے اس کی شیریں اور نغمہ آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

''خوش آمدید شہنشاہ، جناب نے کیوں آنے زحمت گوارا فرمائی، ناچیز کو یاد فرمالیا ہوتا۔''

''ہم آپ کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے تھے اس لیے خود ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔''

''زہے نصیب، تشریف رکھیے۔''

بادشاہ ایک مرصع کرسی پر دراز ہو گیا، شریس نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے آراستہ چھپر کھٹ پر آ گئی اور فرعون کی طرف رُخ کر کے بیٹھ گئی۔ انداز ایسا تھا کہ فرعون کے دل پر بجلیاں گر رہی تھیں اور اس کے جسم کا ایک ایک گوشہ نظروں کے سامنے وا تھا، فرعون سوچنے لگا ہم نے اب تک کچھ نہیں پایا اور جو چیز لائق حصول تھی وہ اب تک کیوں نہ حاصل کی گئی۔ اسی وقت شریس نے ملازمہ کو طلب کیا اور ان کیلیے مشروب مہیا کر دیا۔ شریس کہنے لگی۔

''یہ میری خوش بختی ہے کہ شہنشاہ نے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا، میں پوچھ سکتی ہوں کہ مجھے کیونکر مزید خدمت کی سعادت نصیب ہو سکتی ہے۔''

فرعون نے ایک ہی سانس میں مشروب کا گلاس خالی کر دیا، اس نے آگے بڑھ کر شریس کا ہاتھ تھام لیا اور جذباتی انداز میں کہنے لگا۔

''آپ نے ہمارے دل کا سکون لوٹ لیا ہے شہزادی، آپ بلاشبہ شہزادی ہیں، آپ اتنی حسین ہیں کہ آپ کی تعریف کے لیے ابھی الفاظ ایجاد نہیں ہوئے، گلوں، ستاروں اور ماہتاب وغیرہ سے تشبیہ دینا آپ کے بے مثال حسن کی تذلیل ہے، ہم آپ کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ آپ سے محبت کرنے لگے ہیں۔''

شریس معنی خیز انداز میں مسکرائی اور بولی ''ایک رفاقت کی محبت۔''

''ہم آپ کی ہر خواہش پوری کریں گے، آپ کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی تعمیل ہو گی۔'' شریس کچھ نہیں بولی بس مسکراہٹ کے ساتھ بادشاہ کی طرف دیکھتی رہی۔ فرعون اس مسکراہٹ کو رضامندی سمجھا اور سرک کر اس کے قریب پہنچ گیا اور اسے چھونے کی کوشش کی تو شریس سمٹ کر بیٹھ گئی، فرعون کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ظاہر ہوئے لیکن جلد ہی زائل ہو گئے اور وہ بانہیں پھیلا کر بولا۔

''شرماؤ مت، جانِ ماہمن اور خود کو ہماری آغوش میں بکھیر دو، ہم تمہیں نہال کر دیں گے۔''

''عالی مرتبت، میں معذرت خواہ ہوں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔''

''کیا؟ جانتی ہو ہمارے حکم سے سرتابی تمہیں مشکلات میں مبتلا کر سکتی ہے۔''

''میں اپنے اصولوں کے مقابلے میں کسی سزا کی پروا نہیں کرتی۔'' شریس نے تحمل کے ساتھ شیریں لہجے میں کہا۔ ''میں ایک پاکدامن عورت ہوں اور اپنے تقدس کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔''

فرعون کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ لیکن اپنی فطرت کے مطابق جلد ہی اس کی کیفیت بدل گئی۔ وہ سابقہ حالت میں آ گیا اور نرم لہجے میں کہنے لگا۔

''کوئی خیال نہ کرنا شہزادی شریس، ہم ذرا جذباتی ہو گئے تھے۔ دراصل ہم نے سیکھا ہی نہیں کہ ہماری زبان سے کوئی لفظ نکلے اور کوئی اسے مسترد کر دے۔ آپ پہلی خاتون ہیں جس کی سرکشی برداشت کرنے میں ہم لطف محسوس کرتے ہیں تاہم یہ ضرور معلوم کرنا چاہیں گے کہ آپ کے اصول کیا ہیں اور آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''میں عرض کر چکی ہوں کہ میں ایک حیادار اور باعصمت عورت ہوں، اگر آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں، مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور میرے لیے بے قرار ہیں تو اس کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے شادی۔''



درگاہ کا مجذوب

احمد سجاد بابر

پُراسرار نمبر کے لیے ایک بہت اچھوتی یادگار داستان جو یقیناً آپ بھلا نہ پائیں گے

لق ودق، انگارہ بنے صحرا میں وہ شخص زندگی بچانے کے لیے دوڑ رہا تھا، عربی چغے میں ملبوس ہانپتا ہوا وہ دوڑے چلا جا رہا تھا، سانس تھا کہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور قدم تھکان کے مارے ڈھیلے پڑ رہے تھے، وہ زخمی بھی تھا مگر وہ رُک نہیں سکتا



لاش غائب تھی میں نے ساربان سے کہا۔
''کیا ہوا۔لاش کہاں ہے؟''
''وہ...... وہ طوفان آیا تھا، وہ شدید ریت کا طوفان تھا لیکن کیا آپ لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ علم نہیں۔''
''نہیں ،ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔''
''لیکن میں سمجھ رہا ہوں، بادشاہ نے لاش حاصل کر لی ہے اور اب وہ اسے کہاں لے گیا ہوگا۔''
''شاید اسی جگہ جہاں سے ہم نے اسے حاصل کیا تھا۔''
''ہاں میرے بچو، وہ لاش کو اسی جگہ لے گیا ہے اور میں تمہیں بتاؤں کہ اسی جگہ وہ تلوار اور تمام چیزیں مل سکتی ہیں کیا تم میرے ساتھ اس جگہ چلو گے؟''
سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے تھے، محمود داؤدی سامنے موجود تھا، اس نے سب کو حیران کر دیا تھا۔ پھر میں نے کہا۔
''جی ہم تیار ہیں۔''
''تو پھر آؤ میرے ساتھ۔'' محمود داؤدی نے کہا اور ہم سب ان کے ساتھ چل پڑے۔ راستوں کا کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ لمحوں میں وہ فاصلے طے ہوئے تھے۔ ہم لوگ اندر پہنچ گئے اور پھر اس جگہ تک جہاں ایک بڑے سے ہال میں ایک چبوترے پر ملکہ کی لاش رکھی ہوئی تھی اور ایک کھوپڑی اس کے گرد چکرا رہی تھی ۔ وہ کھوپڑی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی ۔ محمود داؤدی نے کہا۔
''اس ہال کے ایک دَر میں وہ تلوار موجود ہے۔ تلاش کرو اچھی طرح تلاش کرو۔''
میں نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور ہم دونوں وہ تلوار تلاش کرنے لگے، پھر ایک دَر میں مجھے ایک بکس رکھا ہوا نظر آیا اور میں نے لپک کر بکس کھولا تو اس میں تلوار موجود تھی، میں نے تلوار نکال لی عین اسی وقت اس کھوپڑی نے مجھ پر حملہ کر دیا اور نتیجے میں تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ عین اسی وقت محمود داؤدی صاحب آگے بڑھے اور انہوں نے کھوپڑی پر ایک ہاتھ مارا اور وہ اُڑتی ہوئی دور جا گری، پھر اٹھی اور ہوا میں لہرانے لگی۔ محمود صاحب نے تلوار اٹھائی اور اس کھوپڑی کے عین درمیان کھینچ ماری، تلوار کھوپڑی کے بیچوں بیچ ترازو ہو گئی تھی اور اب کھوپڑی میں سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کھوپڑی میں آگ لگ گئی تھی اور وہ دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ تلوار میں ایسی ہی کوئی طلسمی طاقت تھی جس کی وجہ سے کھوپڑی تباہ و برباد ہو گئی تھی پھر وہ ایک راکھ کا ڈھیر رہ گئی۔ عین اسی وقت ایک اور تماشا ہوا۔ لکڑی کی ملکہ نے اپنی جگہ سے جنبش کی تھی اور اس کا جسم پوری طرح اپنی اصل حالت میں آگیا تھا۔ اچانک ہی اس کی آواز اُبھری۔ زبان نہ سمجھ میں آنے والی تھی لیکن محمود داؤدی نے اس کا ترجمہ بتایا۔
''میرے محسنو! تم نے میری لاش کو تلاش کر لیا اور میرا مقصد پورا کر دیا۔ تم سے کیا گیا وعدہ پورا کیا جائے گا بس ایک کام اور کر دو میری لاش کو پرانے اہرام میں رکھوا دو۔ یہ شخص جانتا ہے کہ میں کس پرانے اہرام کی بات کر رہی ہوں۔'' ملکہ نے داؤدی کی طرف اشارہ کیا اور داؤدی نے سر ہلا دیا۔
''بس میری زندگی تمام ہوئی۔'' یہ کہنے کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر ہم نے اس کی وصیت کے مطابق اس کی لاش کو اس جگہ رکھوا دیا تھا۔ ظاہر ہے اب یہاں رکنا بیکار تھا۔
دو دن بعد ہم اپنے ملک واپس جا رہے تھے، اپنے گھر پہنچ کر ہم نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ مرزا نے کہا۔
''لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔''
''بدھو کیوں؟'' میں نے مرزا سے کہا'' مجھے یقین ہے کہ بقایا رقم بھی آگئی ہوگی۔ ذرا بینک سے کنفرم تو کرو۔''
مرزا نے بینک فون کر کے رقم کا پتا کیا اور بینک منیجر نے خوشخبری دی کہ دو دن پہلے دونوں کے اکاؤنٹ میں رقم آئی ہے۔ ہم حیران رہ گئے تھے، پھر ہم نے اپنے بُرے کاموں سے توبہ کر لی اور رقم سے ایک اچھے کاروبار کرنے کے ساتھ زندگی گزارنے لگے۔

☆☆☆

تاحدِ نظر تپتی ریت ہی ریت تھی جس پر وحشی ہواؤں نے لہریے ڈالے ہوئے تھے، نہ کوئی ذی روح نظر آ رہا تھا اور نہ ہی زندگی کے آثار، صحرائی پودے بھی یہاں ناپید تھے، ایسے میں ٹیلے کی اوٹ سے نمودار ہونے والا وہ شتر بان اپنے اونٹ کو دوڑاتا دور سے کسی ڈائنوسارس پر سوار جنگجو محسوس ہوتا تھا جس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے، اس کے ماتھے پر قشقہ کھنچا ہوا تھا، کانوں میں بالیاں تھیں اور جسم پر محض گیروے رنگ کا لبادہ لپیٹا تھا۔۔۔۔۔ اونٹ لمبی زقند بھرتا ہوا سے باتیں کر رہا تھا، ریت کے بگولے وقفے وقفے سے اٹھ رہے تھے مگر شتر بان کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی، قوی ہیکل اونٹ کسی خاص نسل کا محسوس ہوتا تھا کیونکہ اس کا رنگ مکمل بھورا نہیں تھا بلکہ سفیدی مائل تھا، اس کا ڈیل ڈول بھی عام اونٹوں سے زیادہ تھا۔ اس کی گردن پر بالوں کو اس انداز سے تراشا گیا تھا کہ کوئی اجنبی تحریر ابھر آئی تھی۔ وہ ایک اونٹ کی کوہان کی شکل کا ٹیلہ نظر آ رہا تھا، شتر بان نے اپنے اونٹ کو اس ٹیلے کے پاس جا کر روک دیا اور چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا، ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ شتر بان نیچے اترتے ہی سجدے میں گر گیا۔

"خونو، اے مقدس خونو۔۔۔۔ اے ریت کے دیوتا، اے صحراؤں کے مالک، مجھے اپنے چرنوں تک آنے کا راستہ دو"

شتر بان مسلسل سجدے میں پڑا گڑگڑا رہا تھا، اس کی گریہ وزاری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اچانک وہ کھڑا ہوا اور چشم زدن میں اپنے چغے سے ایک خنجر نکالا جس کی دھار سورج کی روشنی میں چمک کر آنکھیں چندھیا رہی تھی، اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر خنجر سے ایک کٹ لگایا، خون کی دھار ریت پر ٹپکنے لگی، جب کافی سارا خون ریت پی چکی تو ایک زوردار گڑگڑاہٹ سنائی دی اور اونٹ کی کوہان والے ٹیلے میں ایک شگاف پیدا ہوتا محسوس ہوا، تھوڑی دیر میں درمیان میں ایک راستہ نظر آنے لگا۔ اس وحشی شتر بان نے ایک فلک شگاف چیخ ماری اور اپنے اونٹ پر سوار ہو کر اس نئے پیدا ہونے والے راستے کی طرف دوڑ پڑا، اس کے پیچھے ریت برابر ہو چکی تھی، یہ ایک سرنگ نما راستہ تھا، اونٹ سبک رفتاری سے اس سرنگ میں دوڑ رہا تھا، ہوا اور روشنی کسی ان دیکھے روزن سے سرنگ میں آ رہی تھی۔ سرنگ کا اختتام ایک کھنڈر نما ہال پر ہوا، ہر طرف وحشت ناچ رہی تھی، دیواروں پر جالے تھے جن سے بلی کے سائز کی مکڑیاں اس اجنبی کو گھور رہی تھی، چمگادڑوں کے غول اس کے آنے پر پھڑپھڑاتے ہوئے کھنڈر میں چکرانے لگے مگر اس شتر بان کو کسی بات کی پروا نہیں تھی، سامنے ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں کوئی کھڑکی، کوئی دروازہ نہیں تھا، صرف دیوار پر جلتی ایک مشعل سے کمرے کی نشاندہی ہو رہی تھی، اچانک مشعل کے ساتھ سے سنگی دیوار نے ایک طرف کھسکنا شروع کر دیا اور وہاں دروازہ نمودار ہو گیا، شتر بان سجدے میں گر گیا۔

"اندر جاؤ، اندر جاؤ، دیر مت کرو، دیوتا تمہارا انتظار کر رہے ہیں"

ایک کونے میں لگے جالے سے سرخ آنکھوں والی مکڑی چیخی۔

شتر بان ایک جھٹکے سے اٹھا اور چھوٹے کمرے کی طرف دوڑا، کمرے کے باہر وہ ادب سے جھکا اور اس کمرے میں داخل ہو گیا، کمرے میں مختلف خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں، سامنے ایک چبوترے پر ایک تابوت رکھا تھا، اس نیچی چھت والے کمرے میں جگہ جگہ جواہرات بکھرے تھے، چبوترے پر بھی زر و جواہر کا ڈھیر پڑا ہوا تھا، ہیرے جگمگا رہے تھے، وہ ادب سے چبوترے کے سامنے کھڑا ہو گیا، رکوع میں جھکا اور انتظار کرنے لگا، چوبی صندوق کا ڈھکن چرچراہٹ کے ساتھ اوپر کو اٹھا اور کوئی آدھا صندوق سے باہر آ گیا، یہ ایک کریہہ الشکل مخلوق تھی جسے انسان نہیں کہہ سکتے تھے، اس کا نچلا دھڑ سانپ کا اور چہرہ ایک خونخوار کتے کا تھا، اس کے کاندھے پر ایک کالا سیاہ سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ شتر بان ڈنڈوت کرنے لگا، اس کا ماتھا زمین پر ٹکا ہوا تھا۔

"شاریکا حاضر ہے، نیل کی مقدس سرزمین کے مقدس دیوتا"

وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا، اس کے انداز میں گہرا خوف تھا۔

"ہم نے تمہیں بلایا تھا شاریکا، ضرورت پڑ گئی تھی تمہاری، ہمیں معلوم ہے کہ تم اس دھرتی کے نہیں ہو بلکہ تم ہمالیہ کی ترائی میں کالی گھپاؤں میں چھ ماہ کی نیند میں پڑے ہو، وہ گھپا میں جہاں اندھیرے پلتے ہیں اور بڑا شیطان آرام کرتا ہے، مگر ہمیں تمہیں جگانا پڑا، وہ علاقہ تمہارے دیوتاؤں کی دھرتی ہے، ہمیں تمہارے بڑے دیوتا سے بنتی کر کے تمہیں بلانا پڑا ہے"

سانپ کے منہ سے ایک چیختی ہوئی غیرانسانی آواز سنائی

تھا، اس وقت رکنے کا دوسرا مطلب سوائے موت کے اور کچھ نہیں تھا، صحرا کی ریت پر سانپوں کے گزرنے کے نشانات ثبت تھے اور ہر طرف ان کی زہریلی پھنکار گونج رہی تھی، مگر اس وقت اس کے دوڑنے کا سبب وہ کتوں کا غول تھا جو جانے کب سے اس کے پیچھے تھا۔۔۔ صحرائی کتوں کا وہ غول خون کی مہک پا کر اس کے پیچھے تھا، کتوں کی مجنونانہ غراہٹیں لحہ بالحہ قریب آ رہی تھیں، سامنے ایک شکستہ کھنڈر کی دیواریں نظر آنے لگ گئیں تھی، زخمی کی کوشش تھی کی کسی طرح اس کھنڈر تک پہنچ سکے، کتے قریب پہنچ چکے تھے، کھنڈر اب چند ہی قدم کے فاصلے پر تھا جب اسے اپنے کندھے پر خون آشام دانت محسوس ہوئے، درد کی تیز لہر اپنے کندھے سے نکل کر پورے جسم میں پھیلتی محسوس ہوئی، اس کے گھٹنے آپس میں ٹکرائے اور وہ تپتی ریت پر گر پڑا، اس کا چہرہ ریت میں دھنس گیا، کتوں کا پورا غول اس پر ٹوٹ پڑا۔۔۔ اس کے منہ سے زوردار چیخ نکلتی چلی گئی۔۔۔ کتوں کی غراہٹوں میں ایک پاگل پن اور وحشت آمیز خوشی تھی۔۔۔ من پسند کھاجا ملنے کی خوشی۔۔۔!!

☆☆☆

جواں سال نوروز خان کا حلق خشک ہو رہا تھا، پورے جسم سے پسینے کی دھاریں پھوٹ رہی تھیں، اسے کئی راتوں سے وہ خواب دکھائی دے رہا تھا، اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ رات کا جانے وہ کونسا پہر تھا، بجلی کے جھماکے اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ بتا رہی تھی کہ باہر تیز بارش ہو رہی ہے، چاروں طرف گھنا اندھیرا تھا۔ سوات کے شہر منگورہ میں اس وقت وہ اپنے چھوٹے سے گھر میں موجود تھا جو ایک پہاڑی پر الگ تھلگ بنا ہوا تھا، گھر میں اس کی بوڑھی ماں گل بانو کے علاوہ اور کوئی بھی موجود نہ تھا، اس کا باپ تو اس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی لینڈ سلائڈنگ کی زد میں آ کر وفات پا چکا تھا، گھریلو حالات کی وجہ سے وہ میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکا، اس نے لڑکپن سے ہی سیاحوں کے لئے گائیڈ کا کام شروع کر دیا، سوات بھید بھری سرزمین تھی، یہ گندھارا تہذیب کا مرکز و مسکن رہی تھی، بدھ مت کے نایاب و کمیاب آثار قدیمہ پر مشتمل میوزیم منگورہ کی پہچان تھا، جس کی وجہ سے یہاں پورا سال سیاح دنیا بھر سے آتے تھے، نوروز خان کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی کیونکہ وہ ایک محنتی اور ماہر گائیڈ تھا، اسے اپنے علاقے کے چپے چپے کا علم تھا، اکثر سیاح بار بار یہاں آتے تھے اور نوروز خان سے ہی رابطہ کرتے تھے، وہ جانے کے بعد اپنے دوستوں کو بھی اس کا نمبر دیتے، غرض کہ اس کے معاشی حالات بہت بہتر ہو چلے تھے۔

موسم کی وجہ سے لائٹ حسب معمول چھٹی پر جا چکی تھی۔ اس وقت نوروز خان کا اضطراب نہ تو اندھیرے کی وجہ سے تھا اور نہ ہی چیختی چنگھاڑتی ہواؤں کی وجہ سے۔۔۔ وہ خواب اسے اضطراب میں مبتلا کر رہا تھا، جانے کیسا اشارہ تھا جسے وہ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ اس کی ماں شاید تہجد کے لئے اٹھ چکی تھی کیونکہ وہ ساتھ والی چارپائی پر نہیں تھی۔

''لگتا ہے آج کی رات جاگ کر گزرے گی۔''

وہ بڑبڑایا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہو، سائیڈ ٹیبل سے پانی کا جگ اٹھا کر منہ سے لگا کر ایک ہی سانس میں اس نے جگ آدھا کر دیا، پانی اس کی باچھوں سے بہہ رہا تھا اور اسے بھگو رہا تھا مگر اس وقت اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس نے چارجنگ لائٹ آن کی۔ سامنے ہی میز پر وہ مجسمہ رکھا تھا جو اسے ایک قدیم سنوپا (بدھ مت کی عبادت گاہ) سے ملا تھا، وہ سنوپا سوات کے ایک پہاڑ کی غار نما سرنگ کے آخر میں چھپا تھا، یہ غار نوروز خان نے اتفاقاً دریافت کی تھی، اس کی عادت تھی کہ وہ فارغ دنوں میں ان راستوں اور جنگلات میں گھومتا پھرتا رہتا تھا جہاں وہ پہلے کبھی نہیں گیا تھا، یہ اس کے پیشے کے لئے ضروری تھا، اس کا اکثر اسے فائدہ ہوتا رہتا تھا، وہ سنوپا ایک غار نما گپھا میں چھپا ہوا تھا، بارش سے بچنے کے لئے نوروز خان اس گپھا تک پہنچا تھا، سنوپا میں صرف یہ مجسمہ موجود تھا، یہ عجیب و غریب مجسمہ جس کا نچلا دھڑ کسی سانپ کا تھا اور اوپر کا حصہ کسی خونخوار کتے کی شکل کا تھا، کتے کی زبان باہر لپک رہی تھی اور دانتوں سے لہو ٹپک رہا تھا، اس کی آنکھوں میں آگ دہک رہی تھی، جیسے آنکھوں کی جگہ کسی نے انگارے رکھ دیے ہوں، نوروز خان کو مجسمے پر منتر نما کچھ الفاظ بھی لکھے نظر آئے، اپنے تجربے کی بنا پر اسے معلوم تھا کہ اس مجسمے کا تعلق اس سرزمین سے نہیں ہے مگر یہ بدھا کی سرزمین پر کیا کر رہا تھا؟ یہاں کیسے پہنچا اور سنوپا میں اس کی موجودگی کا کیا جواز تھا، وہ سوچوں میں گم تھا۔ اچانک اسے ایسے لگا کہ کمرے میں سانپ کی پھنکار گونجی ہے، وہ خوف سے اچھل پڑا، چاروں طرف بھید بھرے انداز میں اس نے دیکھا مگر ہر طرف سکوت تھا۔۔۔ گہرا موت جیسا سناٹا۔۔۔!!

☆☆☆

نہ تھی، اسی وقت اسی طرح کے بندروں کا پورا غول درختوں سے چھلانگیں مارتا اترتا ہوا آیا اور انہوں نے کھلے دروازہ کو عبور کرنے کی کوشش کی مگر وہ کسی فٹبال کی طرح واپس پلٹے جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے ان کو اچھال دیا ہو، حیرت انگیز طور پر وہ نوروز خان کی طرف نہیں آ رہے تھے، تھوڑی دیر بعد وہ سب شعلوں میں گھرے وہاں تڑپ رہے تھے اور وہ چشم حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا!!

☆☆☆

یہ ایک تنگ سی غار تھی جو سرنگ کی طرح لمبی تھی، اس کا منہ جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا، غار کے آخر میں ایک دم توڑتی چربی سے جلی مشعل اندھیرے سے لڑ رہی تھی، چار سو ملگجی سی روشنی پھیلی تھی، کوئلوں کے دہکتے الاؤ کے گرد شاریکا آلتی پالتی مارے بیٹھا منہ ہی منہ میں بدبدا رہا تھا، اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ تھا، تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں جو انگارے کی طرح دہک رہی تھیں، الاؤ سے ایک دہکتا کوئلہ اٹھا کر اس نے سامنے کی دیوار پر دے مارا، اس کے ساتھ ہی ایک کریہہ چیخ کے ساتھ غار کی چھت پھٹی اور ایک دیوہیکل لنگور چھلانگ لگا کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا، وہ دانت نکوس رہا تھا۔

"افریقہ کی مہان شکتی سانگا، مجھے بتاؤ کہ تمہارے چیلے جس کام پر گئے تھے اس کا کیا بنا، وقت بھاگتا جا رہا ہے، مجھے خوفو دیوتا نے اتنی مہلت نہیں دی۔"

شاریکا نے ڈانٹتے ہوئے اس لنگور کو گھورا۔

"میں شما چاہتا ہوں مہاراج، میں نے بہتیری کوشش کی پرنتو کچھ نہیں بن سکا، پلید آتمائیں پرلوک سدھار گئیں ہیں، ان سے بڑی مہان شکتی ان سے آن ٹکرائی جس کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں اور انہیں جیون بلیدان دینا پڑا۔"

سانگا نے سر جھکا کر کہا۔

"کیا اول فول بکے جا رہے ہو مورکھ، کالی شکتیوں سے بڑی بھی کوئی شکتی ہے، آج سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

شاریکا اس کی بات سن کر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"مہاراج، ہم اس منش کی شکتی کا اندازہ نہیں کر سکے، کوئی روشنی کی شکتی ہے اس کے پاس، اس کے لئے کچھ اور اُپائے کرنا پڑے گا۔"

سانگا نے خرخراتے ہوئے جسم کھجایا۔

"روشنی کی شکتی کہاں سے آ گئی اس کے پاس، وہ تو کیول عام سا منش ہے۔"

شاریکا نے حیرت سے کہا۔

"مہاراج ہماری آتمائیں تو اس کے گھر میں داخل ہی نہیں ہو پائیں، کوئی سیما کھنچی ہے گھر کے باہر جو بھسم کر دیتی ہے ہر آتما کو، کوئی منڈپ ہے۔"

سانگا نے چھلانگ لگا کر اپنی جگہ بدلی۔

"میں دیوی دیوتاؤں کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ جس نے ہماری شکتیوں کا اپمان کیا ہے انہیں نرک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔۔۔۔ اب میں شرواپ دیوتا کے دربار کی خاص پجارن کنڈولی کو بھیجتا ہوں اس کی طرف، وہ اندھیروں کی جاتی نہیں ہے، مجھے وشواس ہے کہ وہ سارا حال لے کر آئے گی ہمیں جلد اس سے مجسمہ لینا ہے۔"

شاریکا کی آنکھیں کسی آدم خور جانور کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس نے کچھ پڑھ کر زمین کی طرف ہاتھ جھٹکا تو سامنے سے زمین پھٹی اور ایک کریہہ صورت بڑھیا زمین سے باہر نکل آئی۔

"کنڈولی حاضر ہے مہاراج، مجھے بتائیں کسے شراپ دینا ہے، میرے پاس سے تھوڑا ہے۔۔۔۔ کس نے مہاراج کا اپمان کیا ہے"

کنڈولی نے چیختی ہوئی باریک آواز میں کہا۔

"کنڈولی دھیرج سے کام لو، مسئلہ یہ ہے کہ نیل کی مقدس سرزمین پر قدیم اہرام کے مہاراج دیوتا، خوفو ناگ دیوتا سے آخری یدھ کے لئے کشٹ کاٹ رہے ہیں، اس کے بعد وہ ناگ جاتی کے بھی دیوتا ہو جائیں گے، اس کے لئے مہا دیوتا نے شرط رکھی کہ خوفو مہاراج اپنی ساری شکتی کسی مجسمے میں رکھ کر پھر جاپ کریں اور یدھ لڑیں، خوفو مہاراج نے اپنی شکتیاں اپنے مجسمے میں قید کر کے سوات کی ایک کالی گپھا میں رکھ دیا، وہاں کسی منش کا گزر نہیں ہوتا مگر جانے کیسے ایک عام سا منش وہاں پہنچ بھی گیا اور مجسمہ بھی اٹھا لایا جس کی وجہ سے خوفو مہاراج کا جاپ ادھورا رہنے کا خطرہ ہے۔۔۔۔ پورن ماشی کی رات سے پہلے پہلے اس مجسمے کو اس کے گھر سے اٹھا کے لانا ہے مگر اس منش کے گھر کے چاروں اور کوئی منڈپ ہے، سانگا کی شکتیاں بھسم ہو گئیں، اس لئے تمہیں بلایا ہے۔"

اس دوران کنڈولی کی آنکھیں کسی سرچ لائٹ کی طرح اس کے حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔

دی۔ اس کی زبان مسلسل لپلپا رہی تھی۔
"سیوک کو حکم دیجئے، سیوک جیون دان کر دے گا آپ کے لئے۔"

شاریکا نے ماتھا زمین پر رگڑا۔ "بدھا کی کالی گپھا میں چھپایا ہوا ہمارا شریر کسی نے چرا لیا ہے، ہم ادھورے ہیں شاریکا، اسی مجسمے میں ہماری شکتی ہے، اسی میں ان صحراؤں اور نیل کے راز چھپے ہیں، اسی طاقت سے ہمارے دیوتاؤں نے اہرام کھڑے کیے تھے، جب ہوائیں ٹنوں وزنی پتھر کاندھوں پر اٹھائے پھرتی تھیں، یہ راز کھل گیا تو دیوتاؤں کا غضب ہم پر نازل ہوگا، اسی کی مدد سے ہم نے ناگ جاتی پر حکومت کرنی ہے، جاؤ۔۔۔ اندھیرے کی شکتیوں کو لے جاؤ اور مجسمہ واپس لے کر آؤ۔"

سانپ کے منہ سے دوبارہ پھر سرسراہٹ کی آواز نکلی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بدہیت مخلوق دوبارہ چوبی صندوق میں غائب ہوگئی اور شاریکا سجدے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر طرف پھنکاریں گونج رہی تھیں!!

☆☆☆

نوروز اذان کی آواز پر گھر سے نکلا، گلبانو اس سے پہلے ہی بیدار ہو چکی تھی۔ وہ بابا چراغ شاہ کی خانقاہ کے پاس بنی مسجد کی طرف چل پڑا، بابا چراغ شاہ دنیا کے بکھیڑوں سے دور اپنے حجرے تک محدود رہتے تھے، خانقاہ پر ملک کے طول و عرض سے ان کے پروانوں کا ہجوم رہتا تھا، یہاں ہر وقت لنگر چلتا، مسافر قیام کرتے، مسائل کا شکار لوگ یہاں آکر اللہ کا ذکر اذکار کرتے اور سکون پاتے، نور ہی نور اور سکون کی دبیز تہہ تھی جو اس فضا میں سرایت کیے رکھتی تھی، بابا چراغ شاہ بہت ہی مجبور ہو کر درگاہ سے باہر آتے تھے ورنہ وہ وہیں بیٹھ کر خلقت کے مسائل حل کرتے تھے۔۔۔ مسجد میں آتے ہی نوروز خان کا ذہن ہلکا پھلکا ہو گیا، تمام پریشانیاں اور بے سکونی تحلیل ہو گئیں۔ اس نے سکون سے نماز پڑھی، اللہ کے حضور ہاتھ پھیلا کر اور گڑگڑا کر دعا مانگی، فارغ ہو کر پرسکون سا مسجد سے باہر آگیا، جولائی کا مہینہ تھا مگر ینگورہ میں دسمبر کا سا ماحول تھا، پہاڑوں پر دھند کے بادل تیر رہے تھے، موسم کی مناسبت سے نوروز خان نے گرم شال لی ہوئی تھی۔ وہ سوچوں میں گم گھر کی طرف روانہ ہوا جب ایک دم سے اسے زوردار گھنگھروؤں کی چھنک سنائی دی، وہ اچھل پڑا۔

"نحوست، کالے سائے، اندھیرے، آسمانی بلائیں مرے بچے۔۔۔ سنبھل کے، دیکھ بھال کے۔"

یہ رنگین کپڑوں کے ٹکڑوں سے بنی گدڑی پہنے، ننگے پاؤں، گلے میں لکڑی کے منکوں کی مالا، ہاتھ میں گھنگھرو لگا موسل نما ڈنڈا تھامے ایک مخبوط الحواس دکھائی دینے والا شخص تھا جو بھاری بھرکم موسل کو زمین پر مار کر بار بار گول گول گھومتا اور اسی ایک جملے کی تکرار کیے جا رہا تھا۔ جانے وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا، نوروز خان نے اسے پہلی بار یہاں دیکھا تھا۔

"بابا جی، کیا فرما رہے ہیں آپ۔"

نوروز ایسے لوگوں کا ہمیشہ ادب کرتا تھا۔

"اندھیرے، سائے۔۔۔ اندھا کنواں، آگ ہی آگ۔"

ملنگ نما بابا جی ایک ہی تکرار کرتے گھوم رہے تھے۔

"بابا جی، میں کچھ سمجھا نہیں۔۔۔ اچھا چلیں آپ کو چائے پلاتا ہوں، دیکھیں تو کتنی سردی ہے، نئے جوتے بھی دلاؤں گا۔"

اس نے لجاجت سے ملنگ کا ہاتھ تھاما۔

"جا بیری کی گود میں جا بیٹھ، واپس چلا جا، باہر مت آنا، جلدی کر، وہ آرہے ہیں، وہ آرہے ہیں۔"

اس بار ملنگ نے سرخ آنکھیں کھول کر اسے گھورا اور موسل کو زور سے زمین پر مارا۔

"تارے ٹوٹیں گے، آگ برسے گی، خلقت ترسے گی۔۔۔ سائے، اندھیرے، بھاگ جا، دفع ہو جا یہاں سے نوروز، بھاگ جا۔"

ملنگ یہ کہتا ہوا منہ سے ہو ہو کی کوک لگاتا ایک طرف کو بھاگ گیا اور نوروز خان اس کے منہ سے اپنا نام سن کر حیران سا کھڑا رہ گیا۔ جانے کیا ماجرا تھا، جانے کون تھا یہ عجیب شخص!!

سہ پہر کو رابرٹ نامی سیاح کو سارا دن گھما کر نوروز نے اس سے اجازت طلب کی اور اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے گھر کی راہ لی۔۔۔ بادل پل میں آتے اور پل میں جاتے تھے، سہ پہر کو ہی رات کا سماں ہو رہا تھا، گھر کے باہر ابھی اس نے لکڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ اسے ایسا لگا کوئی سایہ سا دروازے سے ٹکرایا ہے، ایک تکلیف بھری ممیاہٹ کی آواز پھیلی، وہ اچھل کر ایک طرف بھاگا، اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ شعلوں میں لپٹا ایک قد آدم سیاہی مائل بندر کی نسل کا کوئی جانور تھا جو چیخیں مارتا تڑپ رہا تھا، کوئی جائے فرار سے میسر

گلئی نے تخت پر پڑی چھری اٹھائی اور نوروز خان کی طرف دوڑی۔

نوروز بوکھلا کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا، گل گلئی اس کے پاس آ کر اس کے چاروں طرف چکر کاٹنے لگی مگر وہ اس کے قریب نہیں آ رہی تھی، اس کی آنکھیں سرخ اور چہرے پر غیض وغضب طاری تھا۔ بال ہوا میں لہرا رہے تھے، یہ گل گلئی نہیں تھی، کوئی اور تھا اس کے روپ میں، نوروز خان نے لپک کر گل گلئی کا چھری والا ہاتھ پکڑنا چاہا تاکہ چھری تو اس سے چھین لے، جیسے ہی اس نے گل گلئی کو چھوا، گلئی کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور اسے زوردار جھٹکا لگا اور وہ بے ہوش ہو کر فرش پر گری، نوروز خان بروقت اسے نہ تھام لیتا تو اسے خاصی چوٹ لگنی تھی۔ اس نے اسے چارپائی پر لٹایا ہی تھا کہ اس کی ممانی اندر داخل ہوئی۔

''کیا ہوا میری بچی کو، گلالے، گلالے''

وہ چارپائی کی طرف دوڑی۔

''مامی شاید چکر آ گئے ہیں''

نوروز خان نے بات بنائی۔

گلئی کو کافی دیر بعد ہوش آیا، اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ ہوا کیا ہے، بس اسے قہوہ بنانے کے لئے باورچی خانے جانا یاد تھا۔۔۔!!

کوئی طاقت تھی جو نوروز خان کے پیچھے تھی، مگر جانے کیوں وہ نوروز خان کے پاس آنے سے کترا رہی تھی!! وہ سوچوں میں گم ماموں کے گھر سے نکل آیا، سڑک کے کنارے وہ گم صم چلا جا رہا تھا۔

''تو نہیں مانتا مری بات، چوٹ کھا کر مانے گا''

کسی نے نوروز کی کمر پر زوردار لات ماری، وہ تلملا کر مڑا تو اسی مجذوب کو طیش کے عالم میں گھورتا پایا۔

''تجھے کمسن کھیریوں میں پڑنے کا شوق ہے نا مگر تو سہار نہیں سکے گا اس کا وزن، جا چلا جا خانقاہ کی اوٹ میں، اس دن تڑکے تڑکے بھی کہا تھا تجھے مگر تیرے بھیجے میں نہیں سمائی میری بات، اب سسرالی آ گئے تو منہ پھاڑ کھڑا ہے''

مجذوب سخت غصے میں تھا۔

''بابا، معاف کر دو، میں بے بے کو بتا کر ابھی جاتا ہوں''

نوروز منمنایا۔

''ماں کی فکر نہ کر، تو جا بس، اب کے اب جا، وقت برباد نہ کر بچے''

مجذوب کچھ دھیما پڑا۔

پندرہ منٹ بعد وہ درگاہ میں بابا چراغ شاہ کے حجرے میں مودب بیٹھا تھا۔ حجرے کی نور بھری فضا نے نوروز کو بے خوف کر دیا تھا۔

''تین ہزار سال قبل مسیح مصر میں ایک فرعون گزرا جس کا نام خوفو تھا، اس نے اہرام کی تعمیر میں بھی حصہ لیا، اسے طاقت حاصل کرنے کا بہت جنون تھا، پورے مصر سے جادوگر اس کے دربار میں جمع رہتے تھے، اس نے ان کے سامنے ابدی حیات کا سوال رکھا، جادوگروں نے برسوں کی تپسیا کے بعد اسے بتایا کہ اگر وہ اپنی تمام طاقتیں ایک خاص شکل کے مجسمے میں بند کر کے مجسمے کو چھپا دے تو جب تک مجسمے تک انسانی رسائی نہیں ہوتی وہ پہلی کے چاند سے لے کر پورے چاند کی رات تک زندہ رہ سکے گا، اگلے پندرہ دن اس کو واپس لاش میں جا کر گزارنے ہوں گے، اگر کبھی اس کا مجسمہ غار سے باہر آ گیا تو پورن ماشی کی رات سے پہلے وہ واپس اسی غار میں پہنچانا ضروری ہے ورنہ اسے اس دنیا سے جانا پڑے گا، اگر اس نے ناگ دیوتا کو شکست دے دی تب وہ اس مجسمے والی شرط سے بھی آزاد ہو کر دائمی حیات پالے گا۔ خوفو مر گیا، اس کی لاش اس کے محل میں رکھ دی گئی اور اس کے گرد کالے جادو اور پلید شکتیوں، آتماؤں کا پہرہ لگا دیا گیا۔ اب جب کہ وہ ناگ دیوتا سے لڑنے کی تیاری میں مصروف تھا، تم غار سے اس کا مجسمہ نکال لائے۔۔۔۔۔ پورن ماشی کی رات میں ایک ہفتہ رہتا ہے، اس سے پہلے پہلے تمہاری زندگی خطرے میں ہے، اس کی شکتیاں مجسمہ حاصل کرنا چاہتی ہیں مگر تمہارے گلے اور تمہارے گھر میں تمہاری والدہ نے معوذتین لکھ کر رکھا ہوا ہے، اس کے علاوہ اکثر تم وضو سے ہوتے ہو، اسی وجہ سے وہ تمہارے گھر میں داخل نہیں ہو پا رہے مگر تم احتیاط کرنا، کالی کا پجاری شاریکا تمہارے پیچھے ہے، ہم نے درگاہ کا ایک خادم تمہاری حفاظت اور شاریکا کو ناکام کرنے کے لئے روانہ کر دیا ہے۔۔۔۔ ہم روشنی کے ساتھ ہیں اور ظلمت کے دشمن ہیں، اس وجہ سے تمہیں بچانا چاہتے ہیں، آج اگر تم وہ قہوہ پی لیتے تو تمہارے اندر ناپاکی چلی جاتی، شکتیاں تم پر براہ راست قابض ہو جاتیں، انہوں نے گلئی کا دماغ قابو کر کے یہ سب کروانا چاہا''

بابا چراغ شاہ نے اسے تفصیل سے بتایا اور نوروز کو وہ

''دیکھ لیا ہے، کنڈولی نے اس کی جنم کنڈلی میں جھانک لیا ہے مہاراج، روشنی اس کے ساتھ ہے، روشنی اس کے گھر میں ہے، اسے خود بھی نہیں معلوم مگر روشنی اس کے ساتھ ساتھ ہے، مجھے کوئی اپائے کرنا پڑے گا، چنتا نہ کریں مہاراج، اب کنڈولی اپنا وار کرے گی''

کنڈولی نے دانت کچکچائے۔

''یہاں کیول شکتیوں سے کام نہیں چلے گا بلکہ کسی منش کو ہی قابو کرنا پڑے گا''

کنڈولی کریہہ ہنسی ہنس کر بولی اور شاریکا نے بھی فلک بوس قہقہہ لگا کر ساتھ دیا۔

☆☆☆

صبح سویرے پیش آنے والا واقعہ نوروز خان کے ذہن سے چپک گیا تھا، گھر آنے کے بعد بھی وہ گم صم تھا۔ گل بانو نے اسے کافی ٹٹولا مگر وہ ماں کو ٹال گیا، ابھی تو اسے خود بھی کچھ معلوم نہیں تھا، ہر طرف ابہام کی گہری دھند تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ معاملات کا تعلق اس پراسرار مجسمے سے ہے، جب سے یہ مجسمہ وہ گھر لے کر آیا تھا، اسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ اکیلا نہیں تھا، کچھ ان دیکھی چیزیں، کوئی عجیب سی مخلوق اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے، ایک نامانوس سی بدبو بھی گھر سے باہر جاتے ہی اسے محسوس ہونے لگتی تھی مگر اس بدبو کا منبع اسے معلوم نہیں تھا، لیکن اطمینان اس بات کا تھا کہ اسے کوئی گزند نہیں پہنچا تھا، اس کے علاوہ گھر کے باہر ہی یہ سب کچھ تھا۔

گھر سے باہر آکر اس کا رخ اپنے ماموں منگل خان کے گھر کی طرف ہو گیا، اس کے ایک ہی ماموں تھے، منگل خان نے اسے بچپن سے ہی باپ کا پیار دیا تھا، اس وجہ سے اس کا ماموں کے گھر دل لگتا تھا۔ کئی دن سے وہ اس طرف چکر نہیں لگا سکا تھا، آج فراغت تھی تو اس نے سوچا کہ اس طرف ہو آئے۔ اس کے ماموں کے دو ہی بچے تھے، گل گلئی اس کی ہی ہم عمر تھی اور اس سے چھوٹا زرغام خان دس سال کا تھا، ماموں کے گھر پر خاموشی کا راج تھا۔

''گلالے، کہاں ہیں بھئی سب''

نوروز خان نے اندر جا کر آواز لگائی۔

تھوڑی دیر بعد باورچی خانے سے گلئی نمودار ہوئی، اس کے دونوں ہاتھ آٹے سے بھرے تھے۔

''لگتا ہے روٹیاں بنانے کی تیاری ہے، ماموں ممانی، زرغام، کہاں ہیں سب''

نوروز خان نے گلئی سے پوچھا۔

گل گلئی حسن کا شاہکار تھی۔ سرخ و سفید رنگت، شہد رنگ زلفیں، شربتی آنکھیں، گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ، لچکدار بدن اور کم سنی کی معصومی اس حسن کو دوآتشہ کر دیتے تھے۔ نوروز خان کو وہ ہمیشہ سے اچھی لگتی تھی، اب وہ صرف اس کے لئے ماموں کے گھر آتا تھا، ایک خاموش بندھن تھا جس کے بارے میں سب جانتے تھے مگر چپ تھے۔

''امی پڑوس میں ہیں، زرغام کو کھیل سے فرصت نہیں اور بابا ابھی دکان سے نہیں آیا، تم بیٹھو، ویسے عید تو بڑا دور ہے ابھی تم کدھر سے آ گیا۔۔۔۔۔ ہم قہوہ بناتا ہے تمہارے واسطے''

گلئی نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔

''وہ اصل میں تمہیں تو پتہ ہے گلالے، آج کل سیزن ہے نا، آج ذرا فرصت تھی تو سوچا چل آؤں''

نوروز خان صحن میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور گلئی باورچی خانے میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ قہوے کا پیالہ لئے ہوئے آ گئی اور اسے تھما کر پاس ہی بڑے تخت پر بیٹھ گئی۔

''بڑی تیز سروس ہے تمہاری، ایک منٹ میں قہوہ بنا دیا''

نوروز خان نے گلئی کو چھیڑا مگر خلاف توقع اس نے جواب نہ دیا۔

اس نے قہوہ کا پیالہ منہ سے لگانا چاہا مگر بے اختیار اسے واپس رکھ دیا، اسے زور سے ابکائی آئی۔ وہی بدبو پیالے سے آئی جو کئی دن سے وہ اپنے تعاقب میں محسوس کر رہا تھا۔

''یہ کیا ہے گلالے، لگتا ہے کوئی چھپکلی گر گئی ہے قہوے میں''

اس کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔

''قہوہ پیو نوروز خان، فالتو باتیں مت کرو''

گلئی نے پیالہ اٹھا کر سخت لہجے میں کہا تو نوروز خان نے چونک کر اسے دیکھا، یہ انداز گلالے کا نہیں تھا۔ واقعی گلئی کی آنکھیں بے تاثر تھیں، البتہ چہرے پر وحشت کے آثار تھے۔

''گلالے کیا ہو گیا ہے تمہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟''

نوروز خان نے استفسار کیا، اسے دال میں کالا نظر آ رہا تھا۔

''نوروز خان قہوہ پیو۔۔۔ پینا پڑے گا تمہیں''

"تیری کالی ماتا کی تو۔۔۔"

مجذوب نے گرج کر موسل کو لہرایا، بڑھیا ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹی اور مجذوب کے منہ سے ایک فلک شگاف قہقہہ نکلا۔

"بس اتنا ہی برتا تھا، اچھا چل بُلا لے جس کو بُلانا ہے، تیرا میرا جوڑ نہیں، ہو جانے دے آج یدھ۔۔۔ یاد رکھ یدھ کے بغیر تو یہ مجسمہ یہاں سے نہیں جا سکتا، مجھے معلوم ہے کہ اس کے پیچھے ہمالیہ سے نیل تک ڈھنڈیا پڑی ہے، تو تو چھوٹی چیلی ہے، تیرا کام اتنا ہی تھا جتنا تم نے کر دکھایا چل بلا لے سب کو"

مجذوب کی باتوں پر بڑھیا پریشان ہو گئی۔

"لا دے دے مجھے، گدڑی میں لعل چھپائے جا رہی ہے مائی، ادھر دے مجھے"

مجذوب نے ڈپٹ کر کہا۔

اچانک ایک زوردار چھناکا ہوا، ہر طرف دھواں پھیل گیا، دھواں چھٹا تو شاریکا اپنی پوری آن بان کے ساتھ داہنے ہاتھ میں بلم لئے وہاں کھڑا تھا، گل بانو ڈر کر دروازے کے اندر چلی گئی۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی، اس تنہا راستے پر مجذوب اور شاریکا آمنے سامنے تھے۔

"واسی کو کیوں دھمکاتا ہے شمس الدین، تیرا جوڑ ہم ہیں، آ جا تیرا ٹینٹوا دباتا ہوں، بہت رستہ کھوٹا کر لیا تم نے ہمارا مورکھ"

شاریکا نے غرور بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاہاہا۔۔۔"

مجذوب کے منہ سے بلند آہنگ قہقہہ نکلا۔

"لے جا، لے جا شاریکا۔۔۔

رام چھوڑی اجودھیا، من بھاوے سو لے

اب یہ میرے کام کا نہیں، میرے کام کے تو تم ہو، تمہاری ضرورت تھی ہمیں تو۔۔۔ تم آ گئے تو اب واپس کون جانے دیتا ہے تمہیں"

مجذوب نے موسل کو زمین پر مار کر دائرے میں گھومنا شروع کر دیا۔

"زیادہ چھچھل نہ دکھا شمس الدین، یہ ناچنا کودنا بند کر۔۔۔ سامنا کر میرا، تجھے اندازہ نہیں کہ کتنی بلوان شکتیاں میرے ساتھ ہیں اس سمے۔۔۔ میرے چرنوں میں لوٹے گا تو تھوڑی دیر بعد"

شاریکا نے بڑ ماری۔

"بھول گئے شاریکا، بھول گئے ہماری پچھلی ملاقات۔۔۔ کیسے بھاگے تھے دم دبا کر اور شکتیوں کی بھی خوب کہی۔۔۔ ہم محض وضو بھی کر لیں تو اندھیرے کی سب شکتیاں، تمہارے سارے جاپ ہار مان لیتے ہیں، قرآن مجید کا ایک حرف لکھ کر پلو سے باندھ لیں تو تیرے سارے دیوتا دیواروں سے ٹکریں مارتے ہیں۔۔۔ پھر بھی تو اکڑتا ہے پاگل"

شمس الدین نے شاریکا کو گھورا۔

"سمے سمے کی بات ہے اپرادھی۔۔۔ بھگوان کی سوگند، تجھے وہ شراپ دوں گا کہ تجھے چرن چھونے کے علاوہ کوئی اپائے نظر نہیں آئے گا، تیرے لئے شبھ یہی ہے کہ تو میرا رستہ کھوٹا مت کر۔۔۔ مجھے دے مہاراج خونو کا شریر کالی کی داسی"

شاریکا نے بڑھیا کو گھرکا۔

بڑھیا نے مجسمہ شاریکا کو دینا چاہا مگر اس سے پہلے ہی مجذوب شمس الدین نے موسل کو زور سے زمین پر مارا، تیز ہوا کا بگولا اٹھا اور مجسمے کو لپیٹ میں لے کر گھماتا ہوا مجذوب کے پاس لا پھینکا، شمس الدین نے مجسمہ اٹھایا اور زور سے بابا چراغ شاہ کی درگاہ کی طرف پھینکا، درگاہ آدھا کلومیٹر دور تھی مگر مجسمہ میزائل کی طرح پلک جھپکتے درگاہ کے رخ غائب ہو گیا، یہ سب پلک جھپکتے ہو گیا، شاریکا جیسے نیند سے بیدار ہوا۔

"یہ گھور پاپ کیا ہے تم نے شمس الدین، پہلے میں تمہیں نادان بالک سمجھ کر معاف کئے جا رہا تھا مگر تمہارا کچھ کرنا پڑے گا، تم نے دیوتاؤں کے سیوک سے ٹکر لی ہے"

شاریکا کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے، اس نے مجذوب کی طرف انگلیاں جھٹکیں، آگ کی لپیٹیں شمس الدین کی طرف لپکیں۔ شمس الدین نے دائرے میں خود کو گھمایا اور اس کی گدڑی سے تیز ہوا کے بگولے نکلے جنہوں نے شعلوں کو ایک پل میں بجھا دیا۔

"تو فریب کر لے، مکر کر لے، میں وار نہیں کرتا بلکہ صرف جواب دوں گا، جب تیرے شبد ختم ہو جائیں تو پھر بات ہو گی تجھ سے، مجسمہ تو گیا بہت دور، اب تو مجھ سے ملاقات کر شاریکا"

شمس الدین نے منکوں کی لڑیاں بجا کر شاریکا کو چڑایا۔

عجیب وغریب مجذوب یاد آ گیا۔

☆☆☆

گل بانو نوروز کی حالت پر بہت پریشان تھی، کچھ تھا جو اندر ہی اندر چل رہا تھا مگر اس کا بیٹا اس سے چھپا رہا تھا اور یہ سب کچھ اس مجسمے کے آنے سے ہوا تھا، اس کے بعد سے نوروز پریشان تھا۔ گل بانو صوم وصلوٰۃ کی پابند عورت تھی، شوہر کے فوت ہونے کے بعد اس نے اپنے کردار کی وجہ سے عزت پائی، تہجد گزاری اسے اپنی ماں سے وراثت میں ملی تھی، یہی وصف اس نے نوروز میں پیدا کرنا چاہا تھا۔ نوروز باہر گیا ہوا تھا، گل بانو نے جلدی جلدی گھر کی صفائی مکمل کی اور برتن دھونے لگی، برتنوں سے فارغ ہو کر اس نے شام کے لئے سبزی بنانا شروع کر دی، اچانک دروازہ بجا۔

''کون آ گیا اس وقت''

گل بانو بڑبڑائی۔

''انتظار، ابھی آتی ہوں''

گل بانو نے آواز لگائی۔ دروازے میں بنی جھری سے دیکھنے پر اسے ایک بوڑھی عورت نظر آئی جس کے چہرے پر تھکن اور بے چارگی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا، اس نے بہت سخت زندگی گزاری تھی، اسے بھوک اور تھکن کی زبان کی پہچان تھی۔

''بے بے اندر آ جاؤ''

گل بانو نے بڑھیا کو راستہ دیا۔

بڑھیا کافی ضعیف تھی، اس نے ایک پھٹی پرانی جیکٹ اور اس پر ایک سالخوردہ سی شال لپیٹ رکھی تھی، لاٹھی کا سہارا لئے وہ مشکل سے برآمدے تک آئی اور وہیں چارپائی پر ڈھے گئی۔

''بیٹا، مجھے چائے پلا دو، بہت سردی لگ رہی ہے''

بڑھیا نے کپکپاتے لہجے میں کہا، اس کا جسم لرز رہا تھا۔

''بے بے ابھی لاتی ہوں''

باورچی خانے میں چائے کی دیگچی میں ایک پیالہ چائے بچی پڑی تھی، چولہا ابھی گرم ہی تھا، گل بانو نے چائے کو ابالا دیا اور پیالے میں لئے باہر آ گئی۔ مگر بڑھیا وہاں نہیں تھی۔ گل بانو حیران رہ گئی۔

''بے بے کہاں گئی''

اس نے خود کلامی کی۔

''میں ذرا اندر سے گھر کو دیکھ رہی تھی، ماشاء اللہ خوبصورت ہے بیٹی، اچھا اب میں چلتی ہوں''

بڑھیا ایک دم سے کمرے سے برآمد ہوئی۔

''بے بے چائے تو پیو نا، ناشتہ بھی بناتی ہوں''

گل بانو حیران کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی۔

''بس میں چلتی ہوں''

بڑھیا نے تیزی سے بیرونی دروازے کا رخ کیا، اس کی چال میں پھرتی عود کر آئی تھی۔ اچانک گل بانو کو شک ہوا کہ بڑھیا کا ایک ہاتھ چادر کے اندر ہے، کچھ چھپایا ہوا لگ رہا تھا۔

''ٹھہرو، بات سنو''

گل بانو اس کے پیچھے دوڑی، مگر اس وقت تک بڑھیا دروازہ کھول چکی تھی، ایک بار وہ گھر سے نکل گئی تو ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے بڑھیا دروازہ عبور کر گئی۔ گل بانو پہاڑی پر بنی پگڈنڈی پر آئی تو بڑھیا اطمینان سے سڑک پار کر رہی تھی، اب اس نے چادر سے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا تھا، اس کے ہاتھ میں وہی مجسمہ تھا جو کئی دن سے بڑے کمرے کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔ گل بانو کا دل دھک سے رہ گیا۔ بے شک وہ اس مجسمے سے چڑ کھاتی تھی مگر نوروز کے لئے وہ اہم تھا، اب جانے نوروز کس ردعمل کا مظاہرہ کرے!!

اچانک زور سے گھنگھرو چھنکے۔

''تارے ٹوٹیں گے، آگ برسے گی، خلقت ترسے گی۔۔۔''

سامنے ایک مجذوب اپنا گھنگھرو والا موسل تھامے کھڑا کینہ توز نظروں سے بڑھیا کو گھور رہا تھا۔۔۔!!!

☆☆☆

''اے بڑھیا، پیٹ کی پاپی، کہاں چلی، مال دیتی جا، ایسے کون جانے دیتا ہے۔ تجھے کالی کی داسی''

مجذوب دھاڑا اور حسب عادت دائرے میں گھومنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ موسل زمین پر زور سے مار دیتا جس سے فضا گھنگھروؤں کے ارتعاش سے کھنک اٹھتی، گل بانو بھی وہاں پہنچ کر خاموشی سے سارا ماجرا دیکھ رہی تھی۔

''میرا رستہ چھوڑ پاگل بڈھے، مجھے جانا ہے نہیں تو، کالی ماتا کی چھایا ہے میرے سر پر''

بڑھیا نے مجذوب کو ڈرایا۔

شاریکا نے جھنجلاتے ہوئے ہونٹوں میں کچھ بدبدا کر آسمان کی طرف پھونک ماری تو نوکیلی چونچ اور آہنی پنجوں والے پرندے ہزاروں کی تعداد میں شمس الدین کی طرف آئے، زمین پر ان کا سایہ سا بن گیا، ہر طرف اندھیرا چھا گیا جس میں شاریکا کے قہقہے اور پرندوں کی کر یہہ چیخیں گونج رہی تھیں۔ مگر شمس الدین اپنی جگہ پر ہوتا تو پرندے اس کو ملتا، وہ تو ہوا کے جھونکے کی طرح جگہ بدل رہا تھا، اگلے ہی لمحے دور پہاڑ کی چوٹی سے اس کی ہنسی سنائی دی، پھر وہ ہنسی شاریکا کے پیچھے، سامنے، چاروں طرف سنائی دی، پرندے چکرا رہے تھے مگر ان کو شکار نہیں مل رہا تھا۔

"کچھ اور ہے تیری پٹاری میں تو وہ بھی نکال شاریکا، سنا ہے تو مہا گرو ہو گیا ہے۔"

مجذوب نے آسمان کی طرف دیکھ کر زوردار ہوک بلند کی۔

"ہو تو یہ پہاڑ الٹ دوں تیرے اوپر مورکھ، تجھے پتہ نہیں کہ تیرے سامنے کون کھڑا ہے۔"

شاریکا نے اتراہٹ سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں الٹ، جلدی کر کبھی دیر ہو جائے، بڑا دل کر رہا ہے میرا کہ پہاڑ میرے اوپر گرے اور میری ہڈیوں کا سرمہ بنے، جلدی کرنا شاریکا۔"

مجذوب نے گھنگھرو والا موسل زمین پر مارا اور گھنگھرو چھنک اٹھے۔

"لے پھر سنبھل شمس الدین۔"

شاریکا نے انگلی کو دائرے میں گھمایا اور پہاڑوں سے وزنی چٹانیں ایسے اڑتی آئیں جیسے ریت کے ہلکے پھلکے ذرات ہوں۔ ان کے ساتھ بلند و بالا درخت بھی تھے، شاریکا تمسخر بھری نگاہوں سے مجذوب کو گھور رہا تھا۔ مجذوب کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہزاروں چٹانیں اور درخت میزائل کی طرح مجذوب سے آ ٹکرائے، گل بانو نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں مگر کچھ نا ہوا، چٹانوں کی یلغار مجذوب کے جسم سے ایسے گزر گئیں جیسے وہ ہوا کا بنا ہو، شاریکا کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ اب اس نے بہتر یہی سمجھا کہ وہاں سے بھاگ لے، بعد میں جیسے کا کچھ ہو جائے گا مگر اسے حیرت کا جھٹکا سا لگا جب اس کا نچلا دھڑ کسی پتھر کی طرح بے جان ہو گیا، وہ حرکت کرنے سے قاصر تھا۔

"تو نور کی دھرتی پر آ گیا ہے شاریکا، کالی چھاؤں سے تجھے یہیں تو لے کر آنا تھا، اب آیا اپنی مرضی سے ہے مگر جائے گا ہماری مرضی سے۔"

گھنگھروں کی چھنک میں مجذوب کی ہنسی سنائی دی۔

"کنڈولی مجھے نکالو یہاں سے۔"

شاریکا چلایا مگر ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔

"مہاراج، افریقہ کی دلدلوں کی سڑاند والا منتر پڑھیے، اس وقت وہی کام آئے گا، میں زیادہ دیر نہیں رک سکتی ورنہ انہیں شک ہو جائے گا، مجھے شما کیجئے۔"

شاریکا کے کان میں کنڈولی کی سرگوشی گونجی۔

شاریکا نے منتر پڑھنا چاہا مگر اس کا ذہن خالی تھا، کسی صاف کی ہوئی سلیٹ کی مانند، وہ چکرا کر رہ گیا۔

"ہاہاہا۔۔۔۔ شاریکا کنڈولی نہیں کام آنے والی، کیوں چیلوں کو پریشان کرتا ہے، ہم سے بات کر چلیں درگاہ میں؟"

مجذوب نے ایک ٹانگ پر مستانہ وار اچھلنا شروع کر دیا۔

"میرے راستے سے ہٹ جا شمس الدین، دیوتا آتے ہوں گے، کیوں اپنی جان کا بلیدان دیتے ہو؟۔۔۔ سمے ہے ابھی بھاگ جاؤ۔"

شاریکا چلایا۔

"میں ڈر گیا اور گیا میں تو۔۔۔ دیکھو دیکھو رو بھی رہا ہوں میں تو۔"

مجذوب نے سہمنے کی اداکاری کی اور شاریکا تلملا کر رہ گیا۔ وہ بری طرح پھنس چکا تھا۔

"شاریکا، چودھویں کی رات تیرا بڑا شیطان خود بخود جہنم واصل ہو جائے گا، تجھے میں نورانی کڑا مار کر کنویں میں قید کر رہا ہوں، تیرا کیا کرنا ہے، یہ فیصلہ درگاہ کے بڑے کریں گے، میں تو ان کا معمولی سا خادم ہوں۔"

مجذوب نے انگلی کا اشارہ کیا تو ایک نورانی غبار نے شاریکا کو لپیٹ میں لے لیا اور وہ وہاں سے غائب ہو گیا، مجذوب نے گھنگھرو چھنکائے، دیوانہ وار چکری کاٹی اور ہو ہو کی ہوک بھرتا درگاہ کی طرف چل پڑا۔ روشنی کی ایک ننھی سی کرن ہی اندھیری رات کو تہہ تیغ کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے!!

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



خوش ہیں۔ مگر ایک دن میں نے ان دونوں بھائیوں کو باتیں کرتے ہوئے سن لیا۔ وہ میرے اور میرے بچوں کے قتل کے منصوبے بنا کر میری ساری جائیداد پر قبضہ جمالینا چاہتے تھے۔ میں جو دروازے کی جھری میں سے سب سن رہی تھی۔ ان میں سے ایک کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں ڈر کر تیزی سے بھاگنے کے لیے مڑی مگر وہ دونوں مجھ تک پہنچ گئے تھے فوراً انہوں نے مجھے قابو میں کرلیا تھا۔ میری چیخ سن کر میرے دونوں بچے آ گئے تھے اور وہ مجھے بچانے کے لیے ان دونوں کو مارنے لگے پر ان ظالموں نے میرے بچوں کو میرے سامنے مار ڈالا، لان میں دفن کروایا اور مجھے مار کر یہاں لے آئے۔'' کمرے میں اس عورت کی سسکیاں گونج رہی تھی۔

''آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''انصاف چاہتی ہوں، تم ان دونوں بھائیوں سہیل اور ارشد کو گرفتار کرواؤ گے اور میرے بچوں کی لاش کو میرے گھر کے لان سے نکلواؤ اور میری لاش کو بھی نکلواؤ۔ اور ہمارے کفن دفن کا انتظام کرو۔ میری ساری دولت کی حقدار میری بہن ہے۔''

اس کے بعد میں پولیس اسٹیشن گیا۔ پہلے تو پولیس میری بات سننے پر آمادہ نہیں ہوئی کیونکہ پولیس کو لگ رہا تھا یہ روح والی بات ایک مذاق ہے۔ مگر بعد میں لان کی کھدائی کروائی تو وہاں دو بچوں کی لاشیں ملی۔ ارشد اور سہیل کو گرفتار کیا تو انہوں نے بعد میں خود ہی اعتراف کرلیا۔ اس عورت اور اس کے بچوں کی تدفین کروی گئی۔ میں نے وہ پانچ لاکھ بھی اس عورت کی بہن کے حوالے کر دیے۔

دوسری رات پھر دروازے پر دستک شروع ہوئی۔ میں ڈر گیا کے اب وہ عورت یہاں کیوں آئی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو وہ عورت کھڑی تھی اور اس کے دائیں بائیں اس کے بچے کھڑے تھے۔ آج اس روح کے چہرے پر سکون تھا

''میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔ تم نے میری بہت مدد کی اب میں اور میرے بچے پرسکون ہیں۔ تمہیں تمہارا تحفہ کل مل جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ روح غائب ہوگئی۔ اگلے دن میں اس روح کی تحفے والی بات کو سوچ رہا تھا کہ شام میرے پاس ایک عورت آئی۔ اس نے اپنا نام مہوش بتایا۔ اس نے مجھ سے کہا کے وہ شہلا کی بہن ہے۔ اور میری امانت دینے آئی ہے۔ میں نے پوچھا کون سی امانت تو اس نے بتایا شہلا نے آپ سے بھی پانچ لاکھ ادھار لیے تھے اور وہ بار بار میرے خواب میں آ کر کہتی ہے کہ وہ پانچ لاکھ میں آپ کو لوٹا دوں۔ اس عورت کی بات پر میں حیران ہوتا ہوا سوچنے لگا شاید یہی وہ تحفہ ہے جس کی کل شہلا نے بات کی تھی۔ شہلا نے پھر کبھی میرے دروازے پر دستک نہیں دی۔ اس کی بے چین روح کو سکون مل گیا تھا۔ مگر اس کے بعد بہت سی بے چین روحیں مجھے تنگ کرنے لگی تھیں، جس کی وجہ سے میں نے ایک روحانی بزرگ سے یہ پڑھے ہوئے دھاگے لیے اور ان کو اب میں اپنے دروازے کی کنڈی پر لپیٹ کر رکھتا ہوں تاکہ یہ روحیں مجھے تنگ نہ کریں۔''

یہ کہہ کر وہ گورکن چپ ہوگیا۔ سیل پر اشرف کی کال آ رہی تھی۔ وہ قبرستان کے باہر گاڑی میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ میں اور سعد اس گورکن کو خدا حافظ کہہ کر اس کی کوٹھری سے باہر نکل گئے۔

ہم تیز تیز چلتے ہوئے باہر کی جانب جا رہے تھے۔ اندھیرا قبرستان کی ہولناکیوں میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ موحد نے اس گورکن کی کوٹھری کی طرف دیکھا سعد کی کانپتی آواز پر میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک عورت سفید لباس میں بال کھولے اس گورکن کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں اور سعد خوفزدہ ہو کر باہر گاڑی کی جانب سرپٹ دوڑے تھے۔

☆☆☆